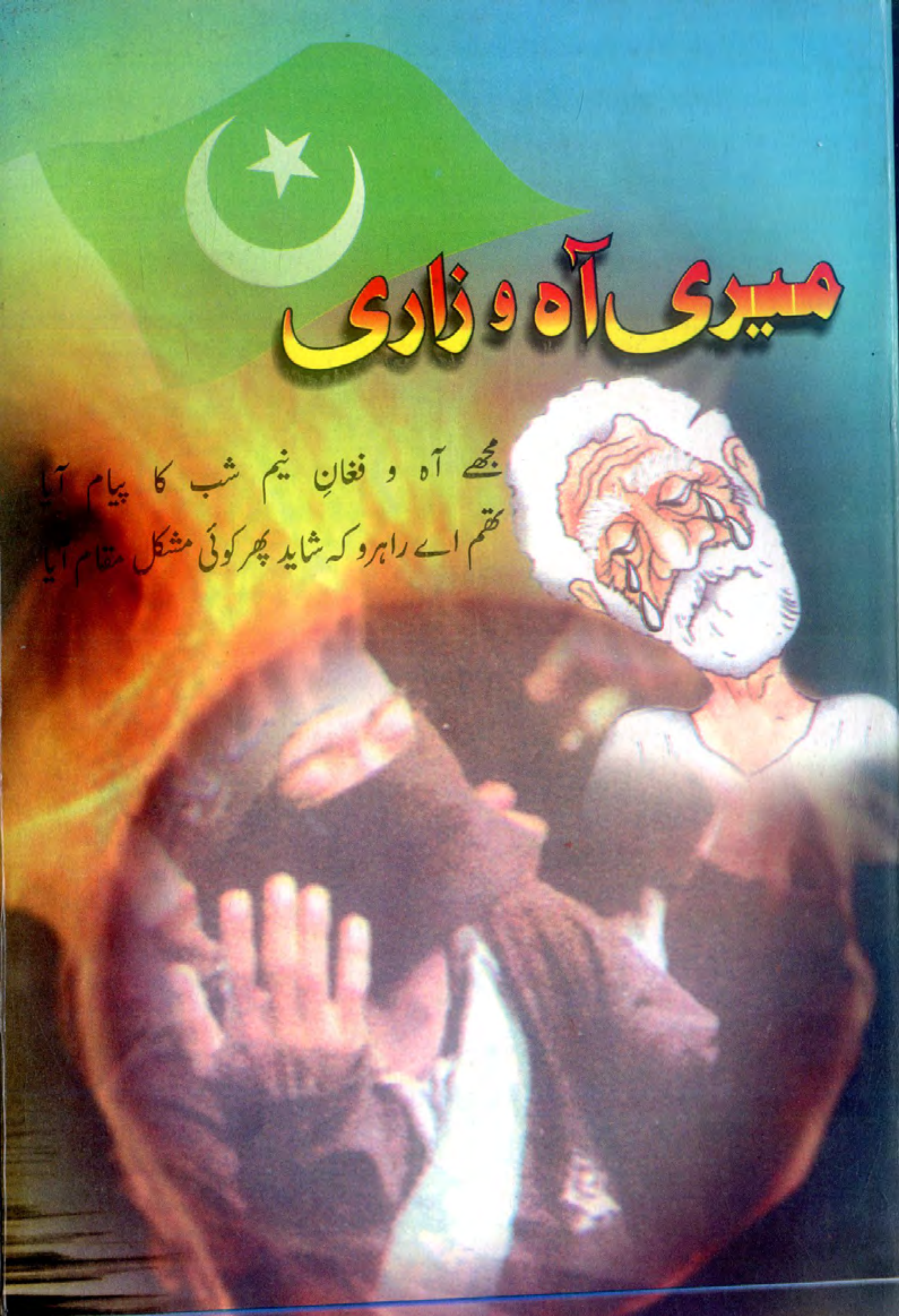


# میری آہ و زاری

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پیام آیا
تھم اے راہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

منجانب حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سپاہی میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر فیصل آباد
تحفہ
www.fb/almadinalibrary

# میری آہ وزاری

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے راہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

منجانب

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سپاہی
میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مصنف اور ناشر تحریری حقوق سے دستبردار ہے

پوری کتاب یا اس کا کوئی حصہ بغیر اجازت کے شائع کیا جاسکتا ہے۔

صاحبِ دل اور مخلص لوگ اس سلسلہ میں سوچیں

| | |
|---|---|
| نام کتاب | میری آہ وزاری |
| مصنف وناشر | میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان (حضور پاک ﷺ کا سپاہی) |
| نظر ثانی وادارت | سید انعام الحق بخاری |
| صفحات | |
| تعداد | ایک ہزار |
| سن اشاعت | مئی 2008ء |
| ہدیہ | |

## کتابیں ملنے کے پتے

(1) میجر (ر) امیر افضل خان، (حضور پاک ﷺ کا سپاہی)

19 ذیشان کالونی، قاب لائنز، راولپنڈی، فون 051-5583778

(2) کرنل (ریٹائرڈ) شیخ عبدالرؤف، C-133 ویسٹرج نمبر 1، راولپنڈی، فون 051-5461444

(3) علم دین پبلشرز، علم دین سنٹر، ماتھر سٹریٹ، 7-لوئر مال اردو بازار لاہور، فون 042-7029415

# انتساب

رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عشق
سے لبریز قافلہ سخت جان کے نام
جن کے ظاہر ہونے کا وقت آ گیا ہے

کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلہ سخت جان

# گُفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا

میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خاں صاحب ایک جہاں دیدہ اور چشم بینا رکھنے والے انسان ہیں۔ آپ نے جتنی بھی کتابیں تخلیق کیں ہیں ان میں میجر صاحب کی عسکریت پسندی اور فلسفۂ جہاد کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ میجر صاحب کا یہ فلسفۂ جہاد اور نقطۂ نظر صد فی صد درست اور نا قابل تردید ہے۔ مگر جب میجر صاحب قبلہ کا راہرو قلم سرپٹ دوڑتا ہوا بعض اوقات تقریر اور تحریر کے درمیان فرق کو بالائے طاق رکھتا ہے تو ڈاکٹر اقبال مرحوم کا شعر

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب رُوح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

یاد آجاتا ہے۔

یہ ایک فطری عمل ہے کہ جس انسان نے بڑے بڑے ''مُحب وطن'' اور ''پارسا'' کہلوانے والے حضرات کے نجی معاملات کا مشاہدہ کیا ہو اور دوہرے معیارِ زندگی کو بہ چشم خود دیکھا ہو، وہ جب اپنے خیالات کے اظہار کے لیے قلم کا سہارا لے گا تو اس کا قلم پھولوں کے گُل دستے نہیں آگ کے شعلے ہی اُگلے گا۔ پھر جب لکھنے والا بذات خود بھی حالات کی ستم ظریفی اور بڑوں کے جور و جفا کا شکار ہوا ہو تو اس سے کسی رواداری اور لگی لپٹی کی توقع رکھنا میرے خیال میں تو عبث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میجر صاحب کا قلم جب حقائق کو واشگاف الفاظ کے ذریعہ سے احاطۂ تحریر میں لاتا ہے تو اکثر حضرات کو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ شاید کوئی ذاتی رنجش کا بدلہ لیا جا رہا ہے جب کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوتی کیونکہ جس کا دل دُکھی ہو وہ جب بات کرے گا تو خود ساختہ ادب و آداب کی کہیں نہ کہیں خلاف ورزی ضرور ہوگی۔

ہاں البتہ یہ بات ہوسکتی ہے کہ صاحبِ قلم کسی سے کچھ امیدیں وابستہ کر لے جب کہ وہ بے چارہ مجبوریوں اور مصلحتوں کا شکار ہو جائے یا حقائق کو کُھلے الفاظ اور بے باکانہ انداز میں بیان کرنا درست نہ خیال کرتا ہو کہ اس سے کسی معاملے کے سدھرنے کی بجائے خراب ہونے کے زیادہ خدشات

ہوں تو اس صورت حال کے پیش نظر ''عقل منداں را اشارہ کافی'' سے کام لینا چاہیے۔

میجر صاحب نے اپنی اس کتاب کا نام ''میری آہ وزاری'' رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ آہ وزاری وہی انسان کرتا ہے جو عملی طور پر کچھ نہ کر سکے یا حالات کے جبر کے تحت وہ کچھ عملی اقدامات سے گریزاں ہو تو یہ دونوں صورتیں میجر صاحب کے ہر پیرے سے آفتاب نیم روز کی طرح واضح ہو رہی ہیں اور حالات کا جبر ایک بہادر انسان کو بھی کیسے کیسے، مصلحتوں کا شکار بنا دیتا ہے، یہ تو اس کتاب کے مطالعہ سے ہی معلوم ہوگا۔

ہاں ایک بات جو خاص طور پر اس آپ بیتی یا ہڈ بیتی آہ وزاری میں قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ ہماری فوج کے اکثر کرتا دھرتا لوگ ہمیشہ اپنی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کو اپنے پیشے کے مطابق استعمال کرنے کی بجائے حکمرانی کے نشے میں دُھت رہے ہیں اور سویلین (Civilian) حکومت کے خلاف ابتدائی ایام سے ہی سازشوں کے تانے بانے بُننے میں مصروف رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے دو جنگوں میں کوئی خاطر خواہ فائدہ حاصل نہ کیا اور تیسری میں وطن عزیز کے ٹکڑے کروا بیٹھے۔ یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اِس ملک کا جب بھی کوئی جغرافیائی نقصان ہوا ہے تو فوجی حکومت کے دور میں ہوا ہے نہ کہ سویلین (Civilian) حکومت کے دور میں۔ اس وقت موجودہ حالات وواقعات جس نہج پر پہنچ چکے ہیں اس میں بھی فوجی جرنیلوں کا ہاتھ ہے کہ وہ حکومت کے مزے لُوٹنے کے لیے اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کو پس پشت ڈالے ہوئے ہیں۔

میجر صاحب کی تحریریں اس بات کو گواہ ہیں کہ 1948ء سے ہی فوج کے کچھ لوگ حکومت پر قبضہ کرنے کی سوچوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ جس ملک کی پیشہ ور فوج اقتدار کے ایوانوں اور محلاتی سازشوں کے تانے بانے بُننے میں مصروف ہو جائے اس مُلک کی جغرافیائی حدود کا کیا حشر ہوتا ہے، ہم اس تلخ حقیقت سے بار بار دوچار ہو چکے ہیں۔ اگر اب بھی ہمارے سیاستدان جرنیل کوئی سبق سیکھنے میں سنجیدہ نہیں تو وہ دن دور نہیں جب ان لوگوں کو اپنی خیانتوں کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

(محمد طفیل عفی عنہ)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ O

# ابتدائیہ

رب العالمین! سب سے پہلے میں عاجز آپ کے دربار میں سربسجود ہوتا ہوں اور پھر آپ کے حبیب ﷺ اور میرے آقا ﷺ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر لاکھوں، کروڑوں، اربوں اور کھربوں دفعہ درود وسلام بھیجتا ہوں۔ اس کے بعد تمام پیغمبر صاحبان، صحابہ کرام رضی اللہ عنہ، تابعین، تبع تابعین، اسلام کے علماء، فقراء مجاہدین، صدیقین، شہداء، اپنے والدین اور سارے آباؤاجداد، رشتہ داراور رفقاء جو دنیا سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ان کی سورۃ المومن کے تحت مغفرت کی دعا مانگتاہوں خاص کران صاحبان کی مغفرت کی دعا جن کے نام لے کر یہ عاجز روزانہ ان کو کچھ کلام پڑھ کراس کا ثواب پیش کرتا ہے۔ اب اپنے تمام زندہ رفقاء، رشتہ داروں اور میری کتابوں کے قارئین کے لئے خصوصی تیری رحمت کی دعا مانگتا ہوں۔ گزارش یہ ہے کہ 2007 کے رمضان شریف کی ستائیسویں شب میں اس عاجز پر آدھی شب کے قریب آہ وزاری نازل ہوگئی اور میں پکار اٹھا۔ ''اے میرے رب پچھلے تین سوسالوں سے ملت اسلامیہ ذلت کی زندگی سے دوچار ہے مہربانی سے اپنے اور اپنے حبیب ﷺ کے اسماء شریف کی لاج رکھ کر غیرتو کہتے ہیں کہ ہم تیرے ہیں تو ہمیں عزت وغیرت کی زندگی عطا فرمادے۔'' پھر اس آہ و زاری میں اضافہ ہوتا رہا اور یہ شدت بھی اختیار کر گئی اور میں کچھ بیمار بھی ہو گیا تو مجھے خیال آیا کہ اے میرے رب آپ نے مجھے بڑی سعادتیں عطا فرمائیں کہ متعدد تبلیغی کتابوں سے قوم کو آپ کی نافرمانی سے روکا اور آپ کے صراط مستقیم کی نشاندہی کی تو اب میرا اس دنیا کے قید خانہ سے خلاصی ہونے کا وقت آ گیا ہے تو یہ کیفیات شاید میرے اپنے گناہوں کا کفارہ بن جائیں اور تو مجھے اپنی رحمت میں لے لینے والا ہو۔ ''لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا اور ایک اور ''واردات'' ہوگئی۔ اے سپاہی! ایک چھوٹی سی کتاب اور لکھ دے اور قوم کو ایک دفعہ پھر یاد دلادے کہ وہ اس ذلت سے کیوں دوچار رہے۔'' انہی دنوں یہ عاجز اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ ہماری گمراہی کی زیادہ ذمہ داری، دانشوری کا لبادہ اوڑھنے والوں، خاص کر صحافیوں

اوران میں سے بھی زیادہ مجید نظامی پر عائد ہوتی ہے۔ جسکو یہ عاجز 1979ء سے سینکڑوں خطوط کے ذریعہ سے تبلیغ کرتا آ رہا ہے اور اب خطوط کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا تھا کہ یہ تبلیغی خطوط قوم کے نام بھی کھلے خطوط ہوتے تھے اور چوتھا خط شروع کر چکا تھا۔ تو فیصلہ کیا کہ اب اسی خط کو طول دے دوں۔ کیونکہ یہ لوگ حق و باطل میں فرق نہیں کر سکتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ ''جو حق و باطل میں فرق نہ کر سکے وہ اسلام کفر پاش پاش کر دے گا۔'' قارئین! یہ ہے ہمارا بڑا المیہ ہے۔ کہ اول تو باطل نے حق کا لبادہ اوڑھ لیا ہے اور چونکہ ہم لوگ تو ظاہری طور پر بھی مسلمان نظر نہیں آتے۔ اول ضرورت یہ ہے کہ پہلے اسلام کو ظاہری طور پر تو اپنائیں۔ پھر سورۃ الحجرات کی آیت مبارکہ 14 کے مطابق اپنے ظاہر و باطن کو ایک کر کے مومن بن جائیں۔ تو مومن کی فراست کے حامل بھی ہو جائیں گے کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ڈر مومن کی فراست سے کہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے اور سورۃ الحجر کی آیت مبارکہ 88 اور سورۃ الشعراء آیت مبارکہ 215 کے مطابق ہم حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمت کے بازوں کے نیچے ہو جائیں گے۔ اور سورۃ الروم کی آیت مبارکہ 47 کے مطابق اللہ تعالیٰ مومنوں کی مدد کا وعدہ فرما چکے ہیں اور سورۃ النساء کی آیت مبارکہ 141 کے مطابق کافر کبھی بھی مومنوں پر غلبہ نہیں کر سکتے ہیں۔ یہاں پر یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف مسلمان ہو جانے کے سلسلہ میں کسی وعدہ کا ذکر نہیں کیا۔ یہ ہے اس کتابچہ کی ساری تحریر کا مقصد کہ ہم مومن بن جائیں تو اس ذلت کی زندگی سے چھٹکارا مل جائے گا کہ سورۃ الصّف کی آیت مبارکہ 10 اور 11 میں مزید وضاحت ہے کہ اس ذلت کی زندگی سے چھٹکارا مومن بننے اور جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنانے سے ہے۔ اس کے بعد ہم سورۃ المائدہ کی آیت مبارکہ 56 اور سورۃ المجادلہ کی آیت مبارکہ 22 کے مطابق حزب اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی فوج ہوں گے تو پھر کون ہمارا مقابلہ کر سکے گا؟

آؤ اول پوری قوم توبہ و ندامت کریں پھر ظاہر و باطن کو ایک کر کے مومن بن جائیں اور مسلم قومیت کو اپنا لیں۔ اول بھی مسلمان اور مومن آخر بھی مسلمان اور مومن، پھر نتیجہ سامنے آ جائے گا۔

من جانب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا سپاہی

امیر افضل بقلم خود

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِO

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَ بَارِکْ وَسَلِّمْ وَصَلِّے عَلَیْہ۔

(مجید نظامی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے قوم کے نام چوتھا کھلا خط)

از جانب حضور پاک ﷺ کا سپاہی امیر افضل، 19۔ ذی شان کالونی، قاب لائنز، راولپنڈی۔فون نمبر 5583778

عزیزم مجید نظامی صاحب!

السلام علیکم

یہ عاجز آپ کے سامنے ثابت کر چکا ہے اور اب بھی کسی کھلی ''کچہری'' یا ''ادارے'' میں ثابت کر سکتا ہے کہ موجودہ میڈیا کا طرز عمل غلام کذاب سے بڑھ کر اسلام اور پاکستان کا نقصان کر رہا ہے اور خاص کر تیسرے خط کے پیرا نمبر 17 اور 18 میں گزارش بھی کی کہ اس ''ضد'' کو ختم کرواور ان کافرانہ نظاموں اور باتوں سے توبہ کر کے اسلام کے فرزند بن جاؤ۔

2۔ موجودہ میڈیا کے طرز عمل اور کافرانہ نظامات کے اپنانے کے نتائج کا بھی اظہار کیا کہ ہم کس طرح گروہ (یعنی سیاسی گروہ) بن چکے ہیں۔ ہر گروہ میں غیروں اور شیطان کے ایجنٹ بیٹھے ہیں۔ جو کچھ وہ ہم سے کراتے ہیں، تو غیروں کی تجویز ''الفا'' پروان چڑھ جاتی ہے۔اس میں ناکامی ہو تو غیروں کی تجویز ''بریوو'' پر کام شروع ہو جاتا ہے۔ ہماری قوم چونکہ مومن کی فراست سے عاری ہے۔تو ہم سے اکثر لوگ ''بن جانے'' اور کچھ ''جانتے'' ہوئے دراصل ان غیروں اور شیطانی طاقتوں کی ''گیم'' کھیلتے رہتے ہیں۔

3۔ یہ عاجز پچھلے چالیس سالوں سے قوم کو یہ صورت حال سمجھا رہا ہے کہ شاہ نعمت اللہ ولی فرما گئے تھے۔ ؎

رہبر زمسلماناں در پردہ پاسباناں
امداد دادہ باشد از عہد فاجرانہ

یعنی ہمارے راہنما دل سے دشمن کے ساتھ ملے ہوئے ہوں گے۔ میرے پاس اس سلسلہ میں بے حساب بنیادی (Primary) اور ثانوی (Secondery) شہادتیں (Evidence) جس کو اپنی کتابوں اور مضامین کا حصہ بنا چکا ہوں، جس کی کچھ جھلکیاں اس خط میں دے رہا ہوں موجود ہیں۔

4۔ ایوب خان کو کس طرح غیروں کے ''وائسرائے'' کے طور پر ہم پر ''مسلط'' کیا گیا اور پھر اس کو کس طرح اور کیسے نکالا گیا۔ یہ عاجز تمام واقعات کا 1944ء سے بر،ما محاذ کے وقت سے ''چشم دید'' گواہ ہے، جب ایوب خان کو کرنل کے عہدہ کیلئے نا موزوں (Unfit) قرار دے کر میجر بنا دیا گیا تھا۔ ایوب کے خلاف بعد میں بڑے ایکٹر ذوالفقار کو بھی 1949ء میں کوہاٹ میں ایک ''پہلے ٹیڈی بوائے'' کے طور پر دیکھا جو اس وقت بھارت کا شہری تھا اور اپنے بہنوئی گائیڈ رسالے کے کرنل مصطفیٰ کو ملنے آیا تھا۔ ''میزبانی'' کا زیادہ فریضہ گائیڈ رسالہ کے کیپٹن ضیاء الحق کر رہے تھے اور ساتھ یہ بات بھی کچھ پھیلائی گئی یا پھیلائی جاتی تھی کہ ذوالفقار اور ضیاء الحق دونوں نے پاکستان میں اہم کام کرنے ہیں۔

5۔ قارئین! فی الحال یہ کچھ سمجھنے کی کوشش کریں کہ کئی قسم کے کچھ ''چھپے ہاتھ'' ان دونوں صاحبان یعنی ضیاء اور بھٹو کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ قارئین! ان الفاظ کو صرف ایک ''اصطلاح'' نہ سمجھ لینا۔ اس عاجز کے اس سلسلہ کے ''مشاہدات'' اتنے زیادہ ہیں کہ میں کتابوں کی کتابیں ان باتوں سے بھر چکا ہوں۔ لیکن صرف چند صاحبان ان باتوں کو سمجھ سکے۔

6۔ مثال کے طور پر 1962ء میں جب یہ عاجز اپنی پلٹن کے ساتھ آ کر صدر ہاؤس راولپنڈی میں متعین ہوا۔ تو ہم سے پہلے جو پلٹن یہاں متعین تھی۔ ان کے چلے جانے کے بعد ہمیں معلوم ہوا، کہ اس پلٹن کے دو اہم آدمی کیپٹن گوہر ایوب اور کیپٹن آصف نواز تھے۔ ان ''چھپے ہاتھوں'' میں سے کچھ کچے قسم کے یا ''عارضی'' قسم کے لوگ، ان صاحبان کی ''تلاش'' میں آ نکلتے تھے۔ گوہر ایوب یا آصف نواز کو بعد میں ''ایوب ثانی'' بنا کر ہم پر ''مسلط'' کرنا تھا۔

7۔ دراصل 1962ء میں یہ چھپے ہاتھ ایوب خان سے بھی کچھ ''مایوس'' ہو گئے تھے کہ وہ ایک ''وفادار وائسرائے'' ثابت نہ ہو سکا اپنے ''آقاؤں'' کا یہ حکم نہ مان سکا کہ مشرقی پاکستان کی سرزمین کو بھارت استعمال کر کے چین کے خلاف اپنا دفاع ''مضبوط'' کرے۔ تو ایوب کا زوال لانے کے لئے اوپر چوتھے پیرا میں جس ''ٹیڈی بوائے'' کا ذکر ہے وہ ایوب کا 1958ء سے ''بیٹا'' بن چکا تھا۔ تو اس کی ''سازش'' سے ایوب خان کے لئے ستمبر 1965ء کی جنگ کے ذریعہ سے زوال لانے کی کوشش کی جو ''آدھی'' کامیاب رہی۔ 1971ء میں تو صرف ''ڈرامہ'' کرنا پڑا۔ ایوب خان 1969ء میں ہاتھ کھڑے کر چکا تھا کہ ملک کو دولخت کرنے کی صدارت کے لئے کسی بے حیا اور بے غیرت ٹولی کی ضرورت تھی۔ 1952ء سے تمام عام و خاص ''مشاہدہ'' کر رہے تھے۔ کہ ایسی ''بے حیا'' اور ''بے غیرت چنڈال چوکڑی'' والے راولپنڈی کلب میں یحییٰ خان کی سربراہی میں ہر روز ''بے حیائی کی محفل'' لگائے ہوئے تھے۔ جب یحییٰ خان صدر بنا تو اس ''محفل'' کی ایک صاحبہ نے صدارتی کتاب پر یہ لکھا تھا۔ ''چارے چوکاں ترے ڈیوا بلداوی۔ بنجواں میں بالن آئی ہاں'' لیکن بہتر الفاظ یہ تھے۔ ''چارے چوکاں تیریاں چکڑ ڈبیاں۔ کیہڑی نوں مل مل دھوواں''۔

8۔ قارئین! یہ نہ کہنا کہ میں بھی ایک ''خاموش تماشائی'' بنا رہا۔ میری ریزرویشنوں کا حساب نہیں۔ ستمبر 1965ء کی جنگ سے پہلے بھی بہت شور مچایا کہ سازش کے ذریعہ سے ہمیں جنگ میں ''جھونکا'' جا رہا ہے۔ خدارا اس کے لئے تیاری کرو اور جنگ کے بعد تو پستول میرے ہاتھ میں تھا اور لاہور محاذ کے ''بڑے'' میرے سامنے فرار ہو رہے تھے۔ ستمبر 1970ء میں ایوب ہال میں یحییٰ خان اور اس کے ''حواریوں'' کو تقریباً چھ سو افسروں کے سامنے بتا دیا کہ وہ ملک کے ٹکڑے ہونے پر صدارت کریں گے اور فوج کا ''چھاتہ'' پاش پاش ہونے والا ہے۔

9۔ دسمبر 1971ء کے آخری ہفتہ کے ایک روز جب یہ عاجز ایوب ہال میں پہنچا۔ تو ''چھپے

ہاتھوں'' کے سارے گروہ اپنی جھوٹ کی ''پنڈاریوں'' سے ایک دوسرے پر اور جنرل یحییٰ کے ''سایہ'' جنرل حمید برہمی پر ''بمباری'' میں مصروف تھے اور ایک اودھم مچا ہوا تھا۔ یہ عاجز گرجدار آواز میں پکار اٹھا ''خاموش رہو''(Shut up you all) آپ میں سے ستر فیصد لوگ ستمبر 1970ء میں اس جگہ پر موجود تھے جب میں نے اعلان کیا تھا کہ یہ کچھ ہونے والا ہے جو کچھ آج ہو گیا ہے۔تم میں سے کسی ایک کو میری مدد کی توفیق نہ ہوئی،اور جنرل حمید صاحب! ''تم کو کیسے ہمت ہو گئی ہے کہ ہمارے سامنے مگر مچھ والے آنسو بہانے کے لئے آدھمکے ہو؟'' جنرل حمید صاحب! ''اگر تم، یحییٰ خان اور تمہارا گروہ آج بھی ''توبہ وندامت'' کرنے کو تیار ہو تو میرے پاس اسلام کا چھاتہ اور رہنمائی موجود ہے، ورنہ ذلت کے لئے تیار ہو جاؤ''

10۔ یہ چنڈال چوکڑی والے بھلا کیا توبہ کرتے؟ تو اس عاجز نے اعلان کر دیا: ''جنرل صاحب یہ بے وقت کی راگنی بند کرو۔ جس (ٹیڈی بوائے) نے تمہیں اور ہمیں سب کو ذلت سے دوچار کیا اور نوے ہزار فوجیوں کو ''ڈبل ہوسٹیج'' بنوایا ہے۔ وہ پشاور پہنچنے والا ہے۔ ایئر مارشل رحیم اس کو ''خوش آمدید'' کرنے پشاور پہنچ چکا ہے۔ میرے ساتھ بیٹھے جنرل گل حسن راولپنڈی میں اس کو حفاظت ''مہیا'' کریں گے۔ پھر قوم نے دیکھ لیا کہ یحییٰ خان اور اس کے ٹولہ کو کس بے عزتی سے فوج سے نکالا گیا اور چند دن بعد دونوں ''بادشاہ گروں'' گل حسن اور رحیم کو اور زیادہ بے عزت کیا گیا۔

11۔ قارئین! بھٹو اس دن جہاں ''تخت'' حاصل کر رہا تھا۔ تو اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ ''حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تقدیریں'' پاکستان اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا راز ہے۔ اس کو نقصان پہنچانے والا عبرتناک انجام سے دوچار ہو گا۔ فروری 1972ء میں اس عاجز نے بھٹو کو اسی ایوب ہال میں بتا دیا تھا۔ جناب صدر صاحب! آپ سمجھتے ہیں کہ آپ بہت ہوشیار ہیں، **کوّا** بھی بڑا ہوشیار ہوتا ہے، لیکن دھتکار اور پھٹکار سے نہیں بچ سکتا۔ سقوط مشرقی پاکستان

فوجی المیہ بھی ہے، لیکن یہ زیادہ تر ''سیاسی المیہ'' ہے، آپ اور مجیب الرحمٰن بھی اس کے ذمہ دار ہیں۔ اپنے وزیر پیرزادہ کو بتادیں کہ ہم سقوط ڈھاکہ کے سچ کا ''مشاہدہ'' کرنے کی ہمت نہیں کرتے۔ ہمیں مزید بے غیرت نہ بناو۔ پاکستان کا نقصان کرنے والے عبرتناک انجام سے نہ بچ سکیں گے۔ تم کہتے ہو میں تھوڑی سی شراب پیتا ہوں، یزید بن معاویہ بھی تھوڑی سی شراب ہی پیتا تھا۔

12۔ قارئین ذرا یاد کریں کہ آپ لوگوں نے ٹی وی پر دیکھا ہوگا کہ 1977ء میں ایک کاغذ کا ٹکڑا اٹھائے بھٹو بازار میں آ گیا تھا اور کہا کہ اے لوگو دیکھو یہ ''چھپے ہاتھ'' مجھے مارنا چاہتے ہیں۔ میں پاکستان کا وفادار ہوں۔ لیکن بھٹو کو اس ڈرامہ رچانے کا ذرا بھی فائدہ نہ ہوا کہ جولائی 1977ء کی ایک رات ''چھپے ہاتھوں'' نے شبخون مارا اور دو سال بعد اس کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ یہ عاجز اپنے کئی مضامین میں لکھ چکا ہے کہ ایک بزرگ ''گکھڑ بابا'' کھلی مجلس میں ہمیں اگست 1971ء میں بتا گیا تھا کہ مجیب کیلئے گولی اور بھٹو کے لئے پھانسی۔

13۔ قارئین! بھٹو کے اس ''ڈرامہ'' پر یہ عاجز خاموش ہرگز نہ رہا اور بھٹو کے ملٹری سیکرٹری جنرل امتیاز جو میرا عزیز دوست تھا۔ اس کو اسی دن خط لکھ دیا کہ وزیر اعظم صاحب کو بتلادیں کہ اس ڈرامے سے کام نہ چلے گا۔ مکمل طور پر توبہ و ندامت کر کے قوم کو اپنی تمام غداریوں سے آگاہ کریں کہ کس طرح اس نے چھپے ہاتھوں کے ایجنٹ کے طور پر کام کیا۔ اور اب کافرانہ نظاموں کو ختم کر کے اللہ تعالیٰ کے نظام کو جاری کریں۔ چھپے ہاتھوں نے بھٹو کو ستمبر 1965ء اور دسمبر 1971ء کے سلسلہ کی غداریوں کیلئے تو پھانسی نہ چڑھوایا۔ چھپے ہاتوں نے بھارت کو ''بلیک میل'' کرنے کے لئے بھٹو کو ایک محدود حد تک ایٹمی توانائی کے ''حصول'' کی اجازت دی تھی۔ اور وہ لوگ ہمارے ہر عمل کو ''مانیٹر'' کرتے تھے۔ یہ عاجز اپنے سارے مشاہدات اخباروں میں شائع کرا چکا ہے۔ بھٹو نے تھوڑی ''زیادتی'' کی یا ''آزادی'' حاصل کی۔ تو ''چھپے ہاتھوں'' نے بات صرف بھٹو کے زوال تک محدود نہ کی کہ جس طرح ایوب سے ''بے

وفائی'' کرا کے بھٹو کو ایوب کے زوال کا سبب بنوایا تھا۔ بھٹو کے 1949ء کے ''دوست'' ضیاء الحق کے ذریعہ سے بھٹو کو نہ صرف ''تخت'' سے ہٹایا گیا بلکہ ''تختہ'' پر بھی چڑھایا گیا۔ تختہ پر چڑھانے والے ضیاء الحق کے بھی 1988ء میں ''پرخچے'' اڑا دیئے گئے کہ یہ فطرت کی بھی ''ضرورتیں'' تھیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار (سورۃ الحشر آیت مبارکہ 2)

14۔ ضیاء الحق کے ساتھ میری شناسائی 1953ء سے ہو چکی تھی اور عمر کی وجہ سے اس نے میری اپنے بڑے بھائی کے طور پر عزت کی۔ البتہ 1956ء میں ہمارے امریکی ''مہمانوں'' اور خاص کر ان کے نمائندہ میجر سمتھ کے ذریعہ سے ثابت ہو گیا کہ میجر ضیاء الحق اور میجر اعجاز عظیم (بعد میں جنرل) چھپے ہاتوں کے خاص آدمی ہیں۔ جس کا ثبوت ضیاء الحق خود نے 1962ء میں دے دیا جب میری مبارک کے جواب میں کہا ''کہ امیر افضل! کرنیلی تو ملنی ہے تو ملتی رہے گی لیکن فورٹ لیون ورتھ جانے کے مواقع روز روز نہیں میسر ہوتے'' بہر حال بری فوج کی سربراہی سنبھالنے کے باوجود ضیاء الحق نے مجھے اتنی عزت دی کہ میں جہاں کھڑا ہوتا تھا وہ خود چل کر میرے پاس آتا تھا۔

15۔ مارشل لا لگانے کے بعد میرے پلٹن وال جنرل غلام حسن کو میرے پاس بھیج کر جنرل ضیاء نے مجھ سے وہ ''مسودہ'' حاصل کیا جو اس عاجز نے یحییٰ خان کو 1970ء میں دیا تھا کہ ''شراب کی بوتلیں توڑ دو اور توبہ وندامت کر کے قوم کو اسلام کے راستے پر لگا دو۔'' ضیاء نے جلد میرے ساتھ ملاقات کا وعدہ بھی کیا لیکن صورت حال مکمل طور پر تبدیل ہو گئی۔ ملاقات اور ''ہیلو، ہیلو'' کرنا تو دور کی بات بن گئی۔ اگر کسی افطار پارٹی میں ہم ''اکٹھے'' ہو جاتے تو ضیاء الحق آنکھ چرا کر اس صف میں نماز بھی نہ پڑھتا تھا جہاں میں کھڑا ہوتا تھا۔ کیا وہ مجھ سے ڈرتا تھا؟ توبہ میرے اللہ! میں اس کے لئے معمولی آدمی تھا۔ وہ میرا نام ونشان بھی مٹا سکتا تھا۔ لیکن ایسا وہ چھپے ہاتھوں کے ''احکام'' یا ''ضرورت'' کے تحت کرتا تھا یا اس کو ''خطرہ'' ہوتا تھا کہ میں لوگوں کے سامنے اس کی بھی ''ایسی تیسی'' کر دوں گا۔ جیسے پہلے سربراہان مملکت کی

کرتا رہا۔ پرانے تعلقات اور ''رکھ رکھاؤ'' کے مدنظر وہ ایسی ''صورت حال'' کو پیدا نہ ہونے دے رہا تھا۔

16۔ بہرحال اس عاجز نے ضیاء الحق کے سامنے نہ کبھی کسی ذاتی ضرورت کے تحت ''ہاتھ پھیلایا'' اور نہ ملاقات کی گزارش کی۔ لیکن ویسے قومی معاملات اور اس کی ''کوتاہیوں'' پر سینکڑوں خطوط لکھے۔ جن میں سے اس کے سٹاف نے کوئی ایک آدھ خط ''اکناج (Acknowldge)'' کیا۔ لیکن عمل صرف ان باتوں پر کیا جو اس کی ''کرسی'' کو مضبوط کرتی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ ضیاء الحق وقت کا ''انتظار'' کر رہا ہے۔ لیکن جب مجھ پر ثابت ہو گیا کہ وہ بہت بڑا ''منافق'' ہے اور اسلام کے ساتھ ''فراڈ'' کر رہا ہے۔ تو آخری سالوں میں اس عاجز نے ضیاء کو بڑے سخت خطوط لکھے۔ ایک دفعہ جب اس نے مردود جوش ملیح آبادی کی برسی منانے پر اسے خراج تحسین پیش کیا تو میں نے اس کو لکھا اگلی دفعہ ابوجہل کی ایک برسی کا انتظام بھی کرنا۔ تو ضیاء الحق نے ISPR کے بریگیڈیئر تفضّل صدیقی کے ذریعہ مجھے ''باور'' کرایا کہ میں اس کو اسلام ''سکھلانا'' بند کروں۔ یہ عاجز انہی دنوں امریکہ جا رہا تھا، راستے میں خانہ کعبہ اور روضہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضری کی سعادت ملی۔ عرض کی کیا ضیاء ''حق'' ہے؟ کانوں میں غیبی آواز آئی ''نہیں باطل ہے۔'' تو میرے منہ سے جو الفاظ نکلے۔ میں نے اپنے کئی رفقاء کو اس بارے ''آگاہ'' کیا۔ اگست 1988ء کے شروع میں پاکستان واپس پہنچا۔ تو چند دن بعد وہ الفاظ پورے ہو گئے کہ ضیاء کے ''پرخچے'' اڑ گئے۔ البتہ ضیاء الحق نے بھٹو والی بے حیائی کو روکا اور بھارت والے بھی ضیاء سے ڈرتے تھے۔

17۔ ضیاء الحق کو چھپے ہاتھوں نے بھٹو کو پھانسی چڑھانے کے علاوہ ایٹمی توانائی کو منجمد (Freeze) کرنے کے احکام دیئے اور ضیاء نے آتے ہی ایٹمی توانائی کو ایک دفعہ ''منجمد'' ضرور کیا۔ لیکن امریکہ کے روس کے ساتھ افغانستان میں ''پھنس'' جانے کا ضیاء نے فائدہ اٹھایا۔ 1984ء میں پاکستان کو نیوکلیئر طاقت بنا دیا۔ روس کی افغانستان میں ''شکست'' کے بعد چھپے ہاتھ

ضیاء الحق کے ''درپے'' تھے اور ضیاء کو یہ سب ''معلوم'' تھا۔ لیکن وہ بھٹو کی طرح ''شودھا'' آدمی نہ تھا کہ بازار میں آ جاتا۔ وہ بڑا گہرا اور دلیر آدمی تھا اور اس عاجز نے اس سے بڑھ کر کوئی بڑا ''بہروپیا'' نہیں دیکھا۔ بلکہ تاریخ عالم میں ایسا بہروپیا مجھے تو نظر نہ آیا۔ بھٹو تو اس کے مقابلہ میں بقول علامہ اقبال ''تماشہ دکھا کر مداری گیا'' تھا۔ اگر امریکی سفیر ضیاء کا ''ہم سفر'' نہ ہوتا تو ضیاء اس جہاز میں کبھی سفر نہ کرتا۔ لیکن امریکہ والے اپنے سفیر کی ''قربانی'' کے لئے تیار ہو گئے یا امریکی سفیر ''بے خبر'' تھا۔ شہید سہروردی کے بعد امریکی ''تھنک ٹینک'' کو پاکستان میں دوسرا ایسا آدمی نظر آیا، جو اُن کی بین الاقوامی پالیسی کا ''دھوبی پٹڑا'' کر سکتا تھا۔

18۔ ضیاء الحق کو معلوم تھا کہ جو چھپے ہاتھ ان کو طاقت میں لے آئے ہیں۔ وہ اس کو ''ٹھڈ'' بھی مار سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ایک حواری کے ''کچے پن'' کی وجہ سے یا مجید نظامی کی طرح خاندانی روایات پر عمل کرتے ''کہ کمہار کو پتا نہیں اور سنار سوتا نہیں''، چشتی یہ سمجھ بیٹھا کہ وہ پکے طور پر ''حکمران'' بن گئے ہیں۔ یہ لیفٹیننٹ جنرل فیض علی چشتی تھا کہ مظفر آباد کی ایک پریس کانفرنس میں کہنے لگا کہ اکثر لوگ ''چھپے ہاتھوں'' کا ذکر کرتے ہیں کہ اس نے یہ کر دیا اور وہ کر دیا۔ اگر آپ لوگ وہ ''چھپا ہاتھ'' دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ ''یہ'' ہے اور جنرل چشتی نے اپنا ہاتھ ''بلند'' کر دیا اور دو تین مرتبہ یہ بات دہرائی کہ لوگ چھپا ہوا ''ہاتھ'' دیکھ لیں۔ بظاہر اس میں کوئی حکمت نظر نہیں آتی تھی کہ ایک پوشیدہ بات کو اس طرح مشتہر کیا جائے۔ نتیجتاً جنرل چشتی کو بہت جلد کرسی اقتدار سے فارغ ہونا پڑا اور ساتھ میرے پلٹن وال لیفٹیننٹ جنرل غلام حسن کو بھی ''لے ڈوبا'' کہ چھپے ہاتھوں کو چھپا رہنا چاہیے تھا، چشتی غلطی یا جلد بازی کر بیٹھا تھا۔

19۔ قارئین! یہ عاجز بھی اب تک بہت ''چھپے ہاتھوں'' کو ننگا کر چکا ہے۔ اس مسودہ میں قارئین کئی ''پردہ نشینوں'' کے کھلے چھٹے کو پڑھیں گے۔ لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ میرے ساتھ کیا

ہوتا ہے۔ یہ عاجز اپنی ''کشتیاں'' 23 ستمبر 1965ء سے جلا بیٹھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی سعادتوں سے نواز چکا ہے کہ ''نشانات حیدر'' بھی عطا ہو چکے ہیں اور جو کچھ یہ عاجز کر سکتا تھا وہ پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں اور مزید کچھ کرنے کی سکت نہیں۔ تو ''آہ وزاری'' کو اختیار کر کے اب ایک نئی ''منزل'' میں داخل ہو چکا ہوں۔ پنجابی کی ایک مثال ہے ''کھاتا وہ نہیں جس کو ملتا نہیں'' گزارش کی تھی۔ میرے رب حرام کھانے کے مواقع ہی نہ دینا، ورنہ ہر آدمی کی کچھ ''قیمت'' ہوتی ہے۔ چھپے ہاتوں کو اس عاجز نے بھی بہت نزدیک سے دیکھا۔ جو مشاہدات آگے آرہے ہیں کہ ان لوگوں نے مجھے ''خریدنے'' کی کوشش بھی نہ کی، اور رب نے حرام کھانے سے بچائے رکھا۔

20۔ ضیاءالحق اب جانے والا تھا۔ پیراگراف نمبر 6 میں ذکر ہو چکا ہے کہ 1962ء سے چھپے ہاتھ گوہر ایوب یا آصف نواز میں سے ایک کو ''ایوب ثانی'' بنا کر ہم پر مسلط کرنے والے تھے۔ آصف نواز میجر جنرل کے عہدے تک پہنچ چکا تھا۔ چند سال کی بات تھی کہ 1988ء میں ضیاءالحق کے پرخچے اڑانے کے بعد جو غلام اسحٰق کو غلام محمد یا سکندر مرزا کی طرح استعمال کیا۔ تو سیاستدانوں میں سے ملک کو دولخت کرنے والے بھٹو کی بیٹی اور ''کچی بچی'' بے نظیر یا ''نادان'' نواز شریف کو وہی تگڑم ناچ نچانا تھا جو ایوب خان کو لانے سے پہلے ابراہیم چندریگر، حسین شہید سہروردی اور فیروز خان نون جیسے سیاستدانوں کو نچایا گیا تھا۔ اصلی آدمی بری فوج کا سربراہ ہوتا ہے۔ جب آصف نواز وہاں پہنچ گیا تو اس کو چھپے ہاتھوں نے وہ ''پذیرائی'' دی جس کو بیان کرنے کے لئے اس مسودہ میں گنجائش نہیں۔ بہرحال اس عاجز کے خاندان کے آصف نواز کے دادا محمد نواز کے زمانے سے فوجی نوکری کی وجہ سے کچھ ''رکھ رکھاؤ'' والے تعلقات تھے۔ آصف نواز کے دو چچے بریگیڈیئر محمد افضل اور بریگیڈیئر محمد زمان میرے ہم عصر اور دوست تھے اور چونکہ آصف نواز کے چچا محمد زمان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ تو اس نے آصف نواز کو ہی ''بیٹا'' بنایا ہوا تھا تو آصف نواز میرا بھی ''بیٹا'' بنا ہوا تھا۔

21۔ پاکستان بن جانے کے بعد اس عاجز نے دوستی اور رفاقت کیلئے ''جب لِللہ اور بغض لِللہ'' اصول کو اپنایا۔ گو آصف کا خاندان اسلامی اقدار سے دور تھا اور کرنل سلطان علی شاہ بھی اپنی کتاب ''شامت اعمال ما'' میں اس خاندان کے درپردہ چھپے ہاتوں سے تعلقات کا ذکر کرتا ہے۔ تو میں اس خاندان سے ''دور'' ہونے کی کوشش کرتا۔ لیکن بریگیڈیئر زمان کے ذاتی خلوص پھر 1956ء میں اچانک وفات اور اس کے اپنے بیٹے ناصر نواز کی جونیئر افسر کے طور پر مجھ سے وفاداری کی وجہ سے یہ عاجز ان لوگوں کے ساتھ اپنی ''وابستگی'' ختم نہ کر سکا۔ آصف نواز کے فوجی سربراہ بننے کے لئے دعائیں بھی کیں، لیکن جیسے وہ اس ''کرسی'' پر پہنچا تو سب سے پہلے اپنے ایک مخلص ماتحت جنرل حمید گل کو فوج سے چھٹی کرانے کا ''باعث'' بنا۔ ہم جو فوجیوں کو ''مجاہد'' بننے کی تربیت پر زور دیتے تھے۔ آصف نے ان ''اقدار'' کو ختم کرنا شروع کر دیا اور پوری تربیت کو انگریزوں کی نقالی پر ''ڈھالنا'' شروع کر دیا۔ جسکے مطابق فیلڈ مارشل ویول کی کتاب ''سولجری'' کے مطابق ہر سپاہی ایک ''چور'' اور ایک ''ڈاکو'' کی طرح دشمن پر وار کرتا ہے۔ مجھے رب سبحانہ نے سعادت عطا فرمائی کہ میں نے ایک نجی خط میں ان دونوں ''غلطیوں'' پر اس کو ٹوکا کہ ہر مسلمان سپاہی عشق رسول ﷺ سے لبریز میدان جنگ میں داخل ہوتا ہے۔ اور امن کے زمانے میں اس میں مجاہدانہ جذبہ پیدا کرنا ضروری ہے۔ لیکن آصف نواز پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کو ''ہدایات'' کہیں سے کوئی ''چھپے ہاتھ'' دے رہے تھے اور وہ ہماری فوج کو بھی ترکی کی فوج کی طرح ایک ''لادین'' یا ''بے دین'' فوج بنانا چاہتا تھا۔ جس کام کو ہمارے زمانے میں اس عاجز سمیت متعدد افسران نے شدت کے ساتھ اپنایا کہ فوج کو بے دین نہ ہونے دیا۔

22۔ آصف نواز کو جلد برطانیہ اور امریکہ کا دورہ کرنے کی دعوت ملی۔ راستے میں روم میں افغانستان کے معزول بادشاہ ظاہر شاہ سے ملاقات کرائی۔ جس یا اس کے ''پروردوں'' کو اینگلو امریکن بلاک والے افغانستان پر ''مسلط'' کرنا چاہتے تھے۔ امریکہ میں ہماری سفیر

عابدہ حسین کے مطابق آصف نواز کی ایک ملکی سربراہ کی طرح ''آؤ بھگت'' کی گئی۔ اب آصف کے پاس میرے خطوط پڑھنے کا کہاں ''وقت'' تھا؟ اسی دوران میری آصف کے ساتھ ایک ''ذاتی الجھن'' بھی ہوگئی۔ بات یہ تھی کہ جنرل اسلم بیگ کے زمانے میں ISPR کی وساطت سے فوج نے میرے ساتھ 48-1947ء کے کشمیر کے جہاد پر ایک کتاب لکھنے کا معاہدہ کیا۔ جس کے لئے لاکھوں روپے خرچ کر کے نو مقامات پر ''سیمینارز'' کئے اور اس جنگ کے ''شرکاء'' میں سے متعدد اہم لوگوں کی میرے ساتھ ملاقات کرائی گئی تمام متعلقہ سیکرٹ کاغذات کو ''کھلا'' قرار دے کر میرے حوالے کیا۔ میں نے اس سلسلہ میں تفصیل سے دو جلدوں کی کتاب لکھنی تھی اور کتاب کی اشاعت کے خرچ کے تقریباً 18% کے برابر مجھے ''اعزازیہ'' ملنا تھا۔ جو تین چار لاکھ روپے ضرور بنتا۔ ساتھ ہی فیصلہ ہوا کہ کتاب کا اختصار کر کے ملک کے مایہ ناز صحافی سید شبیر حسین، بین الاقوامی ضرورت کیلئے اس کتاب کو انگریزی میں Render کریں گے اور ان کو میرے اعزازیہ کے تقریباً آدھے کے برابر اعزازیہ ملے گا۔ کتاب اگست 1991ء میں پوری طرح تیار ہوگئی تھی اور میں مسودے اور تحقیقات کی کاپیاں شبیر حسین کو دے رہا تھا۔ تو شبیر حسین نے اکتوبر 1991ء ہی میں پاکستان ٹائمز میں کتاب پر پیشگی تبصرہ کر دیا کہ میجر امیر افضل نے اس کتاب میں جو ''انکشافات'' کئے ہیں اور خاص کر جنوبی مشرقی ایشیاء کے مسلمانوں کے خلاف اینگلو امریکن کی سازشوں کو جو طشت از بام کیا ہے۔ قوم کتاب کی اشاعت کا انتظار کرے۔

23۔ آگے بہت لمبی کہانیاں ہیں۔ یہ عاجز مسودہ ISPR کے حوالے کر چکا تھا۔ اس کی کاپیاں متعدد دفتروں کو بھی سرکولیٹ کردی گئیں۔ دراصل مسودہ پیش کرنے کے ایک ماہ کے اندر مجھے اندازاً آدھا ''اعزازیہ'' مل جانا تھا اور باقی کتاب کی اشاعت کے بعد۔ لیکن یہاں تو صورت حال تبدیل ہوچکی تھی۔ خبر ملی کہ امریکہ کا سفیر آصف نواز کو مل چکا تھا اور آصف نواز اپنے ماتحتوں کو کہہ رہا تھا کہ کسی طرح میجر امیر افضل کو کچھ دے کر ''ٹرخا'' دیا جائے۔ لیکن

لیفٹیننٹ جنرل فرخ جو جونیئر افسر کے طور پر مجھے جانتا تھا۔ اس کو میرے ساتھ ملاقات کرنے کی ''ہمت'' نہ ہو رہی تھی۔ تو ان دنوں جنرل آصف اور اس کے ماتحتوں کو کاپیاں دیتے جو میں نے خطوط لکھے کہ ان کو شرم نہیں آتی کہ میں جو ان کے باپ کی جگہ ہوں اس کے ساتھ یہ ''رویہ'' رکھ رہے ہو۔ وہ کاغذات میرے پاس ہیں، لیکن ''سازش'' بہت گہری تھی۔ امریکہ والے آصف نواز کو بھارت ''یاترا'' کی دعوت دلا چکے تھے۔ وہ پہلا بری فوج کا سربراہ تھا جس کو ایسی دعوت ملی، تو جنرل فرخ کے ایک نائب اس وقت میجر جنرل اور بعد میں سندھ کے گورنر معین حیدر کو کرنل رمضان ایک قانونی مشیر کی مدد سے میرے لئے ''ملاقات'' کیلئے ''تیار'' کیا۔ میں نے معاہدہ کے کسی قانونی پہلو پر بات کرنے سے انکار کر دیا کہ میرے لحاظ سے اس معاہدہ کیلئے ''زبانی الفاظ'' سب کچھ ہیں جن کو بعد میں کاغذ پر لکھ بھی دیا گیا تھا اور طرفین کے دستخط موجود ہیں۔ تو معین حیدر نے مجھے تقریباً میری دو لاکھ روپے کی ''مزدوری'' یا ''اعزازیہ'' کی پیشکش کر دی بشرطیکہ میں نے جو کچھ حق تلاش کیا ہے وہ کاغذات جلا دیئے جائیں اور ان کی کہیں اشاعت نہ ہو۔

24۔ یہ کچھ میری برداشت سے باہر تھا۔ میں نے گرجدار آواز میں کہا۔ ''عزیزان! آپ نے میری بڑی بے عزتی کی ہے اور ''قیمت'' بھی بہت ''تھوڑی'' لگائی ہے کہ اپنا حق یا مزدوری حاصل کرنے کے لئے دو لاکھ کے عوض اللہ تعالیٰ سبحانہ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا چور بنوں۔ اس عاجز نے جو سچ اور حق تلاش کیا ہے۔ یہ عاجز پائی پائی جوڑ کر سب کچھ شائع کرائے گا۔ (قارئین! میری کتاب جہاد کشمیر اور پاکستان کی کہانی اور متعدد مضامین جن پر اس عاجز نے اپنی جیب سے بھی بے حساب خرچ کیا۔ میرے ان الفاظ کا عملی پہلو ہے) میں کانفرنس سے اٹھ کھڑا ہوا اور شاید فطرت بھی مجھے حق و سچ کا بول بالا کرنے کے لئے تیار کر رہی تھی۔ دو تین دن بعد آصف نواز نے اپنے بھارتی ہم پلہ جنرل کو نہ صرف پاکستان آنے کی دعوت دے دی بلکہ یہ بھی اعلان کر دیا کہ بھارتی جنرل کو شالیمار باغ میں چائے کی دعوت دی جائے گی۔ اب تو

میرے بدن میں آگ لگ گئی کہ آصف نواز کون ہوتا ہے کہ شالیمار باغ لاہور کے تقدس کو بھارتی جنرل کے قدموں سے مجروح کرائے۔ اس کا پس منظر قارئین آنے والے پیراگراف نمبر 116 میں پڑھیں گے۔ آصف نواز کے بھائی ناصر نواز سمیت ہماری یونٹ نے ستمبر 1965ء میں کتنی عظیم قربانی دی اور شالیمار باغ کی مقدس زمین کو بھارتی درندوں کے حملوں سے بچانے کے لئے ہزاروں بھارتیوں کو واصل جہنم کیا۔ تو مجھے ایسے محسوس ہوا کہ میرے شہید ساتھی اور ماتحت مجھے پکار رہے ہیں کہ ''میں شالیمار باغ کے تقدس کو بھارتی جنرل کے قدموں سے ناپاک ہونے سے بچاؤں۔''

25۔ افسوسناک بات اور ہماری قومی بے غیرتی پر کیا تبصرہ کیا جائے کہ نہ ہماری حکومت میں کچھ لے دے ہوئی کہ بھارت والے آصف نواز کو کیوں بلا رہے ہیں؟ نہ کسی اخبار یا دانشوار نے سوائے کرنل سید غفار مہدی کے اس پر تبصرہ کیا کہ یہ معاملہ کیا ہے اور چھپے ہاتھ کیا چاہتے ہیں۔ ہمارا اس وقت کا خارجہ سیکرٹری شہر یار جب بھارت گیا تو وہ اپنے بیٹے کی منگنی بھی کرآیا اور آصف نواز کے لئے دعوت نامہ بھی لے آیا۔ یہ شہر یار وہی ہے جو چند سال پہلے کرکٹ بورڈ کا چیئر مین تھا اور اکثر جنرل مشرف کے ساتھ ''چمچیاں'' ڈالتے ٹی وی پر دیکھا جاتا تھا کہ مشرف کے والد کے ساتھ بھی ''نوکری'' کر چکا تھا۔ تو پھر اس کی بیوی کا ایک بھارتی سفارتکار کے ساتھ گلے ملنے والا فوٹو شائع ہوا، تو کافی لے دے ہوئی۔ کرکٹ کا کچھ بیڑہ بھی ڈوبا تو قوم کو اس شہر یار سے ''نجات'' حاصل ہوئی آصف کے رویہ کیلئے اب یہ عاجز کیا کرتا میں اس بے غیرتی پر کوئی بیان دیتا تو کوئی شائع نہ کرتا۔ تو میں نے سیدھے طور اس وقت کے صدر غلام اسحٰق کو خط لکھ دیا۔ کاپی اس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف، آصف نواز سمیت سہ افواج کے تینوں سربراہوں اور بری فوج کے کور کمانڈروں کو بھی دی اور کئی جاننے والوں اور نوائے وقت اور جنگ سمیت چند اخباروں کو بھی دی۔

26۔ میں نے اوّل فوج کے ساتھ اپنے کتاب کے لکھنے کے معاہدہ کی پوری کہانی لکھی کہ مجھے

اعزاز یہ نہیں دیا جارہا اور کہتے ہیں کہ یہ ''مزدوری'' حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ اور رسول پاک ﷺ کا چور بنوں۔ پھر آصف نواز نے جو بھارتی جنرل کے ناپاک قدموں سے شالا مار باغ کے تقدس کو مجروح کرنے کی ٹھانی ہے۔ میرے لحاظ سے اب بری فوج کی سربراہ کی کرسی جو مقدس ورثہ ہے اس پر اس کو بیٹھنے کا کوئی حق نہیں۔ میں یہ کاپی آصف نواز کے ماتحتوں کو اس لئے دے رہا ہوں کہ بات خوب پھیلے مجھے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا ڈر نہیں۔ میں اپنی ''کشتیاں'' 23 ستمبر 1965ء کو جلا چکا ہوں۔ اس خط پر نہ کسی نے کوئی تبصرہ کیا، نہ کسی نے کوئی ردعمل ظاہر کیا۔ البتہ ان دنوں نواز شریف اور آصف نواز میں جوتیوں میں دال بٹ رہی تھی اور چھپے ہاتھ نواز شریف اور غلام اسحٰق میں ''پھڈا'' ڈلوا چکے تھے۔ تو نواز شریف کے سیکرٹری نے خط ''اکنالج'' ضرور کیا اور یہ بھی لکھا کہ نواز شریف کی خواہش ہے کہ حق کو نہ روکا جائے۔ آصف نواز جو کبھی میرا ''بیٹا'' بھی بنا ہوا تھا اور مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے یہ خط پڑھ کر دانت ضرور بھینچے کہ اوپر جانے کے لئے وہ کئی ''محاذ'' کھول چکا تھا اور خاندانی روایات کے مطابق دانت بھی بھینچتا رہتا تھا اور معاملات برداشت بھی نہ کر سکا۔ اس کے اوپر والے تو اس سے ''کرسی'' خالی نہ کرا سکے، لیکن رب ڈاڈھے نے اس سے یہ کرسی خالی کرا دی۔ قوم ایک ''ایوب ثانی'' کے شر سے بچ گئی جس کو ہم پر مسلط کرنے کے لئے چھپے ہاتھ پچھلے تیس سالوں سے کام کر رہے تھے اور امریکہ والوں کی ''سکیم الفا'' پروان نہ چڑھ سکی۔

27۔ آصف نواز کے ''ایوب ثانی'' بننے سے مستفیض ہونے والوں کا اتنا بڑا پُر اثر ''انبوہ'' تھا کہ آصف کی موت کے بعد انہوں نے اخباروں کے صفحات کو سیاہ کر دیا کہ پاکستان ایک ''عظیم جنرل'' سے محروم ہو گیا ہے۔ حالانکہ جونیئر افسر کے طور آصف نے ستمبر 1965ء اور دسمبر 1971ء کی جنگ میں ایک دھیلے کا کام نہ کیا تھا۔ ایوب خان کی طرح وہ دل کا بھی بہت چھوٹا اور ''ادراک'' یا ''تدبیر'' میں اوسط درجہ کی شخصیت کا تھا۔ لیکن چھپے ہاتھ ایسے ہی لوگوں کی تلاش میں ہوتے ہیں بلکہ کردار کے لحاظ سے بھی چھپے ہاتھ اس ''تلاش'' میں ہوتے

ہیں کہ آگے پیراگراف نمبر 91 میں عزیز احمد کی زبان سے وضاحت آ رہی ہے کہ کوئی ''کردار'' نہ ہو کہ کردار ازخود کے اس زمانے میں کئی ''مفہوم'' ہیں۔ بہرحال اس عاجز نے آصف کی موت پر صدر اسحٰق کو خط لکھا جس کی کاپی حسب معمول نواز شریف، آصف کے جانشین جنرل وحید کاکڑ اور کور کمانڈروں کو بھی دی کہ یہ عاجز آصف کے لئے وہ الفاظ استعمال کرے گا جو حفیظ جالندھری نے جوش ملیح آبادی کی موت پر کئے کہ ''کاش! وہ اور دن زندہ رہتا اور توبہ و ندامت کے بعد اس کی موت آتی۔'' بہر حال آپ لوگ میری ''مظلومیت'' کیلئے بھی سوچیں اور مجھے میرے معاہدہ کا اعزازیہ یا ''مزدوری'' دلائیں۔ تو غلام اسحٰق کو میری ''مظلومیت'' پر تو کوئی ''ترس'' نہ آیا۔ البتہ بعد میں بیگم آصف کی ''مظلومیت'' پر ترس آ گیا جو اسحٰق کی سیاسی ضرورت تھی کہ نتیجتاً آصف نواز کی ''قبر کشائی'' ہوئی جو شاید فطرت کی ''ضرورت'' ہوگی کہ قبر کشائی سے اردگرد کے ماحول میں بو پھیلنے سے لوگ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ (فاعتبرو یا اولی الابصار)

28- ''سکیم الفا'' کا بڑا ایکٹر آصف نواز تو منظر سے ہٹ چکا تھا۔ لیکن سیاسی خربازاری والا عمل جاری تھا اور نواز شریف اور اسحٰق میں جوتیوں میں دال بٹ رہی تھی۔ آصف کے ساتھ مل کر میرے ساتھ بے انصافی کرانے والے لیفٹیننٹ جنرل فرخ کو بھی کسی نے گھاس نہ ڈالی اور اسحٰق خان نے آصف کی جانشینی اپنے پختون بھائی وحید کاکڑ کے سپرد کر دی جو فرخ سے جونیئر تھا کہ وہ اس کو ''حفاظت'' مہیا کرے گا۔ لیکن اسحٰق کی ''معیاد'' اب پوری ہو چکی تھی۔ چھپے ہاتھوں نے اس کو صرف اتنا استعمال کیا کہ غلام کذاب کے پوتے ایم ایم احمد کے ذریعہ سے اس کو ''احکام'' بھیجے کہ نگران وزیر اعظم کا کام وہ یہودی سرمایہ داروں کے ''حصہ دار'' معین قریشی کو سونپے۔ کہ ضیاء الحق کے مرنے کے بعد سیاسی افراتفری کی وجہ سے پاکستانی معیشت امریکہ کے کنٹرول سے باہر نکلتی جا رہی ہے۔ معین قریشی اس معیشت کو پکے طور پر امریکہ کی ''لونڈی'' بنا دے۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ معین قریشی کو ''مشاورت'' کے لئے مشہور

چھپا قادیانی کرنل اکرام اللہ دیا گیا، جونوائے وقت والوں کا بھی ''خاص الخاص'' آدمی ہے۔ اس عاجز کے پاس اکرام اللہ کا مکمل ''حدود اربعہ'' موجود ہے، جس کی زندگی کے تمام اعمال ہمیشہ باطل طاقتوں اور برائی وشر کی پیداوار رہے۔

29۔ اسلامی معاشرہ اور مسلمانوں کی زندگی دودھ کی طرح صاف شفاف ہوتی ہے۔ اس میں کوئی پلید پانی کا قطرہ ہی گر جائے تو یہ حالات ہوتے ہیں کہ پچھلے ساٹھ سالوں میں ان کافرانہ آئینوں اور باطل و پلید رومن قانونوں نے ہمیں ذلت سے دوچار کیا ہوا ہے اور ہمارے حالات پر جگ ہنسائی ہوتی رہتی ہے۔ اس بیسویں صدی کی آخری دہائی میں یہ ہمارا کافرانہ آئین اور باطل و پلید رومن قانون جس طرح ہمیں افراتفری اور ذلت سے دوچار کرتے رہے کہ افسوس قوم نے ادھر دھیان نہ دیا۔ دو دفعہ ملک دولخت کرانے والے بھٹو کی بیٹی اور ''کچی بچی'' بے نظیر اور ''نادان'' نواز شریف ملک کے وزیر اعظم بھی بنے اور دو دفعہ بے عزتی سے اس کرسی سے اتار بھی دیئے گئے۔ غلام اسحٰق نے پنجاب کی سربراہی ایک مکار ''قادیانی بچے'' منظور وٹو جس نے مسلمان کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے کے سپرد کر دی۔ جس نے ''کچی بچی'' بے نظیر کی پینگوں کے جھولوں میں ''رفاقت'' کی۔ اسمبلیوں کو توڑنے اور حکومت کے طریقوں پر کچہریوں میں جو ہر جھوٹ کو ''سچ'' ثابت کرنے اور ہر سچ وحق کو ''جھوٹ'' ثابت کرنے کے لئے جو وکیلوں نے بحث کی تو اکبر الہ آبادی یاد آ گئے، جنہوں نے کہا تھا ''پیدا ہوئے جو وکیل تو ابلیس نے کہا، لو آج ہم بھی صاحب اولاد ہو گئے۔'' ایک وقت پنجاب کے دو گورنر تھے ایک صدر کا مقرر کردہ اور ایک وزیر اعظم کا مقرر کردہ۔ ان دونوں یعنی صدر اسحٰق اور وزیر اعظم نواز شریف کی وقعت یہ تھی کہ ایک ''ٹکڑے اڑانے والے'' فوجی سربراہ وحید کاکڑ نے اپنی مرضی کے کاغذ پر ان دونوں سے انگوٹھا لگوا کر دونوں کو اکٹھا ''ٹھڈ'' مار دیا۔ لیکن خود جنرل وحید کاکڑ اتنا گیا گزرا تھا کہ چھپے ہاتھ اس کی ''خدمات'' نہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

30۔ بہر حال پاکستان کی سیاست چونکہ بری فوج کے سربراہ کے ''محور'' کے گرد گھومتی ہے۔ تو چھپے

ہاتھ کسی ایسے آدمی کی تلاش میں تھے جوان کی ''سکیم بریوؤ'' کے تحت ''ایوب ثانی'' بن سکے تو انہیں منظور وٹو کی طرح ایک ''قادیانی بچہ'' جہانگیر کرامت مل گیا جس نے شرافت اور اسلام کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا۔ اسی طرح عمر حیات ٹوانہ اور سر سکندر حیات کے ''ٹوڈی'' خاندانوں کی طرح جمال خان لغاری کا بھی ایک ''ٹوڈی'' خاندان تھا۔ جس سے یہ لوگ 1944ء میں قائداعظیم کے ساتھ بے وفائی اور وعدہ خلافی کرا چکے تھے کہ اس نے خضر حیات ٹوانہ کا وزیر بن کر تحریک پاکستان اور مسلمانوں کا بہت نقصان کیا تھا۔ اور آزادی کے بعد اس کا بیٹا محمد خان پنجاب کی ہر وزارت کا وزیر بن کر خرباز اری اور سیاست کے فصلی بٹیروں کے اصول کو ''پروان'' چڑھاتا رہا تھا۔ لیکن اپنے بیٹے فاروق کو ''سول بیورکریٹ'' بنوادیا۔ اب چھپے ہاتھوں کو جنوبی پنجاب کے کسی سیاستدان کی ضرورت بھی تھی کہ اپنے ''پروردوں'' میں اضافہ کر رہے تھے تو فاروق لغاری کو اپنے خاص الخاص ''بندے'' ذوالفقار بھٹو کے تحت سیاسی ''تربیت'' دلوائی۔ پھر وہ مکمل طور پر بھٹو کے خاندان کے ساتھ ایسے ''وابستہ'' ہوا کہ انہوں نے اس کو ملک کا صدر بنوادیا۔ لیکن ''بیوفائی'' اور ''کھر بوجی'' ان کے خاندان کی ''گھٹی'' میں ہے کہ فاروق کا دادا جمال خان قائداعظم اور مسلم لیگ کے ساتھ 1944ء میں بے وفائی کر چکا تھا۔ تو فاروق نے یہ خاندانی روایات قائم رکھتے، بے نظیر کی حکومت کو برخاست کر دیا۔ اب چھپے ہاتھوں نے فاروق لغاری اور جہانگیر کرامت میں رابطہ بندھوا کر ان کو ہم پر ''براجمان'' کرانا چاہا۔ قادیانی خوب بغلیں بجا رہے تھے کہ اب حکومت پکے طور پر ان کو مل جائے گی لیکن جہانگیر کرامت بہت چھوٹے دل والا ''نکلا۔'' قارئین کو معلوم ہے کہ نواز شریف جیسے ''نادان'' اور ''بے وقعت'' آدمی نے فاروق اور جہانگیر کرامت دونوں کو باری باری ''فارغ'' کر دیا۔

31۔ نواز شریف بھی چھپے ہاتھوں کا ''آدمی'' تھا اس عاجز کو نواز شریف کو ایک کھلا خط نومبر 1995 میں لکھنے کی سعادت ملی۔ جو اخبار ''نوائے وقت'' میں شائع بھی ہو گیا تھا، اور اس عاجز نے

دسمبر 1996ء میں بھی قوم کے نام ایک کھلے خط میں نواز شریف کو باور کرادیا تھا کہ میں اس کو دوسری دفعہ تنبیہ کررہا ہوں، وہ توبہ وندامت کا اعلان کر کے اسلام کے نفاذ کا وعدہ کرے۔ ورنہ اگر وہ دوسری دفعہ وزیراعظم بن گیا تو پہلے سے زیادہ ذلت کے ساتھ اس کو یہ ''کرسی'' خالی کرنا پڑے گی۔ نواز شریف نے اس خط کا بھی کوئی اثر نہ لیا اور چھپے ہاتھوں کے ''احکام'' مانتے بھارت کے وزیراعظم واجپائی کے ساتھ ''جپھیاں'' ڈالنا شروع کردیں۔ لیکن چھپے ہاتھوں کو ''سکیم بریوؤ'' کو پروان چڑھانے کے لئے کسی ''فوجی افسر'' کی ضرورت تھی اور ان کے آدمی تو ہر گروہ میں یا ہر ادارے کے ساتھ ''موجود'' ہوتے ہیں۔ انہوں نے نواز شریف کو تنبیہ کی کہ خبردار اس کرسی پر علی قلی خان کو نہ بیٹھانا کہ اس کے بڑے خاندانی ''اثرات'' ہیں۔ وہ بری فوج کا سربراہ بن گیا تو تمہیں جلد ''چلتا'' کرے گا۔ دوسرے نمبر والے خالد ملک کو بھی یہ کرسی نہ دینا کہ وہ پنجابی ہے اور تم ''بدنام'' ہو جاؤ گے کہ سب اہم جگہیں پنجابیوں کے حوالے کردیں۔ اصلی بات یہ تھی کہ چھپے ہاتھ جانتے تھے کہ علی قلی اور خالد دونوں کی کچھ خاندانی روایات ہیں۔ وہ ایوب خان کی طرح ان کے ''وائسرائے'' نہیں بنیں گے۔ تو انہوں نے نواز شریف کو باور کرایا کہ تیسرے نمبر پر پرویز مشرف دہلی کا ایک مہاجر ہے۔ فوج میں اس کے ''حدود اربعہ'' والے لوگ بہت کم ہیں۔ اس کا فوج پر زیادہ اثر نہیں اور نواز شریف کو اس سے کوئی ''خطرہ'' نہیں ہے۔ لیکن بات ''کرسی'' کی ہوتی ہے یہی غلطی ایوب خان نے کی کہ یحیٰی خان شرابی کبابی ہے اور شیعہ ہے اس کا فوج پر زیادہ اثر نہ ہوگا کہ فوج میں زیادہ لوگ مذہبی اور اہل سنت ہیں۔ یہی غلطی بھٹو نے کی کہ مجید ملک کی بجائے ضیاء الحق کو بری فوج کا سربراہ بنادیا کہ ضلع جالندھر کا مہاجر ہے اور ''ارائیں'' قبیلہ سے تعلق ہے جو فوج میں بہت کم ہیں۔

32- بے چارے نواز شریف کو یہ تو معلوم نہ تھا کہ مشرف کا باپ وزارت خارجہ میں کام کرتا رہا تھا۔ جس وزارت کو ظفر اللہ بے دین لوگوں یا ابن الوقت لوگوں یا قادیانیوں سے بھر گیا تھا۔ پھر

شہر یار اور مشرف کے والد کے تعلقات کا ذکر بھی پیرا 25 میں ہو چکا ہے۔ جنہوں نے بیٹے کا نام حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی چٹھی پھاڑنے والے خسرو پرویز کے نام پر رکھا۔ ان کے بارے ''چھپے ہاتھ'' آگاہ تھے کہ ایسے لوگوں کی اسلام کے ساتھ ''وابستگی'' برائے نام ہوتی ہے تو ایسے لوگوں کو ''خریدا'' بھی جا سکتا ہے۔ مشرف کے بارے یہ عاجز آگاہ نہیں کہ اس کا رابطہ ''چھپے ہاتھوں'' کے ساتھ کب بندھا۔ لیکن وہ جو حکومت سنبھالنے کے بعد مردود کمال ترکی کے ''مداح'' ہونے کا اکثر اعتراف کر چکا ہے۔ تو ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام دشمن طاقتوں اور چھپے ہاتھوں کے ساتھ مشرف کے تعلقات بہت ''پرانے'' ہیں کہ کمال ترکی کا ذکر آگے پیراگراف نمبر 50 میں آ رہا ہے۔ بین الاقوامی دنیا میں اسلام کے خلاف سب سے بڑی سازش جس نے اسلام کو بہت نقصان پہنچایا اور یہ سازش اب بھی جاری ہے اس کا بڑا کرتا دھرتا یہی مردود کمال ترکی تھا۔ بہر حال صاف ظاہر ہے کہ چھپے ہاتھوں نے مشرف کو کوئی بڑے ''کایاں مشیر'' مہیا کئے ہوئے تھے۔ یحییٰ خان اور ضیاء الحق کا تو بری فوج کے سربراہ بننے سے پہلے بھی فوج میں ایک بہت بڑا ''سرکل'' تھا۔ پرویز مشرف بالکل ایک غیر معروف انسان یا ''جنرل'' تھا۔ لیکن سربراہی حاصل کرتے اس نے فوج کے ہر دلعزیز اور اسلامی خیالات کے جنرلوں، عثمانی اور عزیز وغیرہ کے ساتھ ''یارانہ'' گانٹھا اور ان کو اپنا ''حواری'' بنایا۔ پھر ایسے سب لوگوں کو ''اعتماد'' میں لیتے نواز شریف کے ''مہمان'' واجپائی کو لاہور میں ''سیلوٹ'' کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ بالکل اسی طرح تھا جیسے 1965ء میں بھٹو نے بھارت کے ساتھ ایک ہزار سال لڑائی لڑنے کا اعلان کر کے قوم کو بے وقوف بنایا تھا۔ پس پھر کیا تھا ہماری بھولی بسری قوم نے اندرونی طور مشرف اور فوج کے ''زندہ باد'' ہونے کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

33۔ اس کے بعد مشرف نے اپنے پرانے رفیق لیفٹیننٹ جنرل محمود احمد کو بھی ساتھ ملاتے کارگل میں کارروائی کر کے جو قوم کو بے وقوف بنایا یا نواز شریف کے ''شودھے پن'' کو جس طرح

استعمال کیا، اس المیہ پر ابھی بھی ''پردے'' پڑے ہوئے ہیں۔ اس المیہ کی اختصار سے وضاحت بھی کئی صفحات میں ختم نہ ہوگی کہ نواز شریف کو بتایا گیا کہ کارگل کے ان ''مقبوضہ'' علاقوں کو ''آزاد'' کرایا جارہا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ جنگ آزادی سری نگر کے گردو نواح تک پہنچ جائے گی۔ نواز شریف بجائے اس کے کہ سوال کرتا کہ کیا بھارت یہ سب کچھ ''ہضم'' کرلے گا؟ کہنے لگا کہ سری نگر کب تک آزاد ہو جائے گا؟ تو مشرف وغیرہ نے نواز شریف کی اس ''سمجھ بوجھ'' پر بات ہنسی میں ٹال دی۔ قارئین! جس طرح 1965ء میں بھٹو اور اختر ملک نے ایوب کو بے وقوف بنایا، اسی طرح اب نواز شریف کو بے وقوف بنا کر اس کو ''چلتا'' کرنا تھا۔ یہ کارروائی 1965ء کی ''گوریلا'' کارروائی سے زیادہ سخت تھی کہ بھارت کے مقبوضہ علاقے زمینی طور پر ''آزاد'' ہو رہے تھے۔ بھارت یہ کچھ کیسے ''ہضم'' کرتا۔ واجپائی نے نواز شریف کو صاف بتادیا کہ بھارت نہ صرف یہ علاقے بزورِ شمشیر واپس حاصل کرے گا بلکہ اگر دونوں ملکوں میں اس سلسلہ میں جنگ ہو جاتی ہے تو بھارت کو فکر نہیں۔ ادھر اپنی یہ حالت تھی کہ نواز شریف نے جب تینوں افواج کے سربراہوں کو بلایا۔ تو بحری اور فضائی فوج کے سربراہوں نے نہ صرف تمام تر ''مہم'' سے اپنی لاعلمی کا اظہار کردیا۔ بلکہ فضائی فوج کے سربراہ نے تو ہاتھ کھڑے کردیئے کہ فضائی فوج کسی جنگ کی ''متحمل'' نہیں ہے۔ اور بھارت کا مقابلہ کرنے کے ''قابل'' نہیں۔ بلکہ بری فوج کے کور کمانڈر بھی صورت حال سے ''آگاہ'' نہ تھے۔ نہ کسی تیاری کی حالت میں تھے۔

34۔ اب جن لوگوں نے کارگل کے علاقے ''آزاد'' کرائے تھے۔ وہ فوجی جذبہ جہاد کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر بن چکے تھے اور اگر ان کی معمولی مدد بھی جاری رکھی جاتی تو بھارت کو ان کو وہاں سے ''خارج'' کرنے کی بہت ''قیمت'' ادا کرنا پڑتی کہ اس کا بے حساب جانی نقصان ہوتا۔ تو ایک طرف نواز شریف کو بے وقوف بنا کر اس سے امریکہ کے سامنے ہاتھ ''جڑوائے'' تو دوسری طرف بھارتیوں سے ان مجاہدین کو اتنی مار دلوائی کہ جہاد کا کیڑا ان کے دماغ سے

نکل جائے۔ مشہور یہ کر دیا کہ مشرف تو لڑ کر کشمیر کو آزاد کرانا چاہتا تھا، لیکن نواز شریف دل چھوڑ گیا تھا اور ہماری بھولی، بسری اور نادان قوم مشرف کو اسی طرح ''ہیرو'' بنائے ہوئے تھی۔ جس طرح تاشقند کے رازوں کی آڑ میں قوم نے بھٹو کو ایک ''ہیرو'' بنا لیا تھا۔ توبہ میرے اللہ۔ یہ عاجز اس سلسلہ میں ایک کتاب بھی 1985ء میں لکھ چکا تھا کہ بھٹو کس طرح مداری کی طرح تماشے دکھا کر اور شعبدہ بازی سے قوم کو بے وقوف بناتا رہا۔ لیکن مومن کی فراست سے عاری ہماری قوم مشرف کے اس کارگل کے ''ڈرامے'' کو نہ سمجھ سکی۔ اب نواز شریف، مشرف کے ''درپے'' تھا اور مشرف، نواز شریف کے ''درپے''۔ 1999ء میں نواز شریف نے ایک نامکمل تجویز سے ''پہل کاری'' کی کوشش کی کہ مشرف کو ''چلتا'' کیا جائے لیکن مشرف اور اس کے حواری ''آگاہ'' تھے۔ ان کی تجویز زیادہ ''پختہ'' تھی کہ چھپے ہاتھ دل سے ان کے ساتھ تھے تو نواز شریف کا ''پتڑہ'' ہو گیا۔ نادان قوم اور سیاست کے فصلی بٹیروں میں ''نووارد'' طاہر قادری اور عمران خان نے بھی مشرف زندہ باد کے نعرے لگا دیئے۔ باقی صورت حال پر یہ عاجز ہرگز تبصرہ نہ کرے گا کہ اب تو کھلے طور پر واضح ہو گیا ہے کہ مشرف امریکہ ایجنڈا لے کر آیا تھا۔ اس نے اسلامی خیال کے جرنلوں کو بھی بے وقوف بنایا تھا۔ ہم پر تو پہلے دن واضح ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ امریکہ کی ''کارستانی'' ہے کہ مشرف کے مالی امور اور معاشی معاملات کی نگرانی شوکت عزیز کے ہاتھوں میں تھی اور ایسے رہی۔

35۔ قارئین نے دیکھا ہوگا کہ شوکت عزیز ہر موقع پر اس طرح تقریر کر رہا ہوتا تھا کہ سامعین شاید پرائمری سکول کے طالب علم ہیں۔ وہ کبھی کوئی ''سچی یا بامقصد بات نہیں کرتا تھا'' اس کی تقریر مہمل الفاظ میں ہوتی اور تلمیحات یا اصطلاحات کی لفاظی سے مدد لے کر وہ ایسی باتیں کرتا تھا۔ جو سراسر بناوٹ اور جھوٹ ہوتا تھا۔ آج تک اس کی زبان سے سچ اور حق والے الفاظ کبھی ادا نہیں ہوئے۔ شوکت کا اس ''قبیلہ'' سے تعلق ہے جن کی بنیاد ایوب خان کا وزیر خزانہ مسٹر شعیب باندھ گیا ہے۔ غلام کذاب کا پوتا ایم ایم احمد اور کبھی غلام اسحٰق اور کبھی محبوب الحق

وغیرہ بھی اس ''قبیلہ'' کے کرتا دھرتا رہے اور پیراگراف نمبر 28 میں ذکر ہو چکا ہے۔ کہ معین قریشی ہمارے ملک کیلئے ایسی معاشی پالیسی کو پکے طور پر ہمارے اوپر ''نافذ'' کر گیا ہے۔ مشرف اور اس کے حواری کس طرح امریکہ کو ہمارے ملک اور اس کے ذرائع سے مدد کر رہے ہیں کہ امریکہ اور باقی چھپے ہاتھ، افغانستان میں اسلامی طاقتوں کا صفایا کر دیں۔ اسی ''ہدف'' کے لئے امریکی تھنک ٹینک والے تجویز بنا رہے ہیں کہ پاکستان میں بھی اسلام کا صفایا کرنا ہے۔ چنانچہ آج ہمارے ہر سیاسی گروہ یا پارٹیاں امریکہ والوں کی ''پچھ لگ'' ہیں ہر جگہ اور ہر گروہ میں ان چھپے ہاتھوں کے ''کاردار'' بیٹھے ہیں، جو ہم پوری قوم کو لڑا رہے ہیں۔ یہ دھماکے ہو رہے ہیں اور یہ ''بغاوتیں'' ہو رہی ہیں۔ صرف لال مسجد کے معاملے پر غور کریں کہ دارالحکومت میں یہ ''مورچہ زنی'' یہ ہاتھوں ہاتھ لڑائی پچھلے چودہ سو سالوں میں کسی مسجد کے اندر سے بھی کسی حکومت کے ساتھ اس طرح ہوئی ہے؟ اب ''ججوں'' اور حکومت کی لڑائی کے منظر پر نظر ڈالیں۔ کبھی جج بھی اپنی پذیرائی کیلئے اس طرح عوام سے خراج تحسین لینے کے لئے باہر نکلتے ہیں۔ ہماری نادان قوم نے کافرانہ رومن قانون کے ''پودوں'' کو اپنا رہنما بنا لیا کہ ان کی مدد سے مشرف کی آمریت سے ''نجات'' حاصل کریں گے، لیکن بات ہی کچھ اور ہے۔ جو قوم پر کچھ عرصہ بعد واضح ہو گی کہ اول مقصد انتشار اور افراتفری ہے۔ دوم ملک میں ''اسلام پسند'' گروہوں کو اتنے حصوں میں بانٹنا ہے کہ جس طرح 1970ء میں صرف 37 فیصد ووٹ لے کر بھٹو ہمارا حاکم اور رہنما بن گیا۔ اسی طرح اب اس '' کچی بچی'' بے نظیر کو ہم پر براجمان کرنا تھا۔ یہاں قوم کو مشرف بے نظیر ''ڈیل'' کے الفاظ سے بے وقوف بنایا جا تا رہا ''ڈیل ویل'' کوئی نہیں۔ مشرف کو احکام مل رہے ہوتے تھے اور یہ سکیم ''بریوو'' کامیاب نہ ہوئی تو سکیم ''چارلی'' تیار ہو گی جس کے تحت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ چھپے ہاتھوں کی فوجیں بھی پاکستان پر اسی طرح ''قابض'' ہو سکتی ہیں جس طرح افغانستان پر ''قابض'' ہیں۔ اور اب بے نظیر کی ہلاکت کے بعد سکیم ''بریوو'' بھی ختم ہو گئی ہے اور اب سکیم ''چارلی'' کو آگے لایا

جائے گا۔

36۔ قارئین باتیں بے حساب ہیں۔ یہ عاجز اس سلسلہ میں کتابوں کی کتابیں بھر چکا ہے۔ بے حساب مضامین اور تبلیغی خطوط لکھ چکا ہے۔ یہ بھی ایک تبلیغی خط تھا جو مضمون کی شکل اختیار کر گیا کہ اللہ تعالیٰ نے سعادت فرمائی کہ میری ''کیفیات'' مکمل آہ وزاری میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ کہیں سے اشارہ ہوگیا کہ جو کچھ آج تک لکھ چکے ہو یا کر چکے ہو، اس کے اختصار سے قوم کو پھر آگاہ کر کے اب وقت ان ''آہ وزاری'' والی ''منزلوں'' میں گزارو۔ جس کی کچھ تفصیل آگے آرہی ہے۔ قارئین! پاکستان بنانے کا یہ مقصد تو نہ تھا کہ ہم اس طرح سے ذلت اور بے حیائی والی زندگی سے دوچار رہیں گے۔ ہمیں تو سورۃ الحجرات کے مطابق مومن بن کر اور سورۃ المائدہ اور سورۃ المجادلہ کے مطابق ''حزب اللہ'' (اللہ تعالیٰ کی فوج) بن کر اور جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنا کر اس خطہ پاکستان میں ایسے جلال اور جمال کا مظاہرہ کرنا تھا کہ ہماری طاقت اور شان کو دیکھ کر بھارت کی ذات پات کے تحت پسی ہوئی قومیں یعنی نیچی قومیں خود بخود مسلمان ہو جائیں۔ بھارت جس پر چند برہمن اور کھتری حکمرانوں نے افسانوی عقائد کے ذریعہ غلبہ حاصل کیا ہوا ہے۔ ان کا غلبہ ختم ہو جاتا اور بھارت کفر سے پاک ہو جاتا اور براعظم ایشیا میں تاریخ کا دھارا تبدیل ہو چکا ہوتا۔ اینگلو امریکن بلاک والے ایشیا کو سلام کر چکے ہوتے اور اپنے گھروں میں ''محدود'' ہو چکے ہوتے اور اسلام کی ''نشاۃ ثانیہ'' عروج کی منزلیں طے کر رہی ہوتی۔ رحمۃ اللہ علیہ

37۔ پاکستان بنانے کا یہ مطلب بھی ہرگز نہ تھا۔ کہ نظریہ پاکستان کی ایک ''اصطلاح'' گھڑ کر یہاں نوائے وقت اخبار اور مجید نظامی کی مرضی کا ''ڈاڑھی مچھ منا'' اسلام نافذ کریں گے جہاں اللہ تعالیٰ سبحانہ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاکستان کو علامہ اقبال اور قائداعظم کا پاکستان بنا دیں۔ اسلام کو خطوں میں محدود کر کے ہم بھی ترکوں، افغانیوں، ایرانیوں اور عربوں کی نقل میں ''پاکستانی'' بن جائیں۔ توبہ میرے اللہ۔ پاکستان نظریہ اسلام کی پیداوار ہے۔ ہم اول

بھی اور آخر بھی مسلمان اور مومن ہیں۔ ہم نہ شیعہ ہیں، نہ سنی، نہ دیوبندی، نہ بریلوی، نہ مقلد، نہ غیر مقلد، نہ اہل حدیث۔ آگے نظریاتی پس منظر کے تحت واضح کروں گا کہ اسلام میں نہ فقہی گروہ بندی ہے نہ سیاسی گروہ بندی کہ لفظ ''سیاست'' ہی غیر اسلامی اصطلاح ہے جس کا ذکر نہ قرآن پاک میں ہے نہ احادیث مبارکہ میں۔ نہ ہم جغرافیائی نیشنلزم یعنی خطوں کی قومیت کے قائل یا پیروکار ہیں کہ بین الاقوامی ضرورت کے تحت موجودہ مسلمان ملکوں کو ایک انتظامی وحدت ضرور تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ہم صرف ''مصطفوی ﷺ'' ہیں اور ہمارے رہبر ورہنما ہر زمانے کے لئے ''مصطفیٰ ﷺ'' ہیں۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

38۔ علامہ اقبال کا یہ ایک شعر جس کی وضاحت کئی صفحات میں ختم نہیں ہوتی۔ شیعہ وسنی کے ''امامت'' پر بھی تمام اختلاف ختم کر دیتا ہے کہ ہمارے امام حضور پاک ﷺ ہیں جو ''حاضر امام'' بھی ہیں اور ''غائب امام'' بھی ہیں۔ اسلامی فلسفہ حیات کا نچوڑ یہ ہے کہ اس دنیا کی وقعت رب سبحانہ کے سامنے ایک مچھر کے پر کے برابر نہیں۔ افسوس کہ یہ مرض بڑا پرانا ہے کہ ہم اپنی کم علمیوں کی وجہ سے اپنے ''رہنماؤں'' یا ''اماموں'' کو اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور رسول پاک ﷺ کی نبوت میں ''شرکت'' دے بیٹھتے ہیں۔ حق و باطل میں فرق نہیں کر پاتے اور مجید نظامی کی طرح بقول حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اسلام کو پاش پاش کر رہے ہیں۔ قارئین تب ہی اس عاجز نے یہ تبلیغ شروع کی ہوئی ہے کہ مجید نظامی، کم علمی یا کسی سازش کے ''مہرہ'' کے طور پر غلام کذاب اور سر سید سے بڑھ کر اسلام کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ اب آخری دفعہ اس کو ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ وہ ان مادر پدر آزاد باطل جمہوری نظاموں سے توبہ کر کے اسلام کا فرزند بن جائے۔ اس طرح علامہ اقبال اور قائداعظم کو اللہ تعالیٰ کے احکام اور حضور پاک ﷺ کی سنت میں ''شرکت'' دینا بند کر کے پاکستان کو اللہ تعالیٰ سبحانہ

اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ملک قرار دے۔

39۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کے چناؤ کے لئے ایک مجلس مشاورت تشکیل فرمائی۔ جس میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے حق میں تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر مجھے ''ثالث'' تسلیم کرتے ہو تو میں بھی خلافت سے دستبردار ہوتا ہوں۔ یہ کچھ تسلیم کرلیا گیا تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خلیفہ اس کو بنایا جائے گا جو اللہ تعالیٰ کے احکام، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے علاوہ، حکومت پہلے دو خلفاء کی روایات اور اعمال کے مطابق چلائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے احکام اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک محدود کر دیا اور پہلے خلفاء کے اعمال کو اپنے وعدہ کا حصہ بنانے سے انکار کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب شرائط قبول کرلیں اور وہ خلیفہ بن گئے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون صاحب صحیح تھے؟ ہمارے لحاظ سے دونوں صاحبان صحیح تھے۔ ہم تو ان عظیم صحابہ رضی اللہ عنہ کے پاؤں کی خاک کے بھی برابر نہیں۔ بھلا ہم کیسے کسی کے عمل پر انگلی اٹھائیں۔ پہلے دونوں خلفاء راشدین کے سب اعمال بھی صحیح تھے۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب کچھ منظور کرلیا۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رویہ کو کافی ناسمجھ لوگ اس زمانے میں بھی نہیں سمجھتے۔ کسی نے کہہ دیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پہلے خلفاء سے اختلاف تھا اور ان کے اعمال کے ساتھ بھی، توبہ میرے اللہ۔ اگر اختلاف ہوتا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بنائی گئی مجلس شوریٰ میں شرکت نہ کرتے یا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام گئے تو ان کی ''نیابت'' کو قبول نہ کرتے یا جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو ان کی خلافت کو ماننے سے انکار کر دیتے اور اپنی خلافت کا اعلان کر دیتے۔ بات ہی کچھ اور ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ حق کے علمبردار ہیں۔ اگر ان کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں حق کی پیروی نظر نہ آتی تو وہ ان کے خلاف اسی وقت تلوار اٹھا لیتے۔ آپ کو ہرگز خلافت کی کوئی چاہت نہ تھی، اگر ہوتی تو جناب

عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی شرائط کو مان کر خلیفہ بن جاتے لیکن یہاں تو اصول کی بات تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کائنات کے مولیٰ ہیں جس کے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہنشاہ ہیں۔ علم کے شہر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضرت علی رضی اللہ عنہ دروازہ ہیں۔ آپ جانتے تھے کہ معصوم صرف حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے پہلے دو خلفاء راشدین ''معصوم'' نہ تھے۔ تو ان کی روایات اور اعمال کو احکام الٰہی اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والی ''برابری'' نہ دی جائے۔ اس طرح یہ ''برابری'' دن بدن بڑھتی رہے گی۔ قارئین! اس سلسلہ میں مضمون کے تیسرے حصہ ''نظریاتی'' پس منظر میں اور بہت کچھ پڑھیں گے۔

40۔ اب مجید نظامی، علامہ اقبال اور قائداعظم کی ''رہنمائی'' کو اتنا اوج دے رہا ہے کہ پاکستان کو اللہ تعالیٰ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا پاکستان کہنے کو تیار نہیں۔ یہاں کافرانہ اور باطل جمہوری نظام کو اپنا ایمان بنا کر اس کے نفاذ پر اس لئے زور دیتا ہے کہ اول اپنے بھائی حمید نظامی کو بھی ہمارا ''رہنما'' بنانا چاہتا ہے اور پھر خود بھی ہمارا ''رہنما'' بننا چاہتا ہے۔ سورۃ البقرہ اور سورۃ الانعام کے مطابق مسلمانوں کی شہادت اور موت اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتی ہے۔ مجید نظامی اپنے بھائی حمید نظامی کی موت کو ''شہید جمہوریت'' قرار دے کر اول اپنے بھائی کی موت کو ''حرام'' کی موت بنا رہا ہے اور دوم باطل نظریہ جمہوریت کو اللہ تعالیٰ کا ''شریک'' بنا رہا ہے۔ علاوہ ازیں صحافت کو پیغمبری پیشہ قرار دے کر سب صحافیوں کو ''پیغمبر'' بنا رہا ہے، توبہ میرے اللہ۔ جنگ کے خلیل الرحمٰن نے تو صحافت کو دکانداری قرار دیا تھا کہ حلال و حرام دونوں کی تجارت کرتے ہیں۔ زیادہ تر صحافی یا ادیب یا دانشوری کا لبادہ اوڑھنے والے گمراہی پھیلا رہے ہیں، تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق ایسے سب جاہلیت کے زمانے کے عرب شاعر امرالقیس کی سربراہی یا ''امامت'' میں اکٹھے دوزخ میں جائیں گے۔ سورہ بنی اسرائیل کی آیت مبارکہ 71 کے مطابق روز قیامت ہر آدمی اپنے امام کی معیت میں ہوگا۔ اس لئے یہ عاجز پیراگراف نمبر 37 میں ہر زمانے میں رہبر و رہنما ''مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کا نعرہ لگا چکا ہے۔

میری تمام تر تحریریں اور اعمال ایک اللہ، ایک رسول، ایک قرآن اور ایک امت کے محور کے گرد گھومتی ہیں۔ اول بھی مسلمان اور مومن، آخر بھی مسلمان اور مومن، نہ شیعہ، نہ سنی، نہ سیاسی گروہ بندی، نہ سیاست وغیرہ۔

41۔ تو پاکستان بنانے کا مقصد یہ تھا کہ ہم اول اور آخر مسلمان بن کر اور جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنا کر قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح ایک ہاتھ میں قرآن پاک لے کر اور دوسرے میں تلوار لے کر کشمیر کے جہاد کو جو خود بخود شروع ہو گیا تھا، وہ اوج دیتے کہ بھارتی فوجی مشینری کشمیر میں اس طرح پاش پاش ہوتی کہ بھارتی حیدر آباد کی طرف میلی آنکھ سے بھی نہ دیکھ سکتے۔ بھارت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کفر سے بھی پاک ہو جاتا اور امت واحدہ کے تصور کو وہ پھیلاؤ ملتا کہ سارا عالم اسلام ایک جھنڈے تلے آ کر ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر بن جاتا۔ آگے چل کر دوسرے حصہ کے "تاریخی" پس منظر میں یہ عاجز بھارتی واسطوں سے ثابت کرے گا کہ 48-1947ء میں کشمیر کی جنگ میں پانچ ایسے سنہری مواقع آئے کہ ہم بھارتی فوج کو کشمیر میں تباہ و برباد کر سکتے تھے کہ وہ لوگ Exterior lines پر لڑ رہے تھے اور ہم Interior lines پر تھے۔ ستمبر 65 میں تو ہمیں دہلی تک کوئی روکنے والا نہ تھا اگر وہ پلٹنیں جو ستمبر، اکتوبر 65 میں کھڑی کیں وہ اگست 65 میں کھڑی کر دیتے۔ اور دسمبر 71 میں بھی عزت بچا سکتے تھے اور کشمیر میں بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن کیا ان "فتوحات" کے سہرے ہمارے ان حکمرانوں کو بندھتے جو "چھپے ہاتھوں" کی پیداوار ہیں اور پیراگراف نمبر 3 میں شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشگوئی لکھ چکا ہوں کہ ہمارے اکثر رہنما دل سے دشمنوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ تو اب یہ عاجز "چھپے ہاتھوں" کی اصطلاح کی زیادہ وضاحت کرے گا اور آگے بہت مختصر طور پر دوسرے حصہ میں "تاریخی" پس منظر پیش کرے گا۔ جس سے میری کتابیں بھری پڑی ہیں کہ ان کافرانہ نظاموں کی پیروکاری ہماری ذلت کا سبب ہے۔

42۔ سورۃ الاعراف آیت مبارکہ 27 میں فرمان الٰہی ہے۔ "کہ شیطان اور اس کے ساتھی تمہیں

وہاں سے دیکھتے ہیں کہ تم ان کو نہیں دیکھ سکتے اور اسی سورۃ کی آیت مبارکہ 16 اور 17 کے مطابق شیطان اپنی تجویز کا ذکر بھی کر دیتا ہے کہ وہ سیدھے راستے پر ہماری تاک میں بیٹھے گا اور آگے، پیچھے، دائیں اور بائیں ہر سمت سے حملہ کرے گا۔ اب تمام اسلام دشمن طاقتیں خواہ اینگلوامریکن بلاک ہو یا ان کے پروردہ سودخور یہودی یا روس ہو یا بھارتی ہندو ہوں۔ یہ سب شیطان کے ساتھی ہیں، اسلام کے اور مسلمانوں کے ازلی دشمن ہیں۔ ہم ان کے شر سے تب ہی بچ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں رہیں۔ سورۃ النساء کی آیت مبارکہ 141 کے مطابق اللہ تعالیٰ کافروں کو مومنین پر غلبہ نہ دے گا۔ سورۃ الروم کی آیت مبارکہ 47 کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مومنین کی مدد کا وعدہ فرمایا ہے۔ اب پچھلے تین سو سالوں سے شیطان اور اس کے دوست کافروں نے ہم پر غلبہ حاصل کیا ہوا ہے۔ تو ظاہر ہے ہم مومن نہیں ہیں سورۃ الحجرات کی آیت مبارکہ 14 اور 15 کے مطابق صرف مسلمان ہیں۔ یاد رہے کہ سورۃ الحجر کی آیت مبارکہ 88 اور سورۃ الشعراء کی آیت مبارکہ 215 میں اپنے حبیب محمد مصطفیٰ ﷺ کے لئے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اپنے رحمت کے بازوؤں کو مومنین کے لئے پھیلا دیں یا مومنین کو اپنے بازوؤں کو نیچے لے لیں۔ کیا یہ احکام ان مومنین کے لئے تھے، جو حضور پاک ﷺ کے سامنے تھے؟ یا ان ﷺ کو نظر آ رہے تھے اور کتنے مومن رسول پاک ﷺ کے بازوؤں کے نیچے آتے؟

43۔ قارئین! افسوس ہمارے اکثر مفسرین نے نہ اس مضمون کے صحیح طور پر رابطے باندھے اور نہ ہی اس فلسفہ اور نظریہ کو سمجھنے کی کوشش کی کہ حضور پاک ﷺ کے رحمت کے بازو تو ہر وقت اور ہر زمان و مکاں کے لئے کھلے ہیں۔ حاضر و ناظر ہونا تو بڑی معمولی بات ہے، تمام زمان و مکاں آپ ﷺ کے تابع ہیں لیکن یہ بازو بھی صرف مومنین کے لئے کھلے ہیں۔ لیکن معلوم نہیں ہم مسلمان بھی ہیں یا نہیں؟ پچھلے تین سو سالوں سے جو شیطان اپنے چیلوں کو تربیت دے رہا ہے کہ ''وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا، روح محمد ﷺ اس کے بدن سے نکال دو'' تو

ہمارے اندر جو لوگ اس سازش کی ''کڑیاں'' ہیں یا ''اثرات'' لے رہے ہیں۔ ان میں مودودی اور اسمٰعیل دہلوی سمیت کئی لوگ ہمارے ''رہنما'' بنے ہوئے ہیں۔ میری اس سلسلہ میں چیخ و پکار کے بہت تھوڑے اثرات ہوئے ہیں۔ میں کتابوں کی کتابیں لکھ چکا ہوں کہ اپنے اندر سے ان کم علم اور بے ادب اور گستاخ لوگوں کو تلاش کر کے ان سے ''چھٹکارا'' حاصل کریں۔ ان کی تحریروں کو ''بہتانِ عظیم'' قرار دے کر توبہ و ندامت کر کے اول بھی مسلمان اور مومن بن جائیں اور آخر بھی مومن اور مسلمان بن جائیں۔ حضور پاک ﷺ کے رحمت کے بازوؤں کا سہارا لے کر اللہ تعالیٰ کی ''پناہ'' میں چلے جائیں۔ تو اللہ تعالیٰ ہمیں عزت اور غیرت کی زندگی عطا کر دیں گے اور ہم کافروں پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔

44۔ اس کے علاوہ یہ عاجز کئی مضامین اور کتابیں لکھ چکا ہے کہ لنگڑا، لُولا پاکستان اینگلو امریکن بلاک کی بھی ''ضرورت'' تھی۔ اول کہ بھارت، ''مہا بھارت'' نہ بن جائے، دوم کہ یہاں پاکستان میں بھی رسول پاک ﷺ کے اسلام کی بجائے کمال ترکی برانڈ بے دین نظام نافذ کرنا تھا۔ انیسویں صدی سے وہ لوگ سر سید اور غلام کذاب جیسے لوگوں کی مدد سے اس خطہ میں ابن الوقت بے دین قادیانیوں اور چھپے قادیانیوں کی ایک ''کھیپ'' تیار کر رہے تھے جن کو وہ ہم پر حکومت اور زندگی کے ہر شعبے میں ''مسلط'' کر گئے ہیں۔ یہ ملک نہ ہم نے لہو دے کر ''خریدا'' اور نہ اسلامی طریقہ نظریہ جہاد سے حاصل کیا۔ انگریز کی حکومت جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنانے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ تو باطل جمہوری اور کافرانہ سیاسی نظام کی ضرورت کے تحت انگریزوں کے ''ٹوڈیوں'' کی ایک جماعت بنائی گئی۔ جس کو ''ہندی مسلم قومیت'' کے پرچار کی اجازت تھی۔ بات ساری ''وکالت'' کی تھی تو ناموس رسول ﷺ پر قربان ہو جانے والوں کی وجہ سے رب سبحانہ ہمیں ایک ملک عطا کرنا چاہتے تھے۔ تو ہر زمانے کے ہمارے رہبر و رہنما جناب مصطفیٰ ﷺ نے ایک دیانتدار مسلم وکیل محمد علی کا چناؤ فرمایا جس نے ہمارا قائداعظم بن کر ہمیں ایک ملک لے دیا۔ اب ضرورت یہ تھی کہ یہ ملک حاصل کرنے

کے بعد ہم حضور پاک ﷺ اور خلفائے راشدین کے جانشین بن جاتے اور تمام کافرانہ باطل نظاموں کو سمندر میں ڈبو دیتے، لیکن چھپے ہاتھوں کی ضرورت کے مطابق ہم جارج ششم کے جانشین بن گئے۔

45۔ یہی اس خط اور مضمون کا بڑا مسئلہ ہے اور یہی اس عاجز اور مجید نظامی کے درمیان نزاع ہے۔ مجید نظامی کافرانہ جمہوری نظام کو اپنا ایمان سمجھتا ہے اور جمہوریت کو اللہ تعالیٰ کا شریک کہ اپنے بھائی حمید نظامی کو شہید جمہوریت قرار دیتا ہے۔ صحافت کو کبھی پیغمبری پیشہ قرار دیتا ہے اور کبھی عبادت کا درجہ دے کر اس کو بھی اللہ تعالیٰ کا شریک بنا دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ چونکہ ہم نے یہ ملک کافرانہ سیاسی جمہوری نظام کے ذریعہ سے حاصل کیا ہے تو اس ملک میں وہی کافرانہ سیاسی نظام چلنا چاہیے۔ یہ قائداعظم اور علامہ اقبال کا پاکستان ہے اور ان کے بعد حمید نظامی اور مجید نظامی ہمارے رہنما ہیں اور تب ہی ہم دنیا کی ذلیل ترین قوم بنے ہوئے ہیں۔ آزادی کے وقت ستر ہزار نوجوان عورتیں کفار کے پاس چھوڑ آئے، پھر قادیان کے جھوٹے نبی کے مرکز کو وسط پنجاب ربوہ میں لے آئے اور 1971ء میں نوے ہزار فوجیوں سے ہتھیار ڈلوائے۔ قارئین! پیشتر اس کے کہ یہ عاجز اپنی تحریروں کا یہ نچوڑ اور خلاصہ بیان کرے کہ پیرا41 میں جو اول اور آخر مومن اور مسلمان بننے کی جھلکی دی تو اس مضمون کے دوسرے اور تیسرے حصہ میں یہ عاجز کچھ تاریخی پس مناظر یا روحانی ضرورتوں کا اختصار بھی پیش کرے گا کہ قارئین اس پہلو کو آسانی سے سمجھ سکیں کہ تخلیق کائنات کا مقصد ''انسان'' ہے۔ انسان کی تخلیق میں اس نے ''معرفت الٰہی'' کے عمل کو اس طرح پورا کرنا تھا کہ ظاہر کرے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ اور اس کے پیدا کرنے کا مقصد کیا تھا؟ اور اس کی اپنی طرف سے اور رب کی ذات پاک کی طرف سے کیا ذمہ داریاں ہیں؟ ہمارے آقا ﷺ کا فرمان ہے جس نے پہچانا اپنے نفس کو اس نے پہچانا اپنے رب کو۔ اس عاجز نے یہاں اسلامی فلسفہ حیات کو چند سوالوں کی مدد سے واضح کر دیا ہے کہ میری قوم اور خاص

کر دانشور اور ان میں خاص کر مجید نظامی ان الفاظ کو سن کر یا ان وضاحتوں سے اس طرح فرار اختیار کرتے ہیں، جس طرح شیطان حق کو دیکھ کر دولتیاں مارتا اور گدھے کی طرح پھوس نکالتا فرار ہو جاتا ہے۔

## ﴿ دوسرا حصہ ﴾ تاریخی پس منظر

46۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جناب ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح کے چالیس ہزار مجاہدین نے جب بازنطینی عیسائی ایک لاکھ افواج کو جو صلیبی جھنڈے اٹھائے ہوئے تھے یرموک کے مقام پر شکست فاش سے دوچار کیا۔ تو قیصر روم کو ایشیاء کو سلام کہہ کر یورپ تک محدود ہونا پڑا۔ لیکن اسلام اور کفر یا صلیبیوں کے درمیان یہ جنگ یا حق و باطل کے درمیان یہ جنگ جاری ہے۔ قارئین صلیبی جنگوں کی تاریخ پڑھیں کہ کس طرح باطل طاقتیں ہم پر پے در پے حملہ آور ہوتی رہیں اور آخر کس طرح سلطان صلاح الدین ایوبی اور اس کے بعد مملوک بیبرس اور کالون وغیرہ نے ان صلیبیوں کا قلع قمع کیا۔ ہم نے زندگی چین اور آرام سے گزاری کہ سلجوق سلطانوں نے اناطولیہ میں اپنے دفاع کو متحرک کر کے سارے ایشیا سے ان صلیبیوں کو خارج کر دیا، بعد میں جو عثمانی سلطان یورپ میں داخل ہوئے تو یہ بھی اپنے دفاع کو متحرک رکھنے کی تگ و دو تھی کہ ان صلیبیوں کو ان کے گھروں میں محدود کر دیا جائے۔ لیکن یہ فتنہ پسند آرام سے نہ بیٹھتے تھے، خشکی اور بری علاقوں میں یہ لوگ بار بار شکست سے دوچار ہوئے۔ تو یہ لوگ سمندروں میں داخل ہو گئے، ایک طرف اگر براعظم امریکہ کو دریافت کر لیا تو دوسری طرف افریقہ کا چکر لگاتے راس امید Cape Town کو ایک طرف چھوڑ کر اس برصغیر ہندو پاکستان اور نہ صرف جنوب مشرقی ایشیاء میں پہنچ گئے بلکہ براعظم آسٹریلیا کو بھی دریافت کر لیا۔

47۔ افسوس کہ ہم تاریخ برائے تاریخ پڑھ کر گزارا کرتے ہیں اور تاریخ کی تحقیق کر کے اس کا بامقصد مطالعہ نہیں کرتے۔ کہ سوچیں کہ کس طرح چند انگریز دھوکے، بے وفائی، رشوت اور

ہمیں ایک دوسرے سے لڑا کر یا ہمارے اندر غدار پیدا کر کے اس برصغیر پر قابض ہو گئے۔ اپنے ملک کے معمولی بادشاہ (King) کو قیصر ہند Emperor of India بنا کر سو سال ہم پر سیدھے طور پر حکومت کرتے رہے۔ اب اینگلو امریکن بلاک کے طور پر ایک طرح سے ہمارے ''حکمران'' ہیں اور ہمیں تگڑم ناچ نچا رہے ہیں۔ دیکھیں کس طرح بنگال میں میر جعفر دکن میں میر قاسم اور دہلی میں الٰہی بخش جیسے لوگ پیدا کر کے، ہمارے اندر کے ان غداروں کی مدد سے ہمارے زوال کے باعث بنے۔ دکن میں مرہٹوں کی پیٹھ ٹھونک کر ان کو ہمارے خلاف کھڑا کیا۔ پھر ان کو شہنشاہ ہند بنانے کے لئے دہلی تک لے آئے، ہندو جاٹوں اور راجپوتوں کو بھی ان کے جھنڈے کے نیچے لے آئے۔ ادھر جو سر تھامس رو کے زمانے سے شاہ ولی اللہ کے خاندان کے ساتھ ''تعلقات'' بڑھائے ہوئے تھے۔ تو شاہ ولی اللہ سے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دلا کر 1761 میں مرہٹوں کو پانی پت کے مقام پر تہس نہس کرا دیا اور ان کے شہنشاہ ہند بن جانے کے خواب کو چور چور کر دیا۔

48۔ اس عظیم فتح کے بعد احمد شاہ ابدالی اور اس کے جانشین دہلی کے علاقے میں کیوں نہ ٹھہرے کہ اول ایرانیوں اور افغانیوں کو لڑایا جا رہا تھا اور احمد شاہ ابدالی کو اپنے گھر کی فکر تھی۔ دوم موجودہ پاکستان کے علاقوں میں ''سکھا شاہی'' یعنی جانوروں کی حکومت کی طرح ڈالی جا رہی تھی کہ لوگ ''مار دھاڑ'' پر گزارا کر رہے تھے اور اس زمانے کو مار دھاڑ والا زمانہ کہا جاتا ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والی بات تھی۔ اس سکھا شاہی کو اتنا ''پھیلاؤ'' بھی دیا جا رہا تھا کہ چند سکھ جو ''حکمران'' بنے ہوئے تھے۔ ان کی حکمرانی صرف ان لوگوں پر ہوتی تھی جو ان کے سامنے ہوں اور ان کے مقابلے میں انگریزوں کی حکومت کو ایسا امن پسند حکمران گردانا جاتا تھا کہ شاہ ولی اللہ کے بیٹے شاہ عبدالعزیز سے یہ فتویٰ بھی دلوا دیا کہ ہم انگریزی زبان سیکھ کر انگریزی تعلیم حاصل کریں کہ یہ اس وقت کی ضرورت تھی اور شاہ ولی اللہ کے پوتے اسماعیل دہلوی سے انگریزوں کو خلاف جہاد کو حرام قرار دلوایا۔ اس خود کو مدد دے کر راجپوتانہ سے سندھ وہاں

سے کوئٹہ، بلوچستان، وہاں سے قندھار اور وہاں سے کابل اور وہاں سے پشاور اور وہاں سے آگے مردان، ہزارہ میں سکھوں اور سکھا شاہی کے خلاف ''جہاد'' کیلئے بھیج دیا۔ مقصد افغانوں اور پٹھانوں کو اندرونی خانہ جنگی سے دوچار کرنا تھا کہ سکھ حکومت آگے ''پھیلاؤ'' اختیار کرے۔ اسی طرح کا پھیلاؤ انگریزوں کا ایجنٹ گلاب سنگھ ڈوگرہ اور سکھوں کا اٹک کا گورنر، سکھوں کی حکومت کو پشاور اور جمرود کی طرف دے رہا تھا اور انگریزوں کا ایجنٹ فتح خانہ ٹوانہ ماڑی انڈس اور کالا باغ سے آگے بڑھ کر بنوں کی طرف دے رہا تھا۔ ''سکھا شاہی'' اتنا ''پھیلاؤ'' اختیار کر گئی کہ 1848 میں گجرات کے مقام پر انگریز فوج کے سکھوں کی فوج سے معمولی ٹکراؤ کے بعد، سکھ حکومت موجودہ پاکستان میں دھا گہ ٹوٹنے کے بعد تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئی۔ پورے سو سال کی مار دھاڑ سے پسے ہمارے آبا و اجداد اور ہم نے ''امن پسند'' انگریزوں کو نہ صرف اپنا حکمران بنالیا، بلکہ ہم ان کے ''چوکیدار'' بن گئے کہ ہماری چوکیداری سے وہ لوگ عدن سے سنگاپور اور آگے ہانگ کانگ تک کے حکمران بن گئے۔ اس عاجز نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان کی سلطنت پر سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ بظاہر اب ان خطوں سے وہ لوگ چلے گئے ہیں لیکن اگر دبیز پردوں کے پیچھے دیکھا جائے تو ان کی ''ساحری اور عیاری'' کے متعفن انبار ہمارے اندر ''موجود'' ہیں۔ لیکن اس تفصیل میں جانے سے پہلے انگریز کی ملت اسلامیہ کے خلاف سب سے بڑی مکارانہ اور عیارانہ عملی سازش کو اختصار سے بیان کرنا ضروری ہے۔

49۔ انگریز از خود تو مسلمانوں کی عظیم طاقت سلطنت عثمانیہ کے دوبدو مقابلہ سے بچار ہا۔ لیکن آگے روحانی اور عقائدی پس منظر کے بیانات کے تحت پیرا نمبر 164 میں ذکر آرہا ہے کہ اسلام کی دشمن طاقتوں پر کب سے وارد ہو گیا تھا کہ وہ لوگ سیدھے طور پر اور دوبدو طور پر مسلمان مجاہدین کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور مسلمانوں کا زوال لانے کے لئے وہ کئی بھیس بنا کر مسلمانوں کے اندر گھس جائیں اور وہاں اپنے ایجنٹ تیار کر کے مسلم امت کو اندرونی خلفشار اور

افراتفری سے دوچار کریں۔ بہر حال ان بیرونی اور اندرونی سازشوں اور اعمال پر کئی تاریخ کی بامقصد کتابیں لکھنے کی ضرورت ہے۔ اول ایران میں سلطنت عثمانیہ کے مخالف یا ''رقیب'' اسلامی سلطنت کے طور پر اہل تشیع کی پیٹھ ٹھونکی اور ان کو ایک دوسرے کے ساتھ الجھا دیا۔ پھر سلطنت عثمانیہ کو روس کے ساتھ لڑا دیا اور انیسویں صدی کے شروع میں خود فرانس اور برطانیہ والوں نے عثمانیہ سلطنت کے ''اتحادی'' بن کر بحیرہ اسود میں ترکوں کو نقصان پہنچایا۔ پھر بلقان میں خانہ جنگی شروع کرا کے ترکوں کو یورپ سے نکالنے کی تجویز بنائی اور آخر پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ والوں کو ان کے اندرونی خلفشار سے ایسا پاش پاش کیا کہ پانچ سو سال اسلام کی شوکت کے جھنڈے اٹھانے والی سلطنت کا نام ہی دنیا سے مٹ گیا۔ مسلمانوں کی خلافت یا برائے نام وحدت بھی پاش پاش ہو گئی۔ ان اعمال کے لئے اندرونی اور بیرونی ''میدانوں'' یا ''محاذوں'' کے تانے بانے جوڑنے کے لئے ایک پوری کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم اختصار سے صرف ایک جھلکی دیں گے۔

50۔ ترکی کے سالونیکا کے علاقہ میں یہودیوں کا باطنی اور سازشی شیطانی فرقہ آباد ہے۔ جنہوں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر فری مسین کی تحریک کی بنیاد بھی ڈالی تھی۔ 1666ء میں ایک ایسے فری مسین سے پہلے انگریزوں نے مسیحا بننے کا دعویٰ کرایا اور بعد میں وہ توبہ کا ڈرامہ کر کے مسلمان بن گیا اور عزیز محمد آفندی کہلاتا تھا۔ اس کی اولاد اور گروپ آج بھی مسلمان کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں۔ جن میں سے کبھی کبھی کسی کی سازش سے اس کو پہچان لیا جاتا ہے۔ جیسے آج سے چند سال پہلے ترکی کے بے دین وزیر اعظم بلند اجویت کی بیوی اور اس کے وزیر خارجہ کی سازش سامنے آئی یا 56-1955ء میں عظیم ترک وزیر اعظم عدنان مندریس کو جنرل گرسل اور فوجیوں سے پھانسی چڑھوانے والے رحمانی پلان یعقوبی کو بھی ''پہچان'' لیا گیا تھا۔ لیکن انگریزوں نے جو کچھ اس خاندان کے کمال ترکی جس نے مصطفیٰ کمال بن کر جو کچھ ترکوں اور اسلامی امت کے ساتھ کیا۔ وہ اتنا بڑا المیہ ہے کہ پندرھویں صدی کا ''سقوط بغداد''

یا بیسویں صدی کا ''سقوط ڈھاکہ'' اس المیہ کی ایک ''جیب'' میں آ سکتے ہیں۔ نوے سالوں سے اس المیہ نے جیسے غیرتمند ترکوں کی عورتوں کو نہ صرف سر سے ''ننگا'' کیا ہوا ہے، بلکہ ''مجھونگا'' بھی کیا ہوا ہے۔ میں حیران ہوں کہ کسی ترک کی غیرت کی رگ کیوں نہیں پھڑک سکتی، یہ عاجز اس سلسلہ میں اخبار نوائے وقت میں تفصیلی مضامین بھی لکھ چکا ہے اور یہ چھا اب میری ایک کتاب کا حصہ ہے۔ لیکن سب سے بڑی حیرانگی یہ ہے کہ اس حادثہ کے کھل کر سامنے آ جانے کے باوجود پورے تیس سال تک اس برصغیر میں ہم اس مردود کمال کو جس نے یہ سب کچھ ہمارے ساتھ کیا۔ اسلام کا ایک عظیم فرزند سمجھتے رہے اور غازی انور پاشا کے ''جانشین'' کے طور ہم اس کو غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے طور پر اپنا ہیرو سمجھتے رہے۔ اب بھی پوری سازش کو نہیں سمجھ رہے اور اس مردود کو ''ہیرو'' بنانے کے لئے گیلی پولی میں جو لڑائی کا ''ڈرامہ'' رچایا گیا۔ سلطنت عثمانیہ کی اسلام کی شوکت کی سینکڑوں فتوحات کو اس ڈرامہ کے ''ہیچ'' کر دیا۔

51۔ جنگ عظیم اول کے سلطنت عثمانیہ کے ''تین بڑے'' غازی انور پاشا، جمیل پاشا اور رؤف بیگ'' تھے۔ پہلے دونوں روسی ترکستان کے جاری جہاد میں شہید ہو گئے۔ رؤف بیگ فرانس میں جلاوطن ہو گیا تھا۔ وہ اپنی یادوں میں لکھتا ہے کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ شریف حسین گورنر مکہ مکرمہ انگریزوں کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ لیکن اس نے روضہ رسول پاک ﷺ پر آ کر قسم اٹھا لی کہ وہ سلطنت عثمانیہ کا وفادار ہے۔ تو غازی انور پاشا نے اس کو معاف کر دیا کہ حضرت محمد ﷺ کے اسم مبارک پر سے لاکھوں عثمانیہ سلطنتیں قربان کی جا سکتی تھیں۔ اب شریف حسین کی قسم کے بعد اس کے خلاف کارروائی نہ ہوئی۔ لیکن رؤف بیگ مزید لکھتا ہے کہ اصل وجہ کچھ اور بھی تھی، ہمیں معلوم تھا کہ ہمارے اپنے اندر بے شمار غدار اور چھپے ہاتھ انگریزوں کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کمال ترکی تو بالکل آ کر ظاہر ہو گیا کہ ہمیں پہلے بھی شک تھا۔ ہم نے اس کو کسی محاذ پر آگے کمانڈ دینے کی بجائے پچھلے علاقوں

میں گیلی پولی کے علاقہ کی کمانڈ دی لیکن دشمن نے وہاں حملہ کا ''ڈرامہ'' کر کے اس کے سامنے سے فرار اختیار کر لیا اور ترکوں کا ہیرو بنا دیا، اور اس کو وسطی اناطولیہ میں کمانڈ کے لئے ''موزوں'' بنا دیا گیا۔ جہاں پر سمرنا کے علاقہ میں یونانیوں کے حملے کے ڈرامے کی ''سازش'' کی گئی کہ افواج جو فلسطین کے دفاع کے لئے جمیل پاشا کی مدد کے لئے جا رہی تھیں، ان کو وسطی اناطولیہ میں روک لیا گیا اور سلطنت عثمانیہ کو شکست سے دو چار کرا کے اسی غدار کمال ترکی کو ہمارا ''ہیرو'' بنا کر ہمارا حکمران بنا دیا گیا اور وہ ترکوں کا باپ (اتاترک) بنا بیٹھا ہے۔ رؤف بیگ کی یادوں سے یہ اختصار بھی اس عاجز تک دوسری کتابوں کے حوالے سے پہنچا، لیکن اس عاجز نے متعدد کتابوں سے استفادہ کر کے اپنی تحقیق مکمل کر لی ہے اور کچھ خاص باتوں کو اپنی تصانیف میں شامل کر دیا ہے۔ خاص کر 1954ء میں ترکی فوج کے ایک کیپٹن ارنگش نے میرے لئے تمام سازش کا پنڈورا باکس کھول دیا یہاں پر صرف چند المناک نتائج اور اپنی بے بسی پر چند آنسو بہا رہا ہوں کہ امت اسلامیہ کس طرح مومن کی فراست سے عاری ہے۔ آج بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کی بجائے ترکی میں اس مردود کے بت کی ''پوجا'' ہو رہی ہے۔

52۔ قارئین! اس مردود نے 18-1917ء میں نہ صرف جمیل پاشا کی افواج کو انگریزوں اور سلطنت عثمانیہ سے غداری کرنے والے عربوں کی ملی جلی افواج سے ہزیمت دلوائی بلکہ غازی انور پاشا کے ماموں جنرل خلیل پاشا کی عراق کی فتوحات پر بھی پانی پھروا دیا کہ اس کا رابطہ اناطولیہ سے کٹ گیا اور خلیل پاشا کی افواج بھی تتر بتر ہو گئیں اور اس خود کو روسی ترکستان میں پناہ لینا پڑی۔ لیکن یہ مردود، غیروں کے پروپیگنڈا کی وجہ سے بچی کھچی سلطنت عثمانیہ کو ''بچانے'' والا بنا ہوا تھا۔ پہلے ''بادشاہ گر'' بنا، پھر خود ''بادشاہ'' اور اس کے بعد 1924ء میں خلیفہ المسلمین کو معزول کر کے ترکی سے اسلام کو دیس نکالا دلوا دیا۔ اذانین بند کرا دیں عربی الفاظ کی بجائے رومن الفاظ کو ذریعہ تعلیم بنوایا۔ مسجد صوفیاء کو میوزم میں تبدیل کر دیا اور ماڈرن

کے چکر میں عورتوں کو سر سے ننگا کرنے کے بعد ''مجھونگا'' بھی کر دیا اور کیا کچھ نہ کیا۔ بھلا عورتوں کی ٹانگیں ننگی کرنے کے بعد ترکوں نے کیا ترقی کی؟ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ اہل مغرب کے پروپیگنڈا کو ہمارے اس برصغیر ہندو پاکستان کا ایک دانشور بھی نہ سمجھ سکا۔ ہم لوگ پاکستان بننے تک اس مردود کو ماڈرن ترکی کا بانی اور غازی انور پاشا کا صحیح جانشین سمجھتے رہے اور اس کو اسلام کا ہیرو سمجھ کر ''غازی مصطفیٰ کمال'' کہتے تھے۔ حالانکہ علامہ اقبال نے مغرب کے پروپیگنڈا سے کوئی اثر نہ لیا تھا اور وہ لوگ جو ایران میں رضا شاہ پہلوی اور ترکی میں مصطفیٰ کمال کو ماڈرن اسلام یا اسلامی ممالک کے ریفارمر بنا رہے تھے تو علامہ اقبال نے صاف کہہ دیا تھا۔ ؎

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

53۔ یہاں بیسویں صدی کے اس برصغیر کے کچھ مسلمان ''دانشوروں'' کا ذکر بھی کر دیا جائے کہ وہ مسلم امت کی کوئی خدمت نہ کر سکے۔ سوائے علی برادران کے اور ان میں بھی محمد علی جوہر کچھ مومن کی فراست کے حامل تھے۔ بڑے شوکت علی تو ''گزارا'' تھے۔ لیکن سیاسی صورت حال بہت گھمبیر تھی، افراتفری تھی اور ہندو ذہنیت بھی کھل کر عام مسلمان کے سامنے نہ آ رہی تھی۔ لیکن ہمارے یہ دانشور بھی کم علم تھے یا مومن کی فراست کے حامل نہ تھے تو فکری طور پر آج تک قائداعظم اور علامہ اقبال کو چھوڑ کر کوئی بڑا رہنما سامنے نہیں آیا، جو ہمیں ایک قوم یا ملت بنا دے۔ اب پہلے ایک ایسے دانشور کا ذکر کریں گے جس کے علم اور تحریروں سے اثرات لے کر ہم نے اس کو ''امام الہند'' کا خطاب دیا۔ لیکن وہ اتنا کم علم ثابت ہوا کہ اپنا تخلص ''آزاد'' رکھ کر شیطان کی طرح مادر پدر آزاد ہو گیا۔ اسے یاد نہ رہا کہ مسلمان آزاد نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محکوم ہے، لیکن اس ''جاہل'' میں عالمانہ تکبر اتنا گھر کر گیا کہ کلام کا بھی باپ (ابوالکلام) بن بیٹھا اور یہ نہ سوچا کہ قرآن پاک اور سنت نبوی ﷺ بھی کلام کے زمرہ میں

آتے ہیں۔ نتائج قوم کے سامنے ہیں کہ اب ہم اسے ''گانگرسی مولوی'' کہتے ہیں کہ بقول قائداعظم وہ ہندو کا بچہ جمہورا (Show Boy) اور انگریزوں کے ٹوڈی خضر حیات ٹوانہ کے ساتھ مل کر اس نے پنجاب کے مسلمانوں کا بہت نقصان کیا۔ ایک اور ''آزاد'' تخلص کرنے والے مولوی محمد حسین نے ادیبوں کا لبادہ اوڑھ کر ایک کتاب ''خدائی فوجدار'' لکھ کر پاکیزہ اسلامی الفاظ ''حزب اللہ'' کو مذاق بنا دیا۔ پھر ٹانڈا شہر کے محلہ مدن پور کے رہائشی حسین احمد نے مدن پور سے مدنی بن کر ہمیں گمراہ کرنے کی حدیں پھلانگ دیں، اعلان کیا کہ قومیں ''اوطان'' سے بنتی ہیں (توبہ میرے اللہ)۔ حضور پاک ﷺ کی خواب میں مومنین کے لئے بشارتوں کو سیاست کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت دی کہ دیوبند کی ''سلطنت'' کے ٹکڑے ہو رہے تھے اور بڑے ٹکڑے پاکستان کا حصہ بن رہے تھے تو اس نے ہندوؤں کے چرنوں میں بیٹھ کر اسلام کو معاشرہ سے دیس نکالا دے دیا۔

54۔ مولوی گھرانے کے ایک اور ''مولانا'' مرتضٰی احمد نے اپنا تخلص ''مے کش'' رکھ کر شراب کو ''حلال'' کر دیا۔ تو چھپے ہاتھوں نے انگریزوں کے ایجنٹ اسمٰعیل دہلوی کے سکھوں کے خلاف محدود جہاد کرنے والے کو اس کے ہاتھوں سے ''شہید بالاکوٹ'' بنوا دیا۔ کہ انگریز ممبئی کی بجائے اس آدمی کو کلکتہ والے راستے سے ایک لگژری جہاز میں حج کرا چکے تھے۔ حجاز میں ابن عبدالوہاب کے جانشینوں سے ملاقات کرا کے، اس برصغیر میں مسلمانوں کو فرقوں میں بانٹنے اور بزرگوں کی بے ادبی کا کام اس اسمٰعیل دہلوی سے کرا رہے تھے۔ کس کا ذکر کیا جائے اور کس کا ذکر نہ کیا جائے کہ مولوی گھرانے کے ایک اور ''مولانا'' چراغ حسن حسرت نے دوسری جنگ عظیم میں انگریزی ہندی فوج کے فوجی اخبار کی ادارت سنبھال لی اور آزادی کے بعد ''سرخوں'' کے اخبار کا ایڈیٹر بن گیا۔ ایک اور اسلامی گھرانے کا احمد ندیم قاسمی، بے دین ترقی پسند لکھاریوں کا کرتا دھرتا بن گیا۔ بجنور یوپی کے اخبار مدینہ کے مولانا نصر اللہ خان عزیز جیسے بے دین لوگوں سے اگر بچ گئے تو ایک دہریہ اور نیچریہ عقائد کے نیاز فتح پوری کے شاگرد

خاص مودودی کے ''چنگل'' میں پھنس گئے۔ جس کو 1953ء کی ایسی قادیانی تحریک کے بعد چھپے قادیانی جسٹس منیر کے ذریعہ سے ''مفکر اسلام'' کالبادہ اوڑھایا گیا۔ جس کی گستاخیوں، بے ادبیوں اور کم علمیوں کا ذکر پیراگراف نمبر 167 وغیرہ میں آرہا ہے۔

55۔ تو عالم اسلام سارے یا خاص کر دانشوروں، کے اذہان، بصارت اور بصیرت پر کمال ترکی کی سازش کے بارے جو پردے پڑے ہوئے ہیں تو اس میں قصور ہمارا اپنا ہے کہ قحط الرجال ہے یا ہر آدمی کی ''قیمت'' ہے کہ وہ غیروں کی ''گیم'' کھیلنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن کمال ترکی والی سازش کی ''وسعت'' کا بھی کوئی حساب نہیں کہ وہ مردود ایک بڑے گروہ کے ساتھ ''ینگ ترکوں'' کی ایک تنظیم میں ایک ''ریفارمر'' کے طور پر ''داخل'' ہوا۔ جہاں عصمت انونو سھیت اس کے ساتھ ایک بہت بڑا گروہ تھا، جس کو وہ ترکوں پر حکمران کے طور پر ''براجمان'' کر گیا۔ لیکن ان حکمرانوں کی اصلی طاقت ترکی کی افواج میں ہے، جو ترکی میں کمال کی جاری کردہ ''لادینیت'' کے رکھوالے ہیں۔ کئی ''اسلام پسندہ'' سیاسی پارٹیاں بھی آج تک یہ کچھ کر سکیں کہ غازی انور پاشا کے جسد کو روسی ترکستان سے منگوا کر ترکی میں دفن کیا یا موجودہ صدر کی بیوی نے اپنی ٹانگیں اور سر ''ڈھانپ'' لیا ہے۔ لیکن ترک افواج کی وہ ناپسندیدہ شخصیت ہے کہ وہ اپنی کسی پریڈ یا Function میں اس کو مدعو نہیں کرتے۔ پچھلے اسی (80) سالوں میں کسی زمانے کے اسلام کے فرزندوں اور مجاہدوں کی اولادوں میں آج تک عدنان مندریس کو چھوڑ کر ایک آدمی پیدا نہیں ہوا جو اس مردود کے ''بت'' کو پاش پاش کرتا یا اس کے بت کی پوجا بند کراتا۔ فوج کے لادین سربراہ جنرل گرسل کو جب عدنان مندریس جو ترکی کا وزیراعظم بن چکا تھا کے ''ارادوں'' کی کچھ خبر مل گئی تو اس مردود نے اسلام کے عظیم فرزند عدنان مندریس کو 1950ء اور 1960ء کے درمیانی عرصہ میں پھانسی چڑھا دیا۔ البتہ عدنان مندریسی کی قبر پر زیارت کرنے والوں کا اب بھی تانتا بندھا رہتا ہے جہاں سے خوشبو نکل کر دور دور تک ماحول کو معطر کرتی رہتی ہے۔ لیکن ہائے ہماری بے بسی کہ مردود کمال ترکی کے

بت کی پوجا آج بھی جاری ہے کہ وہ ترکوں کا باپ (اتاترک) ہے۔

56۔ لیکن اور زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ قائداعظم کی زندگی میں ہم نے اس کو ہر طرح سے ''مایوس'' کیا کہ اتنے بے حیا اور بے غیرت ثابت ہوئے کہ آزادی کے وقت ستر ہزار نوجوان عورتیں کفار کے پاس چھوڑ آئے اور کشمیر کو بھی نہ آزاد کرا سکے۔ جب 11 ستمبر 1948ء کو وہ کوئٹہ سے کراچی پہنچا کہ کوئی اہم ''اعلان'' کرنا تھا تو ہوائی اڈہ پر ایک سرکاری افسر موجود نہ تھا سوائے ایک ٹوٹی پھوٹی ایمبولینس کے، جس کا پٹرول راستے میں ختم ہو گیا۔ قائد کی وفات ایک ''اچنبھا'' ہے جس پر اب تک پردے پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن مردہ قائداعظم کو ہم بھی ترکوں کی نقل میں قوم کا باپ بنا رہے ہیں اور مس فاطمہ جناح کو مادر ملت۔ یہ نہیں سوچتے کہ ہمارے روحانی باپ حضور پاک ﷺ ہیں اور ان کی ازواج مطہرات سورۃ الاحزاب کے مطابق ملت کی امہات ہیں۔ یہ عاجز قائداعظم کا ہم عصر رہا اور ان کو بہت نزدیک سے دیکھا اور دو دفعہ بالمشافہ ملاقات کر کے ان کی زیارت بھی کی اور میرے لحاظ سے پاکستان کی تخلیق قائداعظم کی یکسوئی، فراست اور کاوش کا نتیجہ ہے۔ لیکن جس طرح پیراگراف نمبر 39 میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہو چکا ہے کہ حکومت چلانے کے لئے وہ صرف اپنے آپ کو احکام الٰہی اور سنت نبوی ﷺ کا پابند کرنے تک محدود رہے۔ پہلے خلفاء راشدین کی روایات کو بھی ذمہ داریوں کا حصہ نہ بنانا چاہتے تھے۔ تو ہمیں بھی صرف قائداعظم کی مغفرت کی دعا تک اپنے آپ کو محدود کرنا چاہیے۔ یہ عاجز اس نتیجہ پر 1968ء میں قائداعظم کے مزار پر ہی ایک ''واردات یا اشارہ'' کے ذریعہ پہنچا، جو بہت لمبی اور وسیع تحقیق کی ایک کہانی ہے۔ تو ہم اب پاکستان کی تخلیق کے چند عوامل کو زیر بحث لاتے ہیں اور افسوس کہ قوم نے اس سلسلہ میں ذرا بھر تحقیق نہیں کی۔

57۔ یہ عاجز دو سال تک پاکستان کی کہانی پر ایک اخبار میں مضامین لکھتا رہا ہے کہ پاکستان کی تخلیق اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا راز ہے اور یہ تخلیق فطرت کی ایک خاص ''ضرورت'' بھی تھی۔ اب

ان مضامین کو اکٹھا کر کے ایک کتاب بھی شائع کر دی گئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکار یہودی کئی سو سال سے اپنے لئے ایک وطن حاصل کرنے کی اتنی محنت اور سخت تگ و دو کر رہے تھے کہ اتنی محنت کا کچھ پھل ضرور ملتا ہے۔ فلسطین میں یہودی مملکت بننے والی تھی تو رب سبحانہ نے اپنے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو بھی ایک ملک عطا کرنے کا فیصلہ صادر فرما دیا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہمارے اندر سے جو روح محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نکالنے کی سازش جاری ہوئی تو امام احمد رضا بریلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اس سازش کو رد کرنے کے لئے ''مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جان رحمت پر لاکھوں سلام کا جو ورد شروع کرایا تو اس پاکیزہ سپرے اور چھڑکاؤ سے سرزمین ہندو پاکستان میں یہ اثر ہوا کہ چند سرفروش ناموس رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہو گئے اور ان کے ایک ہی عمل نے ان کو غازی اور شہید ہونے کی دونوں صفات سے نواز دیا۔ جن میں علم الدین، عبدالرشید، مرید حسین، ملک میاں محمد، دوست محمد، عبدالقیوم، محمد صدیق، محمد عبداللہ، امیر احمد اور منیر احمد کے علاوہ متعدد صاحبان کا ذکر خالد متین نے اپنی ایک کتاب میں کیا ہے۔ انہوں نے اپنی حیات کا جو عجیب و غریب انتخاب اپنایا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ہمیں یہ ملک ماہ رمضان کی ستائیسویں یعنی شب قدر کو عطا فرما دیا۔ آدمی حیران ہو جاتا کہ اس ملک کی تخلیق کی اتنی مخالفتوں کے ہوتے اور بعد میں اس ملک کو توڑنے کی اتنی سازشوں کے باوجود بھی اس ملک کو اللہ تعالیٰ نے قائم رکھا ہوا ہے بلکہ اس ملک کو رب سبحانہ خود چلا رہا ہے۔ ورنہ اکثر اوقات حکمران کچھ بھی نہیں کر رہے ہوتے اور جس کسی نے بیرونی یا اندرونی طور پر اس ملک کے خلاف سازش کی یا اس کو نقصان پہنچایا تو وہ بھی عبرتناک انجام سے دوچار ہوا۔

58۔ علاوہ ازیں فطرت نے اسلام دشمن طاقتوں یعنی اینگلو امریکن بلاک کے لئے بھی پاکستان کی تخلیق ان کی ایک ''ضرورت'' بنا دی، وہ لوگ جانتے تھے کہ جنوبی ایشیا میں ''مہا بھارت'' یعنی ایک عظیم طاقت ان کے لئے کئی مسائل پیدا کر دے گی اور دنیا میں طاقت کا توازن ان کے خلاف ہو جائے گا۔ اس لئے وہ بھارت کے بھی کچھ ٹکڑے کرنا چاہتے تھے کہ ایک کو

دوسرے سے لڑا کر وہ بندر بانٹ کے طور ان بٹے ہوئے ملکوں کی قسمت پر صدارت کرتے رہیں۔ ان کی تجارتی منڈیاں بھی قائم رہیں اور شرق ہند کے تیل پر بھی ان کی اجارہ داری قائم رہے۔ اس لئے انگریزوں نے 1906ء میں اپنے مسلمان ٹوڈیوں سر آغا خان وغیرہ یا عمر حیات ٹوانہ قسم کے لوگوں سے مسلم لیگ کی بنیاد رکھائی اور ان کو محدود طور پر ''ہندی مسلم'' قومیت اپنانے کی راہ پر لگایا۔ اس لئے ان کی ایک ضرورت تو مشرق میں بنگالیوں کو تقسیم کرنے کی تھی اور مغرب میں مغربی پنجاب اور سندھ کو ملا کر ایک لنگڑا لولا پاکستان بنانا تھا۔ جس کو بلوچستان، سرحد اور کشمیر ہرگز نہ دینے مقصود تھے کہ کوئی بڑی مسلمان سلطنت وجود میں نہ آ جائے۔ جس کے گرد سب مسلمان اکٹھے ہو جائیں یا اس کی حدیں روس اور چین کے ساتھ یہ نزدیکی حاصل کر لیں جو موجودہ پاکستان نے حاصل کر لی ہیں۔ قارئین یہ بہت وسیع تحقیقی پہلو ہیں، جس سے میری کتابیں بھری پڑی ہیں۔ بے شک بیسویں صدی کے وسط میں انگریزی سلطنت کی وسعت ختم ہو رہی تھی، جس پر کسی وقت سورج نہ ڈوبا کرتا تھا۔ لیکن انگریز قوم کو زوال نہ آیا تھا وہ اب اینگلو امریکن بلاک بن گئے تھے اور دنیا کے حالات ایسے ہو گئے تھے کہ یہ لوگ اب سیدھے طور پر ملکوں یا لوگوں پر حکمرانی نہ کر سکتے تھے تو اپنی سلطنت کو سمیٹتے وقت سازشوں کے بے شمار جال پھیلا رہے تھے۔ ہماری قوم بڑی غلط فہمیوں کا شکار ہے کہ ہمارے ساتھ یہ سب کچھ ماؤنٹ بیٹن اور ریڈکلف نے کیا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن فروری، مارچ 1947ء میں آ کر وائسرائے بنا اور 9 مئی 1947ء کو بٹوارے کی تجویز تیار ہو گئی تھی؟ کیا یہ سب کام اکیلے ماؤنٹ بیٹن نے کیا؟ کہ اس نے نہرو کو یہ تجویز دکھا دی اور 17 مئی 1947ء کو اس تجویز کی نوک پلک سنوارنے کے لئے اس کو لندن لے گیا۔ اکیلی اٹیلی کی لیبر پارٹی نہیں بلکہ چرچل کی ٹوری پارٹی بھی ہم مسلمانوں کے ساتھ سب بے ایمانیوں میں شریک تھی۔ اور ہندوؤں اور اینگلو امریکن بلاک کی ایک قدر ''مشترک'' ہے اور وہ ہے اسلام دشمنی، باقی چھوٹی باتوں میں اپنا ''مفاد'' دیکھا جاتا ہے۔

59۔ لیکن جس پہلو کو ہمارے عوام نظرانداز کررہے ہیں۔ وہ ہمارے اندر غیروں کے ''ایجنٹ'' والا پہلو ہے۔ نواب کالا باغ امیر محمد کہا کرتا تھا کہ آزادی سے پہلے ہم چندہ تو مسلم لیگ کو دیتے تھے لیکن احکام انگریز ڈپٹی کمشنروں سے حاصل کرتے تھے۔ مارچ 1940ء کی قرارداد پاکستان سے تھوڑا پہلے سکندر حیات کی یونینسٹ پارٹی اور بنگال کے فضل الحق کی کرشک سماج پارٹیاں انگریزوں کے ''اشارے'' یا حکم پر باجماعت طور پر مسلم لیگ میں شامل ہوئی تھیں۔ مسلم لیگ میں مخلص آدمی انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے، تب ہی قائداعظم نے ایک دفعہ کہا تھا کہ میری جیب میں کافی ''کھوٹے سکے'' بھی ہیں۔ انگریز اپنی حکومت کے دوران، سرسید اور غلام کذاب وغیرہ جیسے لوگوں کو ایک جیسی ہدایات دے کر یہاں پر ابن الوقت یا بے دین لوگوں یا قادیانیوں یا چھپے قادیانوں کی ایک ''کھیپ'' تیار کرتے رہے، جس کو وہ مسلم معاشرہ پر مسلط کرتے رہے اور بعد میں انہی لوگوں کو ہمارے حکمران بنا گئے۔ جو آج بھی ہدایات اینگلو امریکن بلاک والوں سے لیتے ہیں۔ انہی لوگوں نے 11 اگست 1947ء کو قائداعظم کو باور کرایا کہ یہ ایک ''انتظامی'' اور ''بین الاقوامی'' ضرورت ہے کہ وہ یہ اعلان کرے کہ 14 اگست 1947ء کو ہم سب ''پاکستانی'' بن جائیں گے اور مذہب ہر کسی کا ذاتی معاملہ ہوگا۔ یہ بیان ایک بہت بڑا المیہ تھا۔ کیا اس بیان کے بعد قائداعظم جو ہر وقت اپنے اول اور آخر مسلمان اور مومن ہونے کا اعلان کرتا رہتا تھا، وہ مسلم قومیت کے نظریہ سے دستبردار ہوگیا تھا؟ اور حسین احمد مدنی کی طرح جغرافیائی نیشنلزم کا پیروکار بن گیا کہ ''اوطان'' سے قومیں بنتی ہیں اور یہی اینگلو امریکن بلاک اور ہندوؤں کی مشترکہ ضرورت تھی۔ وہ لوگ 1924ء میں کمال مردود سے خلافت کو ختم کرا کے امت واحدہ کے تصور پر کاری ضرب لگا چکے تھے۔ اس کے صرف 23 سال بعد وہ لوگ جنوبی ایشیاء میں مسلم قومیت کو دوبارہ ابھرنے کی ہرگز اجازت دینے کو تیار نہ تھے کہ اس طرح عالم اسلام کے دوبارہ اکٹھے ہونے کی بنیاد بندھ رہی تھی۔

60۔ اینگلوامریکن بلاک والے اپنی تجویز ''الفا'' کے ناکام ہونے پر بڑی تذبذب میں تھے کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان بھی پاکستان کا حصہ بن گئے تھے۔ اس لئے وہ لوگ فیصلہ کر چکے تھے کہ کشمیر کو کبھی بھی پاکستان کا حصہ نہ بننے دیں گے اور بے ایمانی سے نہ صرف مسلم اکثریت والا ضلع گورداسپور بھارت کو دے دیا۔ بلکہ متعدد مسلم اکثریت والی تحصیلیں اور پاکستان کے حصہ میں آنے والے ہیڈ ورکس مادھوپور اور فیروز پور بھی بھارت کو دے دیئے۔ اب وہ چاہتے تھے پاکستان ایک بہت ہی کمزور ملک ہو اور یہ ''قدر'' بھی ان میں اور بھارت میں ''مشترک'' تھی۔ لیکن اینگلوامریکن بلاک والے ایسا کمزور پاکستان چاہتے ہیں جو ان کی انگلیوں پر ناچتا رہے لیکن قائم رہے۔ بھارت والے پاکستان کو اتنا کمزور کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ختم ہو کر بھارت کا حصہ بن جائے۔ بہرحال دونوں کی ایک اور قدر بھی مشترک ہے کہ یہاں مادر پدر آزاد جمہوریت اور کافرانہ اور باطل نظام کے تحت حکومت چلے۔ اسلامی فلسفہ حیات کے تحت پاکستانی مسلمان کہیں حزب اللہ بن کر جہاد کو طرز زندگی کے طور پر نہ اپنا لیں اور وہ جغرافیائی نیشنلزم کے تحت پاکستانی قومیت کے طور پر پاک زمین کو اسی طرح ''شاد باد'' کرتے رہیں۔ جس طرح اہل مغرب یونانی فلسفہ کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ہندو ''بندے ماترم'' کے طور پر بھارت کی زمین اور وطن کی پوجا کر رہے ہیں۔ ان کو ڈر تھا کہ علامہ اقبال مسلمانوں کو تنبیہ کر گیا تھا کہ وطن کو خدا بنا کر اس کی پوجا نہ شروع کر دو، تم لوگ مصطفوی ﷺ ہو۔ چونکہ ''مولویوں'' اور ان کی اکثر جماعتوں، احرار، خاکسار، جمعیت العلمائے ہند، جماعت اسلامی اور اشرف علی یا شبیر عثمانی کو چھوڑ کر اکثر دیوبندیوں نے پاکستان کی تخلیق کی مخالفت کی تھی۔ تو انگریزوں کی تیارہ کردہ ''کھیپ'' نے ایک نیا شوشہ چھوڑا کہ مولوی کے دقیانوسی اسلام کی بجائے وہ ماڈرن اور لبرل جمہوری اسلام کا پاکستان میں نفاذ کریں گے۔ یہ ''جدید اسلام'' آج تک تلاش نہ ہو سکا کہ جو کچھ آج ''جدید'' ہے کل وہ ''قدیم'' ہو جائیگا۔

''زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک

دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم''

61۔ اس فکری انتشار اور افراتفری کے علاوہ عملی طور پر سول بیوروکریٹس میں سے انگریزوں کی تیار کردہ ''کھیپ'' میں سے چودھری محمد علی، سکندر مرزا اور لاہوری قادیانی عزیز احمد اور جی احمد برادران لیاقت علی کی سربراہی میں ہمارے حکمران بن گئے۔ جن میں ایک ''لاہوری غندہ'' غلام محمد کا اضافہ کیا گیا اور پھر ایک گھاگ سیاسی مداری مشتاق گورمانی بھی آ کر ان میں شامل ہو گیا۔ وزارت میں دو مخلص سیاستدان راجہ غضنفر علی اور ابراہیم اسمٰعیل چندریگر جن پر قائد اعظم بھی بھروسہ کرتا تھا۔ ان کو سفارت کے بہانے ملک سے باہر بھیج دیا۔ علاوہ ازیں ہم نے صوبہ پنجاب اور صوبہ سرحد میں انگریز گورنر رکھ لیئے یا فوج کی سربراہی کے لئے جو انگریز جنرل نوکر رکھے، انہوں نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا۔ ان سب کو احکام دہلی سے ماؤنٹ بیٹن کے ذریعہ سے ملتے تھے جس کی تفصیل میری کتابوں میں موجود ہے۔ ان لوگوں نے ہمارا رخ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی طرف نہ ہونے دیا۔ یہ رخ اس طرح سے لندن اور واشنگٹن کی طرف کر دیا کہ آج بھی یہ رخ ادھر ہی ہے اور جو عملی نقصان پہنچایا، اس کا کچھ اختصار اگلے پیرا میں آ رہا ہے۔

62۔ کشمیر کا مہاراجہ ہری سنگھ ہندو ہوتے ہوئے ہندو ذہنیت کو سمجھتا تھا۔ اس لئے بھارت میں شامل ہونے کی بجائے وہ پاکستان کے ساتھ کوئی باعزت سمجھوتہ کرنا چاہتا تھا کہ اپنے لئے اور اپنی اولاد کیلئے کشمیر کا ''تخت'' محفوظ رکھ سکے۔ اب کشمیر کے اضلاع میر پور اور پونچھ میں جو عملی طور پر جہاد شروع ہو گیا تو ہم نے اکبر خان طارق سے کشمیر کو آزاد کرنے اور سری نگر کی طرف پیش قدمی کو جو تجاویز بنوائیں۔ اس کی تین اہم ضرورتیں تھیں۔ اول یہ مہم برف پڑنے کے بعد دسمبر کے مہینہ سے پہلے عمل میں نہ لائی جائے کہ برف سے بانہال کا درہ بند ہو جائے، اور جموں اور سری نگر کا رابطہ کٹ جائے۔ دوم سری نگر کے ہوائی اڈہ بڈگام پر پہلے قبضہ کیا

جائے یا کچھ بربادی پیدا کی جائے کہ بھارت سری نگر میں فوج نہ اتار سکے۔ سوم پٹھانکوٹ اور جموں کی سڑک پر جگہ جگہ حملہ کر کے اس ذرائع آمد کو برباد کیا جائے۔ یہ سب کام سردار شوکت حیات کے ماتحت یعنی سری نگر کی طرف پیش قدمی، سرحد کے لشکروں کے ساتھ میجر خورشید انور نے کرنا تھا اور جموں کی طرف سیالکوٹ سے محمد زمان کیانی نے۔ اب بھارت کے جواہر لعل نہرو کے خطوط ظاہر کرتے ہیں کہ بھارتی فوجوں کو کشمیر میں برف پڑنے سے پہلے اتر جانا چاہیے تھا۔ اب جو کچھ ہم نے اکتوبر 1947ء میں خورشید انور سے کرایا۔ یہ بھارت کی ''ضرورت'' تھی اور یہ کچھ ہم سے ہمارے سرحد کے گورنر جارج کنگھم، پشاور کے ڈویژن کمانڈر جنرل میک کے اور سرحد کے پولیس کے انگریز انسپکٹر جنرل نے کرایا اور ساتھ بھارت کے انگریز فوجی سربراہ جنرل لاکھارٹ کو خبر بھی دے دی کہ بھارتی ''تیار'' ہو کر اس کا ردعمل بھی کریں۔ کیا کوئی پٹھان افسر نہ ملتا تھا؟ کہ یہ کام ریاست مالیر کوٹلہ کے باشندہ خورشید انور سے کرایا جو لیاقت علی کے سیاسی سیکرٹری صدیق علی خان کے وساطت سے لیاقت کا ''خاص الخاص'' آدمی تھا۔ شوکت حیات اور زمان کیانی نہ صرف منظر سے ''غائب'' ہو گئے بلکہ لیاقت علی گورنر پنجاب موودی اور سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر غلام کذاب کے پوتے ایم ایم احمد کی سازش اور عمل سے سیالکوٹ کی طرف سے نہ صرف جموں کی طرح حملہ روک دیا بلکہ اکبر خان طارق نے جو پنجاب پولیس کا نام استعمال کرتے پنجاب کے مجاہدین کے لئے چار ہزار رائفلیں دی تھیں۔ ان مجاہدین سمیت پندرہ ہزار مزید رضا کار مجاہدین کو روپوچک میں ''سیگریکیٹ'' کر دیا کہ خبردار جموں، پٹھانکوٹ محاذ ہرگز نہ کھولا جائے گا۔ فوجی سربراہ جنرل میسروی کے حکم پر سیالکوٹ چھاؤنی میں سولھویں پنجاب سنٹر کا کمانڈر کرنل ھوبرٹ، غلام کذاب کے پوتے ایم ایم احمد کی مدد کر رہا تھا کہ کٹھوعہ سے جموں میں بھارتی فوج کی آمد کو ''حفاظت'' پہنچائی جائے اور ان کی حرکتوں یا پیش قدمیوں میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا کی جائے۔

63۔ لیاقت علی کا ''خاص الخاص'' آدمی خورشید انور، انگریزی حکومت کا بھی ''خاص الخاص'' آدمی تھا جو بقول کرنل سلطان علی شاہ مغویہ عورتوں کی ''تجارت'' بھی کرتا رہا۔ اس نے سری نگر کی طرف پیش قدمی کی ''تینوں ضرورتوں'' کی پرواہ نہ کرتے، سری نگر پر حملہ کا صرف ''ڈرامہ'' کیا اور بارہ مولا میں رک کر مہورا کے بجلی گھر کا رابطہ عین اس وقت سری نگر سے ''کاٹ'' دیا، جب ہری سنگھ دسہرہ منا رہا تھا اور حالات سے ''باخبر'' بھارتی سیکرٹری مینن (Menon) اور مہاراجہ کو دیا گیا نیا وزیر اعظم مہر چند مہاجن وہاں موجود تھے۔ اس ''اندھیر گھپ'' میں مہاراجہ کو ڈرایا کہ اسی وقت بذریعہ کار جموں پہنچ جاؤ اور بھارت میں شمولیت کے دستخط کرو، تو تمہارا قیمتی سامان بھی ٹرکوں میں وہاں پہنچا دیا جائے گا۔ بھارتی فوج تو کل سے سری نگر اترنا شروع کر دے گی لیکن سری نگر کی مکمل حفاظت مشکل ہے البتہ جموں کی حفاظت کا ''بندوبست'' کر لیا گیا ہے۔ یعنی لیاقت علی اور اس کے خاص ''حواری'' دل سے ہمارے ساتھ ہیں۔ اب قارئین کو معلوم ہے کہ کس طرح مہاراجہ نے ''شمولیت'' پر دستخط کئے یا صرف ایسا ''اعلان'' کر دیا۔ خورشید انور دو دن بارہ مولا میں بیٹھا رہا، جب بھارتی فوج نے سری نگر اتر کر بارہ مولا کی طرف پیش قدمی کی اور خورشید انور کو ''تسلی'' ہوگئی کہ بھارتی وادی کشمیر میں پہنچ گئے ہیں تو اس نے قبائلی مجاہدین سے کھلے میدان میں سری نگر کی طرف پیش قدمی کروائی کہ ''مقصد'' یہ تھا کہ بھارتی ہوائی جہاز ان پر بمباری کر کے ان کے ''دماغ'' سے جہاد کا ''کیڑا'' نکال باہر کریں۔ پھر قبائلی مجاہدین بے چارے کس طرح تتر بتر ہوئے یا خورشید انور اپنی ران میں خود گولی مار کر کس طرح منظر سے ''غائب'' ہوا، قارئین تفصیل میری کتابوں میں پڑھ لیں۔

64۔ انہی دنوں لیاقت علی بھی اپنے ''خاص حواریوں'' کے ساتھ لاہور سرکٹ ہاؤس میں اور قائد اعظم بھی لاہور گورنر ہاؤس میں ''مقیم'' تھے۔ قائد اعظم کو صحیح صورت حال کے بارے میں ''اندھیرے'' میں رکھا ہوا تھا۔ لیکن جب بھارتی فوج نے سری نگر اترنا شروع کر دیا تو قائد اعظم نے پوچھا کہ کیا پٹھانکوٹ، جموں روڈ کو ''کاٹ'' دیا گیا ہے کہ خشکی کے راستے بھارت

والے مزید کمک نہ بھیجیں۔ تو آگے سے جھوٹ بولا گیا کہ پنجاب کے مجاہدین بھاگ گئے ہیں۔ انہوں نے جموں محاذ پر حملہ ہی نہیں کیا تو قوم کو گویہ بات دیر سے ''معلوم'' ہوئی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ قائداعظم نے لیاقت کو بیچ لانے سے پہلے سیدھے طور پر گورنر مودی کے ذریعہ فوجی سربراہ جنرل میسروی کو حکم بھیجا کہ دو پلٹنوں کے ذریعہ سے پٹھانکوٹ، جموں روڈ کاٹ دی جائے کہ مہاراجہ کشمیر ہمارے ساتھ "Stand Still" کا معاہدہ کئے ہوئے تھا۔ بھارتی فوج کے وہاں دخول کے بعد ہماری فوج بھی حفاظتی طور پر کشمیر میں داخل ہو سکتی تھی۔ لیکن لیاقت علی کو ساتھ ملا کر ہمارے انگریز نوکر ایک بہت بڑی سازش پر عمل پیرا تھے کہ پاکستان کا ہرگز کشمیر پر کوئی حق نہیں۔ ہمارا انگریز نوکر جنرل میسروی جو نچرہ قسم کا آدمی تھا اور 1922ء سے ماؤنٹ بیٹن کا دوست تھا۔ وہ اس نازک گھڑی کو ''جانتے'' ہوئے جان بوجھ کر مچھلیوں کے شکار کا ''شوق'' فرما رہا تھا اور اس کی ''غیر حاضری'' میں اس کا نائب گریسی ''مٹی کا مادھو'' بنا ہوا تھا۔ معاملات کو کس طرح ''وقتی التوا'' میں ڈالا گیا اور پھر لاہور میں کیسے لیاقت علی کے ''حواریوں'' نے ''اجتماع'' کیا۔ کہ دونوں ملکوں کی متحدہ افواج کا سربراہ فیلڈ مارشل آکنلیک بھی دہلی سے لاہور پہنچ گیا اور ماؤنٹ بیٹن سے ''وعدہ'' لے آیا کہ کس طرح ایک ہفتہ کے اندر ماؤنٹ بیٹن، نہرو اور پٹیل دونوں کو لے کر لاہور پہنچیں گے اور کشمیر کے بارے فیصلہ کریں گے۔ بقول ایڈمرل احسن جو اس وقت قائداعظم کا اے ڈی سی تھا، لیاقت کی حکومت نے قائداعظم کو کتنا ''مایوس'' کیا۔ قارئین تفصیل میری کتابوں میں پڑھیں۔

65۔ پوری قوم کو معلوم ہے کہ کس طرح پٹیل نے پاکستان آنے سے انکار کر دیا تھا اور ہمیں کہا گیا کہ پٹیل سے مکمل اختیارات لے کر ماؤنٹ بیٹن اور نہرو آئیں گے۔ لیکن آخری وقت بیماری کا بہانہ بنا کر نہرو بھی نہ آیا اور اکیلا ماؤنٹ بیٹن آیا اور کشمیر میں غیر جانبدار رائے شماری کی ایک مکمل تجویز پر ''اتفاق'' ہو گیا کہ ایک ہفتہ کے بعد بھارتی کابینہ سے منظوری کے بعد اس پر عمل شروع ہو جائے گا۔ پہلے مزید ایک ہفتہ التوا کی مہلت مانگی اور پھر یہ ''التوا'' مہینوں اور

سالوں تک بڑھ گیا اور آج تک وہی صورت حال ہے۔ (تو یہ میرے اللہ۔ کیسے بے اصول دشمنوں کے ساتھ واسطہ ہے)۔ بہر حال انہی دنوں قائداعظم نے لیاقت حکومت کو حکم دیا کہ کشمیر میں جہاد کو جاری رکھا جائے تو اکبر خان طارق نے تجویز دے دی کہ قبائلی مجاہدین کو پونچھ اور جموں محاذ پر بھی جہاد میں شمولیت کی اجازت دی جائے۔ تو لیاقت حکومت نے جموں کے علاقہ میں قبائل مجاہدین کے استعمال کی اجازت نہ دی تو قائداعظم کو تب معلوم ہو گیا کہ جموں میں پہلے بھی مجاہدین کو خود بخود جہاد سے روکا تھا اور اب بھی روکا ہوا ہے کہ اس طرح بھارت کے ساتھ جنگ شروع ہو جائے گی تو قائداعظم نے فرمایا کہ بے شک جنگ شروع ہو جائے ''لڑنے والے کبھی نہیں مرتے۔'' تو پھر لیاقت اور اس کے ''حواریوں'' نے اپنی ''کمزوری'' کا بہانہ بنایا کہ ہمارے پاس فوج کم ہے اور جو ہے وہ افغانستان کی سرحد پر متعین ہے۔ تو قائد نے حکم دیا کہ وہ سب فوج مشرقی سرحد پر لائی جائے۔ ہر ضلع میں نیشنل گارڈ کے طور پر جتنی فوج کھڑی کی جا سکتی ہے وہ کھڑی کی جائے۔ ہتھیار نہیں تو ہم نیزوں اور بھالوں سے بھی لڑیں گے اور اسلام غیر تمند لوگوں کا دین ہے۔ ساتھ ہی جلد سے جلد انگریز جنرل میسروی سے ''چھٹکارا'' حاصل کرنے کیلئے انگریزوں سے جنرل ٹکر مانگا جو جنوری 1948ء میں کراچی پہنچ بھی گیا کہ ماؤنٹ بیٹن نے اس کو واپس کرا دیا کہ وہ اتنا ''غلیظ'' آدمی نہ تھا کہ ہمارے ساتھ وہ بے ایمانیاں کرتا جو ماؤنٹ بیٹن نے میسروی کے ''جانشین'' جنرل گریسی سے ہمارے ساتھ کروائیں۔

66۔ قارئین! میری کتابیں غور سے پڑھیں کہ کیا غداریاں اور کوتاہیاں ہوئیں۔ قائداعظم یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ انگریز قوم اس حد تک ہمارے اندر سے ابن الوقت اور بے کردار لوگوں کے ساتھ ''رابطہ'' میں تھی، جن کو وہ ہم پر ''براجمان'' کر گئے۔ ایسی بے حساب غداریوں اور کوتاہیوں کے باوجود مجاہدین نے کشمیر میں بے حساب کامیابیاں حاصل کر لیں۔ کرنل حسن مرزا نے گلگت کے وسیع علاقے فتح کر لیے۔ اکبر خان طارق نے محصور لشکروں سے پونچھ اور

اُڑی کے درمیان گوہلان کے مقام پر ایک بھارتی سکھ پلٹن کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ جنوب میں پونچھ اور میر پور کے مجاہدین نے علاقہ دیر کے مجاہدین کی مدد سے جھنگڑ جیسے اہم فوجی اہمیت کے مقام کو آزاد کرا لیا۔ راجوری کو آزاد کرانے والے مجاہدین کے ساتھ رابطہ ہو گیا اور ٹھنڈ کے کے مقام پر کشمیرا خان اور پنجاب کے علاقوں کے مجاہدین نے مل کر ایک بھارتی پنجاب رجمنٹ اور ایک بکتر بند سکاڈرن کا صفایا کر دیا۔ تو ماؤنٹ بیٹن کے مشورہ سے نہرو کشمیر کا مقدمہ اقوام متحدہ میں لے گیا کہ انگریزوں نے وعدہ کیا کہ اس کاروائی کے بعد وہ لوگ پاکستان کے انگریز جنرلوں کے ذریعہ سے مجاہدین کی کاروائیوں کی شدت میں کمی پیدا کر لیں گے۔ اکبر خان طارق نے طارق ہیڈ کوارٹر بنا کر سب مجاہدین کی کمانڈ سنبھال لی تھی۔ کہ پہلے مرحلہ میں ہر محاذ پر الجھا کر وہ بھارتیوں کو تتر بتر کرنا چاہتا تھا اور باری باری ان بھارتی گروہوں کا دوسرے مرحلہ میں صفایا کرنا تھا۔ چنانچہ کرنل حسن مرزا گلگت سے ایک کالم نکال کر دوسائی اور برزل جیسے اونچائی والے پہاڑوں کو عبور کر کے بانڈی پور پہنچ گیا۔ جہاں سے اس نے ھندواڑہ میں کرنل خالد کے ساتھ رابطہ باندھنا تھا اور دوسائی کو عبور کرتے ایک اور مجاہدین کی کالم کارگل پہنچ گئی تھی۔ جہاں سکردو سے پیش قدمی کرنے والے مجاہدین سے رابطہ کے بعد پہلے انہوں نے بریگیڈیر فقیرا سنگھ کی کمک والی فوج کو تہس نہس کیا اور پھر کرنل کرپال سنگھ کے بریگیڈ کو تباہ کیا۔ پھر کارگل سے دراس ہوتے میجر محمد خان جرال نے درہ زوجیلہ کو بھی آزاد کرا لیا اور بھارتیوں کیلئے سری نگر کی شمال کی طرف سے بھی خطرہ پیدا ہو گیا۔ مغرب کی طرف سے کرنل شیر محمد خالد کا نام اپنا کر ٹیٹوال سے ہندواڑہ پہنچ چکے تھے اور سوپور بھی آزاد ہو گیا کہ بھارتی جنرل تھمایا کو مظفر آباد پر قبضہ کرنے والی بات بھی بھول گئی۔

67۔ وسط میں کرنل بعد میں بریگیڈیر صدیق ستی نے چھوٹی توپیں حاصل کر کے پونچھ والی بھارتی فوج کے بریگیڈیر پریتم سنگھ کو ہتھیار ڈالنے کیلئے تیار کر لیا کہ جنرل گریسی کی سازش سے نہرو اور لیاقت نے بیمار بھارتیوں کو پونچھ سے نکالنے کے بہانے عارضی فائر بندی کرالی۔ جو جہاز

بیماروں کو لینے آیا اس میں ایک بڑی توپ بھی تھی۔صدیق ستی حملہ کر کے فائر بندی ختم کر کے اس توپ پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا لیکن جنرل گریسی نے وہاں اپنا ایک پروردہ بریگیڈیر بعد میں میجر جنرل حیاء الدین کو بھیج دیا، جو صدیق ستی سے سینئر تھا۔اس نے فائر بندی جاری رکھی اور بھارتیوں کو مزید کمک پہنچ گئی اور پونچھ پر اب بھی بھارت کا قبضہ ہے کہ حیاء الدین جو قادیانی تھا الٹا اس کو اس عمل کے لئے بعد میں ہلال جرات کے تمغہ سے نوازا گیا۔اس سے بڑی اور غداری یا کوتاہی کیا ہو سکتی تھی؟

68۔ بہر حال مجاہدین کی فتوحات اور جگہوں پر بھی جاری تھیں۔میجر بعد میں کرنل محمد اسلم عباسی نے راجوری کی کمانڈ سنبھال لی تھی اور اس کے مجاہدوں اور قبائلی لشکروں نے پیر پنجال، شوپیاں، تھنہ منڈی، بانہال اور رام بن تک کے علاقے آزاد کرا لیے تھے۔کرنل علی بہادر نے اکھنور کے نزدیک بونی بارکھ کا علاقہ آزاد کرالیا تھا اور میجر سرفراز نے بریگیڈیر کا عہدہ اپنا کر اور صلاح الدین کا نام اپنا کر میر پور اور پونچھ کے ہزاروں مجاہدین اور قبائلی مجاہدین خاص کر دیر کے لشکروں کی کمانڈ سنبھال کر بھارت کی نوشہرہ میں دو بریگیڈ افواج کو تین اطراف سے گھیرے میں لے لیا۔یہ فروری، مارچ 1948ء کا زمانہ تھا۔اکبر خان طارق نے گزارش کی کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ قائداعظم کی خواہش کے مطابق نہ صرف جموں محاذ کھولا جائے۔ بلکہ ضرورت کے مطابق مجاہدین کے لئے مدد کے طور پر فوج کو بھی استعمال کیا جائے اور نوشہرہ میں صلاح الدین کو فوجی امداد دے کر ہم دو بھارتی بریگیڈوں کے تہس نہس کر دیں گے اور مرالہ سے کرنل بعد میں جنرل سید غواص جموں اور اکھنور کا رابطہ کاٹ دیں اور روپوچک اور اردگرد سے پنجاب کے پندرہ ہزار مجاہدین کرنل عنایت کیانی کے ماتحت پٹھانکوٹ کا جموں سے رابطہ کاٹ دیں۔لیکن کیا ہوا؟ قارئین میری کتابیں پڑھیں کہ اکبر خان اپنی کتاب ''کشمیر کے حملہ آور'' میں کہتا ہے ''جموں کو ہم نے چھوڑ دیا۔جموں نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا'' لیاقت علی نے اکبر خان کی طارق ہیڈ کوارٹر سے ''چھٹی'' کرادی اور کشمیر کے اندر کے

جہاد کے پاک عمل کو ناپاک انگریز جنرلوں کے ہاتھ میں دے دیا۔

69۔ قارئین! ذرا نقشوں پر وہ مقامات دیکھیں جہاں تک ہم پہنچے ہوئے تھے۔ اگر اس وقت فائر بندی بھی کر لیتے تو دو تہائی کشمیر ہمارے پاس تھا اور فائر بندی کے بعد بھارتی باقی کشمیر میں نہ ٹھہر سکتے تھے۔ ویسے پوری بھارتی فوجی مشینری کو کشمیر میں تہس نہس کرنے کا یہ نادر موقع تھا۔ 48-1947ء میں سات ایسے نادر مواقع آئے کہ ہم بھارتی افواج کو اس طرح تہس نہس کر سکتے تھے کہ وہ لوگ حیدر آباد کی طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکتے۔ وہ لوگ Exterior Lines پر لڑ رہے تھے اور ہم Interior Lines پر تھے۔ لیکن کیا ہوا؟ اوّل جنرل گریسی نے ہمارے دو تکمی والے میجر جنرل افتخار سے سیالکوٹ کے بریگیڈیر محمد موسیٰ (بعد میں جنرل) کو حکم دلایا کہ سیالکوٹ اور مرالہ کے علاقوں سے تمام مجاہدین کو بے ہتھیار کر کے ان کے گھروں میں بھیج دیں۔ دوم کشمیر کے مجاہدین کے کمانڈر محمد زمان کیانی کو لیاقت علی کی طرف سے چودھری محمد علی حکم دے گیا کہ خبردار! دریائے چناب کے مشرق میں مجاہدین کوئی چھوٹی موٹی کاروائی بھی نہیں کر سکتے۔ باقی مجاہدین کے ہاتھ بھی ''باندھ'' دیئے کہ اب معاملہ اقوام متحدہ میں چلا گیا ہے، کوئی Offensive یعنی حملے کی کاروائی نہ ہوگی اور ''ساکن دفاع'' اختیار کیا جائے کہ ''آ بیل مجھے مار'' جنگیں ہمیشہ زمان و مکاں کے اصولوں کے تحت لڑی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری فوج کو غلط اوقات میں غلط جگہوں پر بھیج کر بغیر توپخانہ اور فضائی افواج کی مدد کے بھارتی ''سورماؤں'' کے سامنے ''ہزیمت'' دلا کر نکو بنایا گیا کہ ان کے دماغوں سے بھی جہاد کا ''کیڑا'' نکالا جائے۔ جو کچھ ہم نے دسمبر 1971ء میں مشرقی پاکستان میں کیا اس کی ''بنیاد'' باندھی جا رہی تھی۔ قارئین! یہ عاجز جواب آہ و زاری والی ''کیفیتوں'' میں چلا گیا ہے۔ تو میری چیخ و پکار کب سے شروع ہے۔

70۔ قائداعظم بیمار تھے اور پھر زیارت بھی چلے گئے۔ تو وہ حکومت کے معاملات سے ''دور'' ہوتے جاتے تھے۔ بہر حال بریگیڈئر شیر خان کو ان کے پاس بھیج کر ان کو بتایا گیا کہ کشمیر کا معاملہ اب

اقوام متحدہ میں چلا گیا ہے اور ہم کشمیر کے معاملہ میں اپنے آپ کو بھارت کے ساتھ برابر کی ''پارٹی'' بنانا چاہتے ہیں۔ اس لئے اگر جموں کا محاذ کھولیں یا فوج کے استعمال سے کوئی بھرپور کاروائی کریں تو ہمیں اقوام متحدہ میں Agresser قرار دے دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں بھارتی فوجیں حیدر آباد پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہی ہیں اور ہمارے لئے کشمیر حاصل کرنے کا وہ نادر موقع ہوگا کہ ہم بھی اپنی فوجیں کشمیر میں داخل کر دیں گے۔ ایک طرف قائد کے ساتھ یہ جعل سازی ہو رہی تھی تو دوسری طرف اقوام متحدہ میں ظفر اللہ سے لمبی مہمل اور بے معنی تقریریں کرا کے مغربی لابی کے پریس نے ظفر اللہ کو ایک ''مدبر'' اور Statesman والے وہ سہرے باندھے کہ ہم نے اس کو اپنا وزیر خارجہ بنا لیا کہ مغربی لابی کی یہ ''ضرورت'' بھی پوری ہوگئی۔ ظفر اللہ ہمارے تمام سفارتخانوں کو قادیانیوں، ابن الوقت اور بے دین لوگوں سے ایسے بھر گیا کہ یہ عاجز اس سلسلہ میں مشرف کے باپ اور شہریار کا ذکر پیراگراف نمبر 25 اور 32 میں کر چکا ہے اور آج تک یہی صورت حال ہے۔ بہر حال اس زمانے میں بھی ظفر اللہ کی تقریروں نے ہمیں کچھ نہ دیا۔ کشمیر جو قانونی، تاریخی، جغرافیائی اور روحانی طور پر صرف پاکستان کا حصہ ہوسکتا تھا، وہاں یہ تاثر سامنے آنے لگا کہ ہم چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح کشمیر میں داخل ہو کر اس کو اپنی ''سلطنت'' کا حصہ بنانا چاہتے ہیں (توبہ میرے اللہ)۔ آخر مغربی لابی سے مل کر ظفر اللہ کی ان غداریوں پر کب تک پردہ رہتا۔ سندھ کے مشہور رہنما مسٹر ہاشم گزدر لیک سیکسیس گئے ہوئے تھے اور ان کو ظفر اللہ کی غداریوں کے پورے ثبوت مل گئے۔ تو انہوں نے صرف قائد اعظم کو کسی ذریعہ سے صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ بلکہ کئی Meetings میں کھلے طور پر اعلان کیا کہ لیک سیکسیس میں یہ بات سینہ بسینہ چل رہی تھی کہ ظفر اللہ نمائندہ تو پاکستان کا ہے، لیکن کام بھارت کیلئے کر رہا ہے۔ انہی دنوں زیارت میں متحدہ ہندوستان کے پرانے مسلم لیگی راجہ محمود آباد اور کچھ دن بعد ایران میں ہمارے سفیر راجہ غضنفر علی نے قائد اعظم کے ساتھ ملاقات کی تو ان کو معلوم

ہوا کہ قائد نہ صرف ظفر اللہ کی غداریوں سے آگاہ تھے بلکہ لیاقت حکومت سے بھی سخت نالاں تھے۔ لیکن کسی حتمی فیصلہ پر نہ پہنچے تھے کہ کیا صرف اکیلے ظفر اللہ کو برخاست کریں یا ساتھ لیاقت حکومت سے بھی ''چھٹکارا'' حاصل کریں۔ لیکن حکومت کس کے ''سپرد کریں؟ قارئین! اس مشکل سوال پر ہمارے اخباروں اور سنجیدہ لوگوں میں بہت بحث ہو چکی ہے۔ پس ''قحط الرجال'' کا کتنا رونا رویا جائے۔ میری کتابیں انہی باتوں سے تو بھری پڑی ہیں اور یہی میری آہ وزاری ہے۔

71۔ اب اگست 1948ء میں قائد نے لیاقت کو زیارت بلا بھیجا یا لیاقت یہ دیکھنے گیا کہ یہ ''بوڑھا'' کتنے دن اور ''زندہ'' ہے۔ بہر حال لیاقت کو تمام ''ذرائع'' سے معلوم ہو گیا کہ قائد اب چند دن کا مہمان ہے۔ تو یہ عاجز کوئی مفروضہ نہ پیش کرے گا کہ کیا بات ہوئی لیکن صاف ظاہر ہے کہ اگر قائد نے لیاقت کو کھری کھری سنائیں تو لیاقت نے بھی آگے سے قائد کو جو کچھ بتایا۔ تو ملاقات کے بعد مس فاطمہ جناح نے قائداعظم کی آنکھوں میں ''بے بسی'' کے اور ''مجبوری'' کے آنسو دیکھے۔ لیکن وہ عظیم انسان تھا ''شودھا'' قسم کا کوئی آدمی نہ تھا کہ پھوٹ پڑتا یا بدزبانی پر اتر آتا۔ اس حالت میں بھی قائداعظم نے اگلے چند دن کوئی ''عمل'' سوچا۔ وہ کیا تھا؟ قائد ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔ 11 ستمبر 1948ء قائداعظم ''مرنے'' کیلئے تو کراچی نہ آرہا تھا۔ اگر وہ مکمل طور پر بے بس ہو چکا ہوتا تو آرام سے زیارت ہی میں بستر مرگ پر جان دے دیتا لیکن سازش بہت گہری تھی۔ قائد اپنے اس عمل کو ''عام'' کرنے یا ''اعلان'' کرنے سے پہلے کیسے موت سے دوچار ہو گیا کہ ایک سرکاری آدمی کراچی کے ہوائی اڈے پر موجود نہ تھا۔ بہانہ بنایا جاتا ہے کہ قائد کی کراچی میں آمد کی ''پوشیدگی'' کی ضرورت تھی، کیوں؟ جواب ندارد۔ ہاں ایک ٹوٹی پھوٹی ایمبولینس اڈے پر ضرور موجود تھی۔ جس کا پیٹرول راستے میں ختم ہو گیا۔ لیاقت حکومت میں اگر ذرا بھر بھی غیرت ہوتی اور وہ اس عمل میں قصوروار نہ ہوتے تو ''ڈوب مرنے'' کی بات تھی۔ وہ فوراً حکومت سے مستعفی ہو جاتے کہ وہ ملک کے بانی کی بھی

صحیح حفاظت نہ کر سکے۔ بہر حال قائداعظم کی عظمت بے مثال تھی۔ دشمن ان کی آخری سانس کے آنے تک ان سے خوف کھاتے تھے کہ ان کی زندگی میں بھارتی حیدر آباد پر حملہ آور نہ ہو سکے۔ ان کی وفات کے چوتھے دن بھارتیوں نے حیدر آباد پر حملہ کر دیا۔ ظفر اللہ نے جو جان بوجھ کر قائداعظم کے جنازے کے ساتھ جا کر وہاں الگ کھڑا ہونے کا ''ڈرامہ'' کیا۔ وہ ایک طرف اس کے ''خبث باطن'' کا مظاہرہ تھا، اس کو معلوم تھا کہ قائداعظم کم از کم اس کو ضرور برخاست کرنے والے تھے۔ دوسری طرف یہ ہمارے منہ پر ''تھپڑ'' تھا کہ مغربی لابی کتنی مضبوط ہے کہ قائداعظم کو بھی انہوں نے اپنے راستے سے ہٹالیا۔ ہفتہ کے اندر اندر لیاقت علی کے حکم پر پنجاب کے اس وقت کے وزیر مال ممتاز دولتانہ نے ربوہ کی زمین کوڑیوں کے بھاؤ میں جھوٹے نبی کے پیروکاروں کے نام انتقال کر دی۔ پاکستان کے وسط میں قادیانی جھوٹے نبی کا مرکز بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور ہمارے خلاف ہر سازش کا ''گھر مکہ'' وہاں پکتا ہے۔

72۔ بھارتیوں کے حیدآباد پر حملہ کے مدنظر جن افواج کو کشمیر میں داخل ہونے کیلئے ''چوکنا'' کیا گیا تھا، وہ احکام Cancell کر دیئے کہ اب ہم بھارت کے ساتھ جنگ مول نہیں لے سکتے۔ ہمارا انگریز نوکر جنرل گریسی 20۔اپریل 1948ء کے ایک خط کے ذریعہ سے ہمیں بے وقوف بنا چکا تھا کہ جھنگڑ، پونچھ اور اوڑی کی لائن بھارتیوں کو پار نہ کرنے دی جائے کہ اس سے پاکستان کے ''دفاع'' کو خطرہ ہے۔ یعنی باقی آزاد کردہ علاقوں کو وہ دوبارہ قبضہ میں لے سکتے ہیں (توبہ میرے اللہ)۔ حیدر آباد سے فارغ ہو کر بھارتی فوجیں کشمیر میں آ گئیں۔ پہلے بھی وہ بانڈی پور، ھندواڑہ، سوپور اور شمال میں کئی علاقوں اور وسط میں تھنہ منڈی، پیر پنجال اور راجوری و جھنگڑ کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے چکے تھے۔ اب بھارتیوں نے زوجیلہ پر قبضہ کرنے کے بعد کارگل پر بھی قبضہ کر لیا اور نہ صرف راجوری سے پونچھ کا رابطہ باندھ لیا، بلکہ ہمارے پونچھ کے محاصرہ کو بھی ختم کر کے زرخیز منڈھیر وادی پر بھی قبضہ کر لیا۔ چنانچہ بھارتی

اتنے علاقوں پر قبضہ کر چکے تھے کہ ان سب کو ''ہضم'' کرنا مشکل تھا۔ ان کا سر شمال میں کشمیر وادی سے بھی اوپر نکل چکا تھا اور پاؤں ابھی جموں میں تھے اور ہم اس قابل تھے کہ ان کی باڈی یعنی جسم میں ''چوبھیں'' ہر مقام پر دے سکتے تھے۔ اس غیر فطری محاذ کا دفاع بھارتیوں کیلئے ناممکن تھا تو لیاقت علی کی شہ پر ہمارے انگریزوں نے توپوں کے فائر سے وسط دسمبر 1948ء میں ایک بہت بڑی ''آتش بازی'' کا ڈرامہ کر کے بھارت کے ساتھ فائر بندی کر کے کشمیر کے جہاد کو پکا جمود دے دیا کہ فیصلہ اقوام متحدہ کرے گی۔ وہ قرارداد اتنی مہمل تھی، جس پر آج تک عمل نہ ہو سکا۔ ردعمل کے طور پر جن سینئر افسروں نے اس پر پروٹیسٹ کیا ان میں سے کچھ کو فوج سے نکال دیا اور کچھ کو 1951ء میں راولپنڈی سازش کے مقدمہ میں ''ملوث'' کر دیا اور مجھ جیسے چھوٹے اور جونیئر آدمیوں کو ایڈورس رپورٹ پر رکھ دیا گیا۔

73۔ قارئین اس سلسلہ میری کتابیں پڑھیں کہ کشمیر میں اہم کام کرنے والون جنرل اکبر طارق، بریگیڈیر صدیق ستی اور کرنل حسن مرزا کو سازش میں ملوث کر دیا گیا۔ ایوب خان جو کشمیر میں داخل بھی نہ ہوا تھا اس کو ہلال جرأت سے نواز دیا۔ حیاء الدین جس نے پونچھ میں غداری کی اور شیر علی جس نے آتش بازی کے ڈرامے کی سازش کو پروان چڑھوایا، ان کو بھی ہلال جرأت سے نواز دیا گیا۔ کرنل بعد میں میجر جنرل غلام جیلانی قادیانی، کرنل بعد میں بریگیڈئر وحید حیدر قادیانی، میجر اور بعد میں لیفٹیننٹ جنرل عبدالعلی قادیانی اور کیپٹن صادق قریشی نے جو غداریاں کیں سب کورٹ مارشل کے حق دار تھے۔ ان کو کسی نے پوچھا تک نہیں۔ بریگیڈئیر بعد میں لیفٹیننٹ جنرل مسعود شیخ، کرنل بعد میں میجر جنرل سرفراز، میجر بعد میں بریگیڈئیر قیوم شیر وغیرہ نے بڑی کوتاہیاں کیں اور بڑے نااہل ثابت ہوئے۔ لیکن ان کے خلاف بھی کوئی کاروائی نہ ہوئی کہ ان کو پرموشن مل گئی اور کس کو ترقی دیتے قحط الرجال کی بات تھی۔ البتہ چند جونئیر لوگوں نے بڑے نمایاں کام کیے اور میری کتابوں میں بیسیوں ایسے صاحبان کا ذکر ہے۔ خاص کر میجر افضل، کیپٹن حسین محمد، کیپٹن ظفر اقبال اور کیپٹن محمد سرور جو شہید بھی ہوئے،

اسلام کے عظیم فرزند تھے۔ ایوب خان اپنی کتاب ''فرینڈ زناٹ ماسٹر'' میں تسلیم کرتا ہے کہ کچھ جونیئر لوگوں نے جہاد کشمیر 48-1947ء میں بڑے اہم اور نمایاں کام کیے تو ان کو ان کے قد کے مطابق ''تراش'' دیا گیا۔ اس میں خاص کر کرنل شیر محمد خالد، میجر بعد میں کرنل راجہ عنایت، میجر بعد میں کرنل حفیظ آفریدی کے بارے تو جنرل حبیب اللہ نے ایوب خان کو سفارش کی تھی کہ اگر یہ تین صاحبان بریگیڈیئر کے عہدے کیلئے فٹ نہیں۔ تو ہمیں اپنے اندر جھانکنا چاہیے کہ ہم کیسے جنرل بنے پھرتے ہیں تو جنرل موسیٰ نے ایوب کے ''کان بھرے'' کہ حبیب اللہ فوج میں اپنی مرضی کے آدمیوں کو ترقی دے کر اپنی طاقت مضبوط کرنا چاہتا ہے کہ حکومت پر قبضہ کر لے (توبہ میرے اللہ)۔ کشمیر کے جہاد کے سلسلہ میں سترھویں پنجاب کے کرنل بعد میں بریگیڈیئر نوشیرواں کے ماتحت چنج پہاڑی کی ہماری عظیم فتح اور اکبر خان طارق کی رہنمائی میں گیارھویں بلوچ کے کرنل بعد میں میجر جنرل ملک شیر بہادر کی پانڈو کی فتح کا بھی لیاقت کی سازش سے ہمارے انگریز جنرلوں نے ہمیں کوئی فائدہ نہ اٹھانے دیا۔ قارئین میری کتاب جہاد کشمیر 48-1947ء پڑھیں، جس میں تفصیل ہے۔

74۔ موجودہ مشرف حکومت کا آئینی مشیر شریف الدین پیرزادہ، ضیاء الحق کی حکومت کا بھی کارکن رہا ہے۔ تو میرے چند اخباروں میں مضامین اور تحریریں پڑھ کر 1980ء میں اس نے بھی لیاقت کی قائداعظم کے ساتھ بے وفائی اور کوتاہیوں پر ایک مضمون اخباروں میں لکھ دیا۔ بیگم رعنا لیاقت اس وقت زندہ تھی۔ اس نے شریف الدین کو قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی۔ پیرزادہ میرے پاس آیا۔ میں نے کہا کہ اخباروں میں بیان دے دو کہ اس نے سب کچھ میجر امیر افضل کی وساطت اور مدد سے لکھا ہے اور اب امیر افضل کہتا ہے کہ اس کو بہت خوشی ہوگی کہ یہ سب باتیں کورٹ کے سامنے جائیں کہ اخباریں میجر صاحب کے انکشافات اور حقائق میں کانٹ چھانٹ کر دیتی ہیں۔ کورٹ میں اس کیلئے سنہری موقعہ ہوگا کہ وہ لیاقت کی پوری غداریاں کھل کر بیان کر سکے گا۔ یہ پڑھ کر بیگم لیاقت کو سانپ سونگھ گیا کہ آزادی سے پہلے دہلی

میں میری لیاقت فیملی کے ساتھ ''شناسائی'' تھی۔ میں بیگم لیاقت کی دوسری بہن جوائیشر داس کی بیوی تھی سمیت بیگم لیاقت کے سارے پنڈت خاندان کو جانتا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ایک اور ''ہندوانی'' ارونا اور اس کے خاندان والے بھی مسلمان رہنماؤں کے ساتھ شادی کرتے تھے اور ارونا کانگرسی مسلمان آصف علی کی بیوی تھی۔ چھوٹے ہندو خاندانوں کو ایسی ''اجازت'' تھی۔ لیکن بڑے ہندو خاندانوں کی عورتوں کو صرف مسلمان رہنماؤں پر ''ڈورے ڈالنے'' کی اجازت تھی۔ جیسے نہرو کی بہن وجے لکشمی نے ڈاکٹر سید حسن ایک مسلمان دانشور پر ڈالے اور نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی نے شیخ عبداللہ پر۔ (توبہ میرے اللہ کیسے اسلام دشمنوں کے ساتھ واسطہ ہے) تو ماؤنٹ بیٹن کے حکم پر اور لیاقت کی ''سازش'' یا ملی بھگت سے ہمارے انگریز نوکروں نے کیسے ہمیں دو تہائی کشمیر کے آزاد کردہ علاقوں سے بے دخل کرایا۔ یہ اس کی ایک معمولی جھلکی تھی۔ لیکن وہ لوگ کئی ''میدانوں'' میں یا ''شعبوں'' میں کام کر رہے تھے۔ اب ایک چھوٹی سی کہانی سنیئے۔

75۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد اکتوبر 1947ء میں ہمیں ایک انجینئر یونٹ کے ایک ''ورائٹی شو'' میں مدعو کیا گیا۔ جس کی کمانڈ ایک انگریز میجر کر رہا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ ''شو'' کے خاتمے پر سٹیج پر قائداعظم کا فوٹو رکھا جائے گا اور سب حاضرین کھڑے ہو کر دومنٹ کیلئے قائد کو ''ادب'' پیش کریں گے اور پھر ایسے ہی ہوا۔ ہمارے ردعمل عجیب وغریب تھے۔ کسی نے کہا انگریز قوم کے لوگ بڑے Adjustable یا ''وقتی'' ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ کل یہاں جارج ششم کی تصویر رکھتے تھے آج قائداعظم کی تصویر رکھ رہے ہیں۔ کسی نے کہا کہ یہ انگریز میجر بڑا خوشامد پرست ہے۔ پاکستان میں اپنی نوکری لمبی کرانا چاہتا ہے۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ انگریز قوم کمال ترکی کی طرح قائداعظم کو ہمارا ''باپ'' بنانا چاہتی تھی کہ ہم اس کو حضور پاک ﷺ کی نبوت میں شرکت دیں اور فوج کو ترکی کی فوج کی طرح ''لادین'' بنادیں اور یہ سازش آج بھی جاری ہے۔ مجید

نظامی اسی سازش کی ''کڑی'' ہے یا ''اثرات'' لیے ہوئے ہے۔ اسی کام کیلئے جنرل آصف نواز کو ایوب ثانی بنا کر ہم پر ''مسلط'' کرتا تھا۔ جو ذکر پیراگراف نمبر 20 وغیرہ میں ہو چکا ہے اور اسی سازش کے تحت تجویز بریوو کے تحت پرویز مشرف کو ہم پر براجمان کیا گیا۔ (بحوالہ پیرا گراف 31 وغیرہ)

76۔ ایسے کئی طور طریقوں کے بڑے وسیع پس مناظر میری کتابوں میں بیان ہیں کہ ہمارے انگریز نوکروں میں ایک میجر جنرل کاتھورن تھا۔ جو سہ افواج یعنی بری، بحری اور فضائی افواج کیلئے کراچی میں حکومت پاکستان میں رابطہ کا کام کرتا تھا۔ یہ عاجز اس کو جنگ عظیم دوم سے پہلے کے وقت سے جانتا تھا۔ جب کہ وہ ہمارے سولھویں گروپ میں میجر تھا اور اس کے بعد اس کی ساری نوکری برطانوی خفیہ سروس کی تھی۔ ہمارے ہر انگریز فوجی نوکر کو کہ اس نے کیا کرنا ہوتا تھا، ہدایات اسی جنرل کاتھورن کے ذریعہ سے ملتی تھیں۔ البتہ بریگیڈیئر صدیق ستی کے مطابق لیاقت حکومت کو تمام تر ہدایات برطانیہ کا ہائی کمشنر بھی دیتا تھا۔ یہ جو قائداعظم کے مزار پر Revelie اور Retreate بج رہی ہے یا ہم نے فوج میں انگریزوں کے ماتحت جو کچھ کیا اس کے سو سالے اور برسیاں مناتے ہیں۔ یہ تمام ''طرحین'' وہی ہمارے انگریز نوکر ڈال گئے۔ (کہ شرم تم کو نہیں آتی۔ توبہ میرے اللہ)۔ بہر حال میر جعفر کی اولاد اور ہمارے دفاعی سیکرٹری سکندر مرزا کو اول ''بادشاہ گر'' اور پھر ''بادشاہ'' بنانے کا سارا کام یہ میجر جنرل کاتھورن کر گیا تھا کہ 1951ء میں ریٹائر ہو کر یہ آدمی اسٹریلیا کا شہری بن گیا تھا۔ لیکن 1956ء میں سویز کی مہم میں انگریزوں کی شکست کے بعد پاکستان کی تمام ''ذمہ داری'' امریکن لابی نے سنبھالی تو ان کو کاتھورن کی ''ضرورت'' پڑ گئی۔ تو اسے اسٹریلیا کا ہائی کمشنر بنوا کر پاکستان میں تعین کرایا گیا تھا۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ اکتوبر 1958ء میں جب سکندر مرزا کو قید کر کے پہلے کوئٹہ بھیجا جا رہا تھا۔ تو صرف اسی کاتھورن کو ہوائی اڈہ پر ایوب خان نے سکندر مرزا کے ساتھ ملنے کی اجازت دی تو سکندر مرزا اس پر ''برس'' پڑا تھا اور کہا ''حرامی کہیں کے تم نے

مجھے پہلے کیوں نہ بتا دیا کہ میں اب نمبر One نہیں رہا۔'' تو کاتھورن نے کہا ''الیگزینڈر! میں بالکل اندھیرے میں ہوں'' واللہ اعلم! اس میں کتنا سچ تھا۔ ایوب خان کو اوپر لانے کی کہانی آگے پیراگراف نمبر 80 اور 81 وغیرہ میں آ رہی ہے۔ کون کہتا ہے ہم آزاد ہیں؟ اب بھی ہمیں ''احکام'' لندن اور واشنگٹن یا چھپے ہاتھ دیتے ہیں۔

77۔ لیاقت علی نے مغربی لابی کا ہر حکم مانا۔ لیکن چھپے ہاتھوں کو ایک آمر کی ضرورت تھی۔ جس کیلئے ایوب خان کو کب سے ''تیار'' کیا جا رہا تھا۔ درمیان میں غلام محمد اور سکندر مرزا کو لا کر ہمارے فصلی بٹیرے سیاستدانوں کو تگڑم ناچ نچا کر ہمارے عوام کے ذہنوں کو ماؤف کرنا تھا کہ ہم فضول بحث مباحثہ میں پڑ کر اپنے اصلی مقاصد اسلام کی طرف نہ آئیں۔ پھر لیاقت علی کو قتل کرا کے اس کو ''شہید'' بنانا تھا جیسے بعد میں بھٹو کو پھانسی چڑھوا کر ''شہید'' بنوایا گیا اور اب بینظیر کو قتل کرا کے اس کو بھی ''شہید'' بنا دیا گیا ہے کہ کوئی ان کی ''کارکردگیوں'' کے کھوج کی کوشش نہ کرے کہ اندر سے یہ سچ بھی نہ ظاہر ہو جائے کہ وہ لوگ اہل مغرب کے خاص ''مہرے'' تھے۔ لیاقت کی موت کے بعد یہ مشہور کر دیا کہ اس کا بینک بیلنس Nil تھا۔ توبہ میرے اللہ۔ لیاقت کے بیٹے اشرف نے جو اس زمانے میں لاکھوں (آج کل کے کروڑوں) خرچ کر کے جو گوا کی ایک ''حسینہ'' سے شادی کی وہ دولت کہاں سے آئی؟ بعد میں وہ حسینہ دولت کا بڑا حصہ لے کر ''غائب'' بھی ہو گئی تھی یا لیاقت کے بڑے بیٹے ولایت علی نے پنجاب میں جو ہندو ساہوکاروں کی دولتوں کے انباروں سے فائدہ اٹھایا یا لیاقت علی کا ایک معمولی کاردار اپنے بیٹے کو ''سردار امیر اعظم'' کے طور وزیر اور کروڑ پتی بنا گیا۔ اسی دولت میں تو ایوب خان کو مسٹر شعیب کے ذریعہ سے ''ڈبو'' دیا گیا۔ سیاست اور حکومت سونے کی کانیں ہیں اور یہی ہمارا بڑا المیہ ہے۔

78۔ ایوب خان کو پہلی دفعہ اس عاجز نے 1940ء میں سکندر آباد میں دیکھا کہ وہ موجودہ پانچویں پنجاب میں کیپٹن تھا اور انہی دنوں میجر بن کر کسی سٹاف پر تبدیل ہو گیا۔ دوسری دفعہ برہما محاذ

پر دریائے چندون کے نزدیک، جب اس کے ڈویژن کمانڈر نے اس کو پلٹن کی کمانڈ کیلئے Unfit قرار دے کر کرنل سے میجر بنا دیا۔ میں اس علاقے کی فلمیں کلکتہ بھیجنے کیلئے اپنی جیپ میں انفال جا رہا تھا اور میں نے ایوب خان کو اپنی جیپ میں ''لفٹ'' دی تھی کہ وہ براستہ کلکتہ دہلی جا رہا تھا۔ جب وہ دہلی جی ایچ کیو میں پہنچا تو وہاں اس کو ایک دوسرے درجہ کی گیرزن ڈیوٹیاں دینے والی پلٹن کی کمانڈ دے کر پھر کرنل بنا دیا گیا۔ اوپر سے یا برٹش خفیہ سروس سے کوئی ہدایت تھی کہ انہوں نے ابھی ایوب خان سے ''کئی کام'' لینے ہیں۔ لیکن جنگ کے محاذ کی خراب رپورٹ کی وجہ سے ایوب خان کو بریگیڈیئر نہ بنایا گیا اور 1947ء تک اس سے کئی جونیئر بریگیڈیئر بن چکے تھے۔ البتہ پاکستان بننے سے اس کی قسمت کھل گئی کہ اس کو بریگیڈیئر بنا کر باؤنڈری فورس میں پاکستان کا نمائندہ بنا کر ہم پر ''مڑھ'' دیا۔ اس اہم کام میں اپنی ''عیاشی'' اور ''شراب نوشی'' میں دھت رہنے کی وجہ سے ایوب جو نا کام ہوا اور مسلمانوں کو وہ قتل عام سے نہ بچا سکا اور اخباروں میں اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھا گیا تھا۔ اس کو تبدیل کر کے اس کی جگہ بریگیڈیئر نذیر احمد قادیانی کو متعین کیا۔ جس نے بھی زیادہ زور یا مدد قادیانیوں کو قادیان سے باحفاظت نکالنے پر کی۔ اپنی قسمت کہ ہمیں کیسے لوگ ملے کہ ایوب، یحیٰ خان اور اس کے ٹولہ سے زیادہ ''عیاش'' تھا لیکن ان کی طرح بر سر عام بے حیائی کی بجائے ایسی عیاشی ''پوشیدگی'' میں کرتا تھا۔ بہر حال اس کی ''نا اہلی'' اور ناکامی کی وجہ سے اس کا میجر جنرل بننے کا نمبر بھی کاٹ دیا گیا اور ایک دفعہ تو اس سے جونیئر نذیر احمد قادیانی اور افتخار خان کو ایوب سے پہلے میجر جنرل بنا دیا گیا۔ لیکن انگریز خفیہ سروس والے ایوب سے کچھ کام لینا چاہتے تھے۔ مشرقی پاکستان میں دو نامکمل بریگیڈوں والے ایک چھوٹے سے ڈویژن کی کمانڈ دے کر 1948ء کے آخر میں ایوب خان کو بھی ہمارے انگریز جنرلوں نے لیاقت حکومت سے میجر جنرل بنوا لیا اور 1949ء کے آخر اس کی تبدیلی جی ایچ کیو راولپنڈی میں ایجوٹینٹ جنرل کے طور پر ہو گئی۔ مارچ 1950ء میں ISPR کی طرف سے یہ عاجز ایوب خان کے

ساتھ جہلم گیا۔ جہاں ایوب نے چودھویں پنجاب سنٹر میں ایک مسجد کی بنیاد رکھنا تھی۔ تو سنٹر کمانڈر کرنل سٹک لینڈ جو جنرل گریسی کا خاص آدمی تھا اس نے مجھے ''پوشیدگی'' میں بتایا کہ یہی ایوب خان ہماری بری افواج کا پہلا پاکستانی سربراہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں انگریز جنرلوں کی جس دوسرے آدمی پر ''نگاہ'' تھی وہ دوتکمیوں والا افتخار خان تھا۔ جس کے سیالکوٹ کے مجاہدین پر جھاڑو پھیرنے کا ذکر پیراگراف نمبر 69 میں ہو چکا ہے۔ اس شخص کو اس عاجز نے جنوری 1947ء میں دہلی میں میجر کے طور پر دیکھا اور جنوری 1948ء میں یہ آدمی میجر جنرل اور لاہور کا ڈویژن کمانڈر تھا۔ ایوب خان میں تو پھر بھی ظاہراً کچھ اسلامی رکھ رکھاؤ تھا۔ اس آدمی کی بیوی بھی غیر مسلم تھی اور جونیئر لوگوں کے ساتھ بہت بدتمیزی سے پیش آتا تھا تو یہ ایوب سے بھی بدتر ثابت ہوتا۔ باقیوں میں نذیر قادیانی اور رضا صاحب پس ''گزارہ'' ہی تھے۔ صرف افتخار کا بڑا بھائی بابا اکبر کچھ بہتر آدمی تھا۔ لیکن محدود علم اور تدبر کا حامل تھا۔ گو ''رنگروٹ'' کا نام اپنا کر وہ کئی کتابیں بھی لکھ گیا۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی کہ ہمیں کیسے سربراہ ملے۔ تفصیل میری دوسری کتابوں میں ہے۔

79۔ بہرحال جنوری 1951 میں ایوب خان بری افواج کا پہلا پاکستانی سربراہ بن گیا۔ جو بڑے ہی اوسط درجے کے علم اور تدبر کا حامل تھا۔ گو انگریزی بڑی اچھی بول لیتا تھا اور یہی اس زمانے کی بڑی ''ضرورت'' تھی۔ لیکن فوج بری حالت میں تھی۔ جو ٹوٹا پھوٹا سامان انگریز ہمیں دے گئے تھے وہ اور پرانا ہو گیا تھا۔ گاڑیوں کو ہم دھکے لگا کر صرف انتظامی ضرورت کیلئے استعمال کرتے تھے۔ بکتر بند گاڑیوں کو چلاتے بھی بہت کم تھے۔ کہ وہ جواب نہ دے جائیں۔ ملک میں کوئی کارخانہ نہ تھا۔ زرعی زمین ایسے لوگوں کو دے دی جن کو زمین سے اناج حاصل کرنے کی شدبد نہ تھی۔ ہتھیاروں کیلئے واہ کے مقام پر ایک ''کارخانہ'' ابتدائی حدیں طے کر رہا تھا۔ انگریز نے ہمیں پرانی مشینیں دیں اور یہ ایک ''سفید ہاتھی'' بنا ہوا تھا، 1960ء تک رائفل کو صاف کرنے والی ''چندی'' بھارت سے آتی رہی۔ تو ہم خوشامد کی حد تک جا کر

امریکیوں کے ''پروردہ'' بننے کو تیار تھے کہ شاید کچھ فوجی سامان مل جائے۔ لیکن امریکیوں کی اپنی پالیسی تھی کہ 1949 میں چین میں بھی کمیونسٹ پارٹی برسراقتدار آ گئی، روس نے بھی ایٹمی دھماکہ کر دیا تھا۔ تو اینگلو امریکن بلاک بھارت، پاکستان، افغانستان، ایران اور عراق و ترکی تمام ممالک کو Eisenhower Doctrine کے تحت اکٹھا ایک Block بنانا چاہتے تھے۔ پہلے 1950ء میں شاہ ایران کو پاکستان بھیجا اور عراق و ترکی سے کئی وفود پاکستان آئے۔ لیکن مارچ 1954ء میں عراق کے نوجوان بادشاہ فیصل اور اس کے ماموں شہزادہ عبدالھا جو عملی طور پر عراق کا حکمران تھا۔ ان کو خاص طور پر پاکستان بھیجا۔ لیکن اس سارے وفد میں اہم آدمی نوری السعید تھا، جس کو ہم اخباری لوگ 43-1942ء سے جانتے تھے۔ وہی عراق کا ''بادشاہ گر'' تھا کہ مغربی لابی کا خاص الخاص آدمی تھا۔ جنگ عظیم اول میں عثمانیہ حکمرانوں سے غداری کر کے کمال ترکی کی طرح عرب دنیا میں مسلمانوں کے اندر سے روح محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نکالنے میں مصروف تھا۔ اس کی بیوی یہودی تھی اور 1958ء میں بریگیڈیئر قاسم اور کرنل عارف کی فوجی کاروائی کے تحت شاہی خاندان کے ساتھ اپنے ''انجام'' کو پہنچ گیا تھا۔ تو اس وفد نے صوبائی دارالحکومتوں کے علاوہ پشاور سے لاہور جاتے راولپنڈی جی ایچ کیو میں بھی ایک دن کے لئے رک کر دوپہر کا کھانا ایوب خان کے ساتھ کھانا تھا۔ ظاہر ہے کہ وفد کے ساتھ سفر کرنے والے ہم اخباری لوگوں کو معلوم تھا کہ نوری السعید ایوب خان کو ''پرکھنے'' آ رہا تھا کہ دیکھئے ایوب کا اپنے ماتحتوں میں کیا ''مقام'' ہے۔ مغربی لابی اس پر کتنا ''بھروسہ'' کر سکتی ہے یا کیا ''استعمال'' کر سکتی ہے۔ اس وفد کے ساتھ حکومت پاکستان کا گھاگ سیاسی وزیر مشتاق گورمانی بھی سفر کر رہا تھا۔ جس کو ہم اخبار نویس ''نوری السعید آف پاکستان'' کا نام دیئے ہوئے تھے اور نوری السعید کو ''گورمانی آف عراق''۔

-80 جب ہم راولپنڈی ریلوے سٹیشن پر اترے تو ایوب خان کا پرائیویٹ سیکرٹری کرنل بعد میں جنرل محمد شریف مجھے کہہ گیا کہ میں کھانے سے پہلے ایوب ہاؤس پہنچ جاؤں کہ میرے کچھ

مشوروں کی ضرورت ہوگی۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ''کھڑے لنچ'' کا بندوبست تھا اور چار کرسیاں رکھی تھیں۔ دو بادشاہ اور اس کے ماموں کیلئے اور ایک ایک ایوب اور گورمانی کیلئے۔ اس عاجز نے گزارش کی کہ پانچ کرسیاں رکھ لو کہ ایک نوری السعید کو بھی دینا پڑے گی۔ ایوب خان نے کہا وہ کون ہے؟ عرض کی ''عراق کا بادشاہ گر''۔ ایوب خان نے پوچھا کہ پروٹوکول لسٹ میں کون سے نمبر پر ہے۔ عرض کی ''وہ صرف سینٹر ہے اور اس کے چنے ہوئے پروردے فاضل جمالی وغیرہ وزیراعظم اور وزیر، پروٹوکول میں اس سے اوپر ہیں اور وہ شاید ''ساتویں'' نمبر پر ہے۔ ایوب خان نے کہا رہنے دو صرف چار کرسیاں ''کافی'' ہیں۔ جب مہمان آئے تو گورمانی نے اپنی کرسی نوری السعید کو دے دی اور ایوب کو اپنی کرسی گورمانی کو دینا پڑی۔ لیکن میں نے پوشیدگی میں پانچویں کرسی کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ میرے اشارہ پر ایوب کے اے ڈی سی رسالدار میجر گاہی خان نے پانچویں کرسی آ کر مجھے دی جو میں نے ایوب خان کو دے دی، جو کچھ ''مرعوب'' ضرور ہوا۔ قارئین یہ کہانی لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ایوب خاں کو تاریخ عالم کی بھی زیادہ شدبد نہ تھی اور بین الاقوامی معاملات کو بھی وہ اتنا نہ سمجھتا تھا۔ اس کو مطالعہ کا شوق بھی نہ تھا۔ اس کی بیوی گھریلو پردہ نشین عورت تھی اور بے پردہ عورتوں کی ایوب کے ہاں آمد کی بھی وہ زیادہ پراہ نہ کرتی تھیں اور ایوب زیادہ وقت گالف کھیلنے پر صرف کرتا تھا۔ یہی اس کی ''ورزش'' تھی اور اس کی شراب نوشی بھی ''محتاط'' اور ''محدود'' تھی۔ وقت پر سوتا اور وقت پر جاگتا تھا، یحییٰ کی طرح نہ شراب میں زیادہ ''دھت'' ہوتا تھا نہ یحییٰ کی طرح کام میں ''کوتاہی کرتا تھا۔ مغربی لابی کیلئے ان حالات میں بڑا ''موزوں'' آدمی تھا کہ ان کی ہر بات کو بسر وچشم مانتا تھا۔ اور ظاہر ہے نوری السعید نے ایوب کی بڑی اچھی رپورٹ دی ہوگی۔

لاہور سے باقی وفد کو چھوڑ کر نوری السعید دہلی چلا گیا اور جواہر لعل نہرو پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی، جس نے اس کو ''گھاس'' نہ ڈالی کہ وہ اتنے مسلمان ممالک کے ساتھ کسی اتحاد میں ''بندھنے'' کو تیار نہ تھا۔ جہاں اس کی حیثیت ثانوی ہو جاتی۔ وہ خفیہ طور پر علیحدگی میں

1949-50ء میں امریکہ والوں کے ساتھ جو معاہدہ کر آیا تھا۔ اس میں وہ کوئی ''اضافہ'' نہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن افسوس ہماری نااہلی پر کہ ہمیں اس سلسلہ میں 1962ء میں ''آ گاہی'' ہوئی جب چین اور بھارت میں سرحدی ٹکراؤ ہوا۔

81۔ ہمارے ہاں البتہ ایوب کی اہمیت کو بہت بڑھایا جا رہا تھا کہ جلد اس کو وردی میں رہتے وزیر دفاع بنا دیا گیا اور جب کراچی سے پنڈی پہنچا تو سارا جی ایچ کیو چک لالہ ہوائی اڈہ پر اس کو خوش آمدید کہنے کے لئے موجود تھا۔ دوسرے دن ایوب خان نے اپنی تقریر میں ہمیں جو کچھ بتایا اس سے ظاہر تھا کہ اب ایوب اور سکندر مرزا اس ملک کے ''بادشاہ گر'' ہیں۔ لیکن خبردار جونیئر لوگ سیاست سے دور رہیں۔ لیکن نومبر 1954ء میں یہ عاجز جب میجر ابن الحسن کے ساتھ کچھ غیر ملکی مہمانوں کی آمد کے سلسلہ میں کراچی گیا۔ تو وہاں میر علی احمد تالپور نے میرے لئے ایک کتاب ''کھول'' دی۔ وہ ان دنوں میں ''بے روزگار'' تھا۔ تو زیادہ وقت زیلن کافی ہاؤس میں اخبار نویسوں کی ''میزبانی'' میں گزارتا تھا۔ ہم بھی اخبار نویسوں کو ہیلو ہیلو کرنے وہاں پہنچ گئے۔ تو میر صاحب نے ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی (یعنی فوج) کے ممبر ہونے کے الفاظ سے ہماری ''سواگت'' کی۔ میر صاحب سے جب ان کی سیاسی پارٹی کے بارے پوچھا تو فرمانے لگے۔ ''وہ تو سلطانی پارٹی کے ممبر ہیں اور ہمیشہ اسی کے ممبر رہیں گے اور ابا مرحوم ایسی ہی نصیحت فرما گئے تھے'' مزید فرمایا: یہ پاکستان اینگلو امریکن لوگوں کی ''جائیداد'' ہے اور تعلقات کے لئے کوئی لفظ گھڑ لو ''سینٹو'' یا ''گھیٹو''۔ تو اس کے بعد میر صاحب کو جلد ''نوکری'' بھی مل گئی اور ایوب خان کے زمانے سے ان کے خاندان کی ''پانچوں انگلیاں'' گھی میں رہتی ہیں۔ بھٹو کے زمانے میں ان کا چھوٹا بھائی رسول بخش سندھ کا گورنر تھا۔ اور خود میر صاحب ضیاء الحق کے زمانے میں وزیر دفاع تھے۔ یہ ہے کافرانہ جمہوری سیاست کی ایک جھلک کہ آج بھی فوج ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی ہے اور سلطانی پارٹی اس کی مدد کے لئے موجود ہوتی ہے اور مجید نظامی اسی سیاست کا سب سے بڑ

علمبردار ہے۔ ہمارے ضلع سرگودھا میں ایک خداداد لک ہوتے تھے، جو ہمیشہ اس پارٹی میں چلے جاتے تھے جو حکمران ہوتی تھی۔ کسی نے ایسی ''تبدیلی'' پر طعنہ زنی کی تو کہنے لگا کہ وہ تو ''تبدیل'' نہیں ہوتے پارٹی ''تبدیل'' ہو جاتی ہے۔ یہ ہے ہمارا کردار اس کافرانہ سیاسی نظام میں جس کی مزید وضاحت پیراگراف نمبر 129 اور اس کے اگلے پیراگرافس وغیرہ میں ہے۔

82۔ تو فوج کی سربراہی ملنے کے بعد ایوب کو حیران کن اہمیت حاصل ہو رہی تھی۔ نواب کالاباغ کئی دفعہ شکار کیلئے اس کی ''میزبانی'' کرتا تھا اور اس کو باور کراتا تھا کہ اس ملک کو ہمارے یہ فصلی بیڑے سیاستدان نہیں چلا سکتے۔ یہ ملک فوج کو اور ایوب کو سنبھالنا ہوگا۔ لیکن سب سے زیادہ حیران کن پرنس کریم آغا کے دادا بڑے آغا خان کی دعوت تھی۔ اس سلسلہ میں اخباروں میں تو کچھ شائع نہ ہوا۔ لیکن ہم ایوب کے نزدیک سٹاف والوں نے ایوب سے اس سلسلہ میں بہت کچھ سنا۔ آغا خان بھی مغربی لابی کا آدمی تھا۔ لیکن وہ ایک مدبر مسلمان بھی تھا اور اس کو تاریخ عالم یا بین الاقوامی واقعات کی بڑی شدبد تھی۔ اسمٰعیلی گروہ کے حاضر امام ہونے اور اس سلسلہ میں اپنی ''روحانی طاقتوں'' پر اس کو کتنا یقین تھا یا وہ اس کو ایک ''وقتی'' لبادے کے طور پر نبھا رہا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کافی ادھیڑ عمر میں پہنچنے کے بعد اس نے ایک بے پردہ فرانسیسی لیڈی سے بھی شادی کی ہوئی تھی۔ ایوب وسط 1954ء میں جب لندن گیا تو وہ واپسی پر اس نے ترکی بھی جانا تھا کہ آغا خان کی طرف سے دعوت ملی کہ ترکی جاتے ہوئے ایوب چند دن آغا خان کے پاس جنیوا میں قیام کرے۔ یہ کچھ آغا خان مغربی لابی کے ''احکام'' کے طور پر کر رہا تھا یا اس غلط فہمی میں تھا کہ ہر مسلمان جنرل خالد رضی اللہ عنہ بن ولید یا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح بن سکتا ہے۔ ایوب نے نئے اسلامی ملک پاکستان میں کچھ اچھی روایات قائم کرنا تھیں۔ بہر حال ایوب کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں کے درمیان مختلف اور بہت ''پہلوؤں'' پر بات چیت ہوتی رہی۔ شاید آغا خان نے ایوب کو باور کرایا کہ

اس نے پاکستان میں اہم کام کرنے ہیں یا کیا کیا نصیحتیں کیں اور کیا ایوب ان باتوں کو سمجھنے کی ''اہلیت'' بھی رکھتا تھا یا نہیں اور اس نے آغا خان کو ''مایوس'' کیا۔ لیکن باتیں اتنی تفصیلی تھیں کہ آغا خان نے ایوب کو یہ بھی کہہ دیا کہ ترکی والوں کو سمجھانا کہ ''خدارا اس گیلی پولی کی معمولی کارروائی کے چکر سے نکلو اور سلطنت عثمانیہ کی اور اسلام کی عظیم خدمات پر زیادہ محنت کرو۔'' ایوب اپنے واجبی علم کی وجہ سے اس نصیحت کو سمجھ بھی سکا یا نہ۔ اس زمانے میں اسلام کے عظیم فرزند عدنان مندریس شہید ترکی کے وزیر اعظم تھے اور وہ خود کمال ترکی کے ''بت'' کو توڑنے اور گیلی پولی کی کارروائی کو ''دفن'' کرنے کی تجویزیں بنا رہے تھے۔ ایوب نے کسی بے دین جنرل کے ساتھ یہ بات کن یا کیسے الفاظ میں کی، نتائج تو بڑے خراب نکلے کہ ترکی کی بے دین فوج نے عدنان مندریس کو پھانسی چڑھا دیا۔ بہر حال ایوب خان نے ایک دفعہ ہمیں بتایا تھا کہ آغا خان کے ساتھ گیلی پولی کے ''ڈرامے'' کی بات بھی ہوئی تھی۔ آغا خان کے ساتھ اپنی اس ملاقات کے بعد ایوب نے خود کو یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ وہ کوئی بڑا اہم اور مدبر انسان ہے کیونکہ اس کو ہر ''میدان'' میں کامیابیاں ہو رہی تھیں۔

83۔ گو سکندر مرزا، ملک کا صدر بن چکا تھا۔ لیکن اس عاجز کو 1956ء میں خانگی ہیڈ ورکس پر ایک جنگی مشق میں واضح ہو گیا تھا کہ امریکہ والے سکندر مرزا کی بجائے اپنا سب کچھ ایوب کے ''پلڑے'' میں ڈال چکے ہیں۔ سکندر مرزا اپنے ہم عقیدہ کموڈور رضا کو فضائی فوج کا سربراہ بنانا چاہتا تھا۔ یہ امریکہ کی پالیسی کے مطابق صحیح نہ تھا کہ سکندر مرزا، ایران اور پاکستان کی کنفڈریشن کے تحت شاہ رضا کو دونوں ملکوں کا شہنشاہ اور خود وزیر اعظم بننا چاہتا تھا۔ امریکہ والے مسلمان ملکوں کے اتحاد کو دل سے پسند نہیں کرتے۔ اس لئے امریکہ والوں نے جنرل جارج ڈیکر کو ہماری جنگی مشق میں بھیج کر ہماری فضائی فوج کی سربراہی ایوب خان کے ''چنیدہ'' کموڈور اصغر خان کو دلا دی۔ اس کے بعد سے آج تک اصغر خان نے ہر ''عمل'' امریکیوں کی ہدایت پر کیا۔ خواہ یہ 1958ء میں سکندر مرزا کی مخالفت اور ایوب کی مدد تھی یا

1968 میں بھٹو کی مدد کے طور پر ایوب کی مخالفت تھی یا 1977ء میں بھٹو کے خلاف ''تحریک'' تھی اور کئی دفعہ امریکہ والوں کی تجویز ''بریو'' کے تحت حکومت کا ''تاج'' اس کے سر پر رکھنا زیرِ غور آیا۔ لیکن ''نوبت'' وہاں تک نہ پہنچی۔ یاد رکھیں کہ امریکہ والوں کے کئی ''گھوڑے'' میدان میں ہوتے ہیں۔ اور ''تخت'' صرف ان کی مرضی سے حاصل ہوتا ہے گو بعد میں بھٹو کی طرح ''تختہ'' پر بھی جانا پڑتا ہے۔ کیا بے نظیر کو معلوم نہ تھا کہ اس کے باپ کو ''تختہ'' پر امریکیوں نے چڑھایا۔ لیکن وہ ''تخت'' حاصل کرنے کے لئے امریکہ کی پروردہ بنی ہوئی تھی۔ فطرت نے بھٹو خاندان سے کیا کچھ کیا۔ توبہ میرے اللہ۔ اور یہ عاجز اپنی کتابوں میں خوب طور واضح کر چکا ہے کہ قوم بھٹو خاندان سے کبھی کسی خیر کی توقع نہ رکھے۔

84۔ بہر حال ایوب کے مضمون کی طرف واپس لوٹتے ہیں۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ایوب کو آمر بنانے کے لئے اور پاکستان کی حکومت کو پاکستان کی بری فوج کے سربراہ کے ''محور'' کے گرد گھمانے کے لئے تمام سیاسی ادارے ''پامال'' کئے جا رہے تھے کیونکہ آمر کو لانے سے پہلے یہ ''عمل'' ضروری ہوتا ہے۔ قارئین خود سوچ لیں کہ اب مشرف کے زمانے تک تو تمام سیاسی یا غیر سیاسی ادارے تباہ ہو چکے ہیں اور آئندہ یہ ملک ہمیشہ کسی آمر کے تحت چلے گا۔ ایک لحاظ سے یہ فطرت کی بھی ''ضرورت'' ہے کہ یہ کافرانہ سیاسی ادارے اور ان کے کرتا دھرتا جو اللہ تعالیٰ کے ''شریک'' بنے ہوئے ہیں ان کا ایسا ''حشر'' ضروری ہے جو وضاحت پیرا نمبر 132 وغیرہ میں آ رہی ہے۔ چنانچہ پہلے دو بنگالیوں ناظم الدین اور محمد علی کو ''کٹھ پتلی'' وزیر اعظم بنا کر اور ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے پھینک دیا گیا۔ پھر ایک سویلین بیوروکریٹ چوہدری محمد علی سے ایک کافرانہ آئین بنوا کر اسے خود کو اس قانون اور آئین کا پہلا ہدف یا Casualty بنایا گیا۔ پھر پاکستان کے ''بانیوں'' میں سے تین سیاستدانوں سہروردی، چندریگر اور فیروز خان نون کو باری باری وزیر اعظم بنا کر بے عزتی سے برخاست کر دیا۔ تو اکتوبر 1958ء میں ایوب خان کو اینگلو امریکن لابی کے ''وائسرائے'' کے طور پر ہم پر پکے طور

پر ''مسلط'' کر دیا گیا۔ ہماری کم علم قوم نے جو ایوب خان کے مدبر ہونے کے یا مالی معاملات اور بین الاقوامی ماہر ہونے کے گیت گائے یا کچھ لوگوں نے روحانی طور پر اس کو جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے خاص تعلق کے ''شوشے'' چھوڑے یا پیر علی محمد راشدی نے اسے پاکستان کا بادشاہ بنانے کی تجویز دی۔ یہ عاجز ایسی باتیں پڑھ کر کبھی ہنس پڑتا تھا اور کبھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا تھا۔ اس لئے یہ پس مناظر قوم کے سامنے پیش کئے کہ بے چارہ ایوب کیا تھا اور اوسط درجہ سے بھی کم ذہن کا حامل تھا کہ اس عاجز نے اس کو بہت نزدیک سے دیکھا تھا۔ اس سلسلہ کی کچھ اور باتیں سنیئے۔

85۔ انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں انگریز کی فوج میں رسالہ کی نوکری بڑی غیرت کی نوکری سمجھی جاتی تھی کہ لوگ دو سو روپے ادا کر کے ''سلید ار'' کے طور پر بھرتی ہو جاتے تھے۔ جہاں ایک گھوڑا اور سائیس پکے طور پر مل جاتے تھے اور چھٹی آتے تھے تو چھاؤنی اگر گھر سے نزدیک ہوتی تو گھوڑا اور سائیس بھی ساتھ لے آتے تھے اور گھوڑے پر خرچ کا الاؤنس ملتا تھا۔ لیکن ایوب خان کے باپ کے پاس پیسے نہ ہونے کی وجہ سے وہ 1885ء کے قریب ہڈسن ہارس میں Trumpter (بگلر) کے طور پر بھرتی ہوا اور بعد میں ''سلید ار'' کے عہدہ پر ترقی کی تھی۔ جنگ عظیم اول سے تھوڑا پہلے ''رسالدار'' کے طور پر ریٹائر ہوا تھا اس نے بچوں کو اچھی تعلیم دلوائی کہ ایوب خان نے علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ دوسرے بیٹے سردار بہادر نے صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کی کہ ہمارے چودھویں سنٹر فیروز پور میں سپاہی کے طور پر بھرتی ہو گیا کہ اس طرح بھی فوج میں کمیشن مل جاتا تھا۔ لیکن وہ لانس نائیکی سے اوپر نہ جا سکا تو فوج چھوڑ دی اور سیاست میں جا کر کانگریس میں شمولیت کر لی۔ اس زمانے فوج کا سربراہ فیلڈ مارشل برڈ ووڈ تھا۔ اس نے کیپٹن ایوب کی سفارش پر سردار بہادر کے لئے کچھ وظیفہ کا بندوبست کر کے سردار بہادر کو خاص سفارش سے زیادہ عمر کے باوجود علی گڑھ میں داخلہ دلا دیا۔ تو وہاں تعلیم کی وجہ سے تعلیم کے بعد سردار بہادر مسلم لیگ میں آ گیا۔ ہزارہ ضلع کے باقی

مسلم لیگی یا باقی سارے سرحد کے مسلم لیگی نے۔ پڑھے لکھے نہ تھے تو 1946ء میں انگریزوں نے جو آئین ساز اسمبلی بنائی، سردار بہادر صوبہ سرحد سے اس میں واحد مسلم لیگی ممبر تھا اور کوتاہیوں کے باجود ایوب کو جو میجر جنرل بنادیا گیا، اس کا سیاسی پس منظر بھی ہے۔

86۔ ایوب کے تیسرے بھائی سلطان خان نے ایم بی بی ایس کر کے فوج میں شمولیت حاصل کر لی تھی اور 1952ء میں وہ میجر تھا کہ یونٹ فنڈ سے بیس ہزار روپے نکلوا کر جوئے میں ہار گیا۔ اس زمانے میں کچھ رکھ رکھاؤ بھی تھا اور یہ رقم بہت بڑی رقم تھی۔ لیکن ایوب خان نے اپنی عزت کے لئے یہ پیسے اپنی جیب سے ادا کر دیئے اور بھائی کی فوج سے ''چھٹی'' کروادی۔ لیکن ایوب کو یہ رقم اپنے ایک پلٹن وال بریگیڈیئر محمد زمان (جنرل آصف نواز کے چچا اور بیٹے کی طرح پرورش کرنے والے) سے ادھار لینا پڑی۔ ایوب کے مالی حالات درست کرنے کے لئے، جیسے پہلے لکھا جا چکا ہے کہ کشمیر میں داخل نہ ہونے کے باوجود اس کو ہلال جرات کے تمغہ سے نواز دیا گیا تھا۔ اس کو دو مربع زمین عطا ہو گئے، لیکن ایوب کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ ٹریکٹر خرید کر زمین کو آباد کرتا تو اس نے زمین ''بٹائی'' پر دی ہوئی تھی۔ 1956ء میں ہمارا چودھواں سنٹر، پنجاب سنٹر کا حصہ بننے کے لئے جب جہلم سے مردان چلا گیا تو باغیچہ فنڈ سے خریدا ہوا ٹریکٹر آدھی قیمت پر ایوب کو دے دیا تو اس پر کچھ افسران ''معترض'' ہوئے تھے۔ جنوری 1958ء تک ایوب خان کی مالی حالت کوئی بہتر نہ ہوئی تھی کہ اس کا بڑا بیٹا اختر ایوب موجودہ ساتویں پنجاب میں میرے ماتحت ٹل چھاؤنی میں کمپنی افسر تھا۔ وہ کوئٹہ کورس پر جا رہا تھا۔ جب ایوب گھر نہ ہوتا تھا تو والدہ صاحبہ کے ساتھ رات کو فون سے رابطہ باندھ کر بار بار گزارش کرتا تھا کہ ''خان جی'' (ایوب کے بیٹے اپنے والد کو اس نام سے پکارتے تھے) اس کو ایک موٹر سائیکل لے دیں۔ تو ایوب نے دوسرے بیٹے گوہر ایوب کو بھی اسی کورس پر بھجوانے کا بندوبست کرایا اور کراچی سے ایک سیکنڈ ہنڈ موٹر سائیکل خرید کر گوہر ایوب کے حوالے کیا کہ دونوں بھائی کورس پر اس موٹر سائیکل پر ''گزارہ'' کریں۔ لیکن جولائی

1962ء میں جب یہ عاجز موجودہ سولہویں پنجاب کے ساتھ راولپنڈی صدر ہاؤس پر متعین ہوا تو گوہر ایوب قومی اسمبلی کا ممبر بن چکا تھا اور اختر ایوب صوبائی اسمبلی کا۔ میں نے اکتوبر 1958ء میں اختر ایوب کو جو سپاہی مرزا خان اردلی کے طور پر دیا تھا وہ بھی فوج چھوڑ کر صدر ہاؤس میں کسی اعلیٰ عہدہ پر متعین ہو گیا تھا۔ وہ اپنی کار میں مجھے ملنے آیا میرا تو اس وقت بھی سائیکل پر گزارا تھا۔

87۔ قارئین! یہ سب ایوب خان کے وزیر خزانہ مسٹر شعیب اور ایوب خان کے خاص مشیروں غلام کذاب کے پوتے ایم ایم احمد اور لاہوری قادیانی فاروقی جیسے لوگوں کی ''کارستانیاں'' ہیں کہ ہم لوگ دولت میں ڈوبتے جاتے ہیں۔ شعیب کی ایک بیٹی اقوام متحدہ کے اعلیٰ عہدیدار کے طور پر پاکستان آتی رہتی ہے کہ دولت کی ریل پیل پوری قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ 1962ء میں میجر اختر عبدالرحمٰن بھی ہماری طرح سائیکل پر ''گزارہ'' کرتا تھا، بعد میں ISI کا سربراہ اور جوائنٹ چیف بھی رہا۔ بھٹو کا ایک پروردہ صادق قریشی اپنا ایک کارخانہ صرف نقد پیسے وصول کرنے کے بعد بیچنا چاہتا تھا، تو اختر عبدالرحمٰن کے بیٹوں نے کروڑوں نقد (Cash) چند لمحوں میں پوری کر دی۔ جنگ کا خلیل الرحمٰن بھی آزادی سے پہلے دہلی میں ہماری طرح سائیکل پر ہوتا تھا۔ پاکستان میں جب وہ کروڑوں کا مالک بن گیا، تو میں نے ایک دن کہا کہ اتنا کچھ کما لینے کے بعد اخبار میں اب ان ''بے حیائیوں'' اور ''گمراہیوں'' کو تو بند کرو۔ کہنے لگا ''ملک صاحب! دوکاندار ہوں حلال بھی بیچتا ہوں اور حرام یا سور بھی، زیادہ لوگوں کو حرام پسند ہے۔'' لیکن مجید نظامی یہ نہیں مانتا، وہ قوم کا ''رہنما'' اور نظریہ پاکستان کا ''محافظ'' بنا ہوا ہے۔ حالانکہ کبھی صحافت کو عبادت کا درجہ دے کر اللہ تعالیٰ کا ''شریک'' بناتا ہے۔ کبھی شہادت کو اللہ تعالیٰ کے راستے کی بجائے باطل جمہوریت کے تابع کرتا ہے۔ کبھی علامہ اقبال اور قائداعظم کو اللہ تعالیٰ کے پاکستان کا ''والی'' بناتا ہے اور وہ بھی ارب پتی بن چکا ہے۔ دولت جائز طریقے سے کمائی جائے یا ناجائز طریقے سے دونوں صورتوں

میں یہ غریب کا خون چوس کر یا غریب کے پسینے سے کمائی جاتی ہے۔اب غربت تو حدیں ''پھلانگ'' گئی ہے جو بہت وسیع مضمون ہے کہ کوئی غریب یا عام آدمی اپنے بچوں کو ٹیکنیکل یا ہنر کی تعلیم نہیں دلا سکتا۔ حضور پاک ﷺ فرما گئے تھے کہ کسی زمانے میں مسلمان لاتعداد ہونے کی وجہ سے حب الدنیا اور کراہت الموت کی وجہ سے ذلت کی زندگی سے دوچار ہوں گے۔ کراہت الموت کے سلسلہ میں سازش یہ ہے کہ

''وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد ﷺ اسکے بدن سے نکال دو''

اس سلسلہ میں مفکر اسلام کا لبادہ اوڑھنے والے مودودی سمیت جو لوگ سازش کی کڑی بنے ہوئے ہیں وہ ذکر پیراگراف نمبر 167 تا 169 وغیرہ میں تفصیل سے آرہا ہے۔

88۔ ایوب خان کے قصہ کی طرف واپس لوٹتے ہیں کہ اس کے 1962ء کے دیئے گئے آئین میں صرف ایک اچھی شق تھی کہ اسمبلی کے ممبر صرف ''واچ ڈاگ'' کا کام کریں گے۔ حکومت اور خاص کر وزیروں کے معاملات پر کڑی نظر رکھ کر ان کی کوتاہیاں اسمبلی میں زیر بحث لائیں گے اور اگر ان میں سے کوئی وزیر بننا چاہے۔ تو اس کو اسمبلی کی ممبر شپ سے مستعفی ہونا پڑے گا۔ اسمبلی میں کافی سیاستدان بھی آ گئے تھے۔ انہوں نے اس شرط کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وزیر بھی بنیں گے اور ممبر بھی رہیں گے کہ اپنی ''لوٹ مار'' کو خود ''حفاظت'' پہنچا سکیں۔ ایوب کا سپیکر شپ کیلئے ''نمائندہ'' پہلے ہی تمیز الدین کے مقابلہ میں الیکشن ہار چکا تھا۔ اب جو ایوب کو اپنے ''چنیدوں'' سے دوسری شکست نظر آئی تو اس نے سیاستدانوں کے سامنے ''ہتھیار'' ڈال دیئے اور یہ شق ختم کر دی تو سب اسمبلی کے ممبروں اور خاص کر وزیروں نے پہلے کی طرح دولت ''سمیٹنا'' شروع کر دی۔ ایوب جس ''سیاسی بدعنوانی'' کو ختم کرنے آیا تھا، اب وہ ان بدعنوانوں کا ''سربراہ'' بن گیا۔ جو لوگ ایوب کی طرح کم دولتمندی کی حالت سے گزرے ہوں، ان کو جب دولت ملنے لگے تو ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ علاوہ ازیں مغربی لابی

نے اپنے ''وائسرائے'' ایوب کو سیدھا حکم دیا کہ وہ جلد سے جلد بھارت کا ''چھوٹا'' بھائی بن جائے، وہ لوگ بھارت کا چین کے ساتھ ٹکراؤ کرانے والے تھے۔ تو ایک دفعہ مشرقی پاکستان جاتے ایوب، دہلی کے ہوائی اڈہ پر چند گھنٹوں کیلئے رک گیا کہ اپنی طرف سے نہایت نیک دلی سے نہرو کو ''گزارش'' کی کہ ہمیں سب اختلاف ختم کرنا چاہئیں۔ بلکہ پاکستان تو بھارت کے ساتھ ''متحدہ دفاع'' کیلئے بھی تیار ہے۔ تو نہرو کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے ''کس کے خلاف؟'' یعنی بلی تھیلی سے باہر آ گئی کہ نہرو نے ایک طرح سے کہہ دیا ''کہ میاں دشمن تو ہم ایک دوسرے کے ہیں اور کس دشمن کے خلاف متحدہ دفاع کریں۔'' یہ کچھ گئے گزرے ایوب کی برداشت سے بھی باہر تھا کہ پاکستانی فوج اس وقت تک اس بے غیرتی تک نہ پہنچی تھی۔ جس بے غیرتی کا 1971ء میں یحییٰ خان اور نیازی کے تحت مظاہرہ ہوا۔ ایوب خان نے اپنے ''حاکموں'' کو اپنی ''ناکامی'' اور ''مایوسی'' سے آگاہ کر دیا۔

89۔ لیکن اہل مغرب بھارتیوں کو کچھ ''جاندار'' بنانے کے لئے ان کو چین کے ساتھ ''ٹکرانا'' ضرور چاہتے تھے۔ لیکن چین والوں نے نیفا کے علاقے میں آگے سے ذرا ''ہاؤ'' کیا۔ تو علاقے کا بھارتی کمانڈر اور نہرو کا رشتہ دار جنرل پنڈت کول، وہاں سے ایسا بھاگا کہ بڑی مشکل سے اس کو دہلی میں آخر ''تلاش'' کر ہی لیا گیا۔ بھارتی فوج ایسی ہزیمت سے دوچار ہوئی اور ایسی افراتفری تھی کہ ہمارے ہاں سے کچھ لڑنے والوں نے ایوب تک اپنی یہ گزارش پہنچائی کہ کشمیر کو حاصل کرنے کا یہ نادر موقع ہے۔ لیکن ایوب اپنے ''حکمرانوں'' کی اس مہم میں ''داخل'' ہو کر اپنے تخت کو کیسے خطرے میں ڈالتا؟ اس نے ان کو اپنی ''وفاداری'' کا یقین دلایا۔ تو برطانیہ کا چالاک وزیر ڈنکن سنڈے ایوب کو ''شاباش'' دینے برصغیر پہنچ گیا کہ وہ لوگ، نہرو کو کہہ کر کشمیر کے سلسلہ میں دونوں ممالک میں کوئی ''باعزت سمجھوتہ'' کرا دیں گے۔ لہٰذا اب ایوب کو بھارت کے ساتھ زیادہ ہمدردی کرتے ہوئے مشرقی پاکستان کے ذرائع آمدورفت کے استعمال کی بھی بھارت کو ''اجازت'' دے دینا چاہیے۔ یہ سن کر ایوب جیسے

گئے گزرے آدمی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور اس نے عوام کی مخالفت کی بات کا بھی ''سہارا'' نہ لیا اور کچھ غضبناک لہجہ اختیار کر کے ڈنکن سے پوچھا۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو؟'' چالاک انگریز بات کی حد تک پہنچ گیا اور اس کو معلوم ہو گیا کہ ایوب میں ابھی کچھ ''جان'' باقی ہے۔ تو حیلہ فرنگی والے ڈنکن نے اپنا لہجہ تبدیل کر کے ایک جعلی مسکراہٹ اپنا کر کہا ''کہ وہ صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ بھارت اور آپ لوگ کہاں تک ایک دوسرے کے ''نزدیک'' جا سکتے ہیں۔ آپ میرے مشورہ کو زیادہ Seriously نہ لیں۔ بہر حال یہ عاجز پیراگراف نمبر 7 میں گزارش کر چکا ہے کہ چھپے ہاتھوں کو ایوب نے مایوس کیا۔ تو ہر ''میر جعفر'' کے لئے کچھ معیاد ہوتی ہے اور جو بھٹو کی طرح ''ہوشیار اور چالاک'' بننے کی کوشش کرے اس کے لئے ''پھانسی'' ہوتی ہے۔ لیکن ایوب سے ابھی ان لوگوں نے بہت کچھ کرانا تھا اس لئے اس کو نکالنے کے اعمال کو کئی ''مراحل'' کے تحت پیش رفت دی کہ ان چھپے ہاتھوں یا مغربی لابی کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے پروردوں میں کردار نام کا کوئی وصف نہیں ہونا چاہیے۔ تو یہاں ایک وضاحتی بیان کی ضرورت پڑ گئی ہے۔

90۔ 1952ء سے 1957ء تک لاہور میں متعین امریکن کونسلر بل ودس شاید سی آئی اے کا پاکستان میں نمبرون "One" آدمی تھا۔ اس کی بیوی جو مقابلتاً کم عمر کی تھی، وہ تو 1968ء تک کابل میں کوئی ایسی ''ذمہ داری'' کر رہی تھی کہ بل ودس تو اس زمانے میں ''سترہ بہترہ'' ہو چکا تھا لیکن بیوی کے ساتھ کابل میں رہتا تھا۔ ایک دفعہ کابل جاتے پنڈی، اسلام آباد کچھ ٹھہرا اور ان دنوں کافی ''بونگا'' ہو گیا تھا لیکن پھر بھی میرے ساتھ ملاقات ضرور کی۔ ''گپ شپ'' 1952ء والی صورت تو نہ اختیار کر سکی کہ ان دنوں وہ مجھے ''استعمال'' کرتا رہا یا میں اس کو ''استعمال'' کرتا رہا۔ یا دونوں ''مستفیض'' ہوتے رہے، گپ شپ بڑی وسیع ہوتی تھی۔ ہم ان دنوں فوجی سامان حاصل کرنے کے لئے امریکہ والوں کی خوشامد کی حد تک بھی چلے جاتے تھے اور حالات اتنے ''خراب'' بھی نہ تھے۔ امریکہ کا وزیر خارجہ فاسٹر ڈلس سنجیدہ آدمی

تھا۔ بھارتیوں کی ذہنیت کو سمجھتا تھا اور نہرو کو زیادہ ''لفٹ'' بھی نہ دیتا تھا اور کہتا تھا کہ نہرو بہت بڑا ''بہروپیا'' ہے۔ بہر حال ایک دن میں نے بل ودس کو کہا کہ ''تم لوگ پاکستان میں ایسے لوگ ''تلاش'' کرتے ہو جو تمہارے ''پٹھو'' بن جائیں، ایسے لوگ اکثر ابن الوقت ہوتے ہیں۔ کل روس آئے گا تو اس کے پٹھو بن جائیں گے تم لوگ محبِ وطن پاکستانی لوگوں پر بھروسہ کیا کرو۔ جو بااصول لوگ ہوں گے اگر تمہارے ساتھ وعدہ کیا تو اس کو نبھائیں گے۔'' تو بل ودس ایسے ''مشورے'' ہنسی میں ٹال دیتا تھا کہ وہ لوگ ''بے کردار'' لوگوں کی تلاش میں ہوتے تھے۔ امریکہ والوں کے بہت زیادہ ''تعلقات'' ہمارے ایک سیکرٹری عزیز احمد کے ساتھ تھے جو لاہوری قادیانی تھا اور جس کا ذکر یہ عاجز پیراگراف نمبر 61 میں کر چکا ہے کہ پاکستان کا وہ ایک ''بادشاہ گر'' تھا۔

91- یہی عزیز احمد 1958ء میں ایوب خان کا ''سیکنڈ ان کمانڈ'' یعنی ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھا اور نومبر 1958ء میں ہم فوجی افسروں کو پشاور میں خطاب کیا کہ سیاستدان بڑے بے اصول بے وفا اور فصلی بٹیرے ہوتے ہیں۔ تو اس عاجز نے سوال کر دیا ''کہ تمہاری تقریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے یہ افراتفری والے حالات ہماری بے کرداری کی وجہ سے ہیں اس سلسلہ میں حکومت کیا عملی قدم اٹھائے گی۔'' تو اس نے فوراً پینترا تبدیل کر دیا کہ کردار ایک ذو معنی لفظ ہے اور تم کونسے کردار کی بات کر رہے ہو کہ ہم قوم کو فرشتے نہیں بنا سکتے اور انگریزی کی بھاری اور بے ربط تلمیحات کا حوالہ دیتے ہوئے میرے سوال کو ایک ''طفلانہ'' سوچ قرار دیا۔ میں نے اٹھ کر کہا کہ ''اگر تمہارے جیسے لوگ پاکستان کے حکمران رہے تو پاکستان کا اللہ حافظ ہے'' اور بہت کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ہمارے ڈویژن کمانڈر اور میرے محسن میجر جنرل فضل مقیم نے کچھ ایسا اشارہ کیا جس کا مطلب تھا، ''مہمان ہے اس کو پورا ننگا نہ کرو۔'' قارئین! اسی آدمی نے بھٹو کے ساتھ مل کر لاہور کی افواج کو ستمبر 1965ء میں بروقت محاذ پر نہ جانے دیا۔ جو کہانی آگے ستمبر 65ء کے سلسلہ میں پیراگراف نمبر 97، 98 میں آ رہی ہے یہ آدمی کئی

ملکوں میں ہمارا سفیر رہا اور بھٹو کی حکومت میں وزیر خارجہ اور وزیر دفاع رہا۔ ضیاء الحق نے بھٹو کو تو پھانسی پر لٹکا دیا لیکن عزیز احمد کی طرف ضیاء الحق کو میلی آنکھ سے ''دیکھنے'' کی بھی اجازت نہ تھی کہ یہ بے کردار انسان امریکہ کا ہر حکم بسر و چشم مانتا تھا۔ لیکن اس بے کرداری کا کہاں تک رونا رویا جائے۔ اس عاجز نے 1962ء سے 1965ء تک صدر ہاؤس کے ساتھ ''وابستگی'' کی وجہ سے حکومت کو چلتے بہت ''نزدیک'' سے دیکھا۔ نہ کوئی اصول ہوتا تھا نہ کوئی طریقہ کار، نوے فیصد لوگ جو کوئی سرکاری آڑ لے کر یا نجی طور پر صدر ہاؤس آتے تھے وہ کسی ناجائز ''ضرورت'' یا ناجائز کام یا ناجائز سفارش کیلئے آتے تھے۔ دور دور سے ابن الوقت اور مطلب پرست لوگوں کا صدر ہاؤس میں کسی ''کرسی والے'' یا ''بابو'' یا اور نہیں تو کسی ''چپراسی'' سے رابطہ ہوتا تھا۔ ان کو تحفے تحائف پہنچائے جاتے تھے اور اپنے کام نکالے جاتے تھے۔ بلکہ یحییٰ خان اور بھٹو کے زمانے میں تو صدر ہاؤس بے کردار لوگوں کا ''مچھلی بازار'' بن گیا تھا۔ (توبہ میرے اللہ۔) یہ عاجز قوم کو کس کس ''بے غیرتی'' سے آگاہ کرے۔

92۔ پیرا نمبر 88 میں جو ذکر کیا کہ ایوب لوٹ مار کرنے والے بدعنوانوں کا ''سربراہ'' بن گیا۔ تو انہوں نے ایوب کو مزید مجبور کیا کہ ہماری ایک سیاسی ''سلطانی'' پارٹی بھی ہونی چاہیے۔ تو ایوب خان نے بوڑھے مسلم لیگی چودھری خلیق الزمان جس کو لیاقت علی ''فرار ملت'' کا خطاب دے گیا تھا سے مسلم لیگیوں کی ایک Convention بلا کر خلیق الزمان کو اس کا وقتی سربراہ بنا دیا بعد میں ان کی ''قیادت'' خود سنبھال لی، جو کنونشن مسلم لیگ کہلائی۔ ممتاز دولتانہ جیسے بدعنوان لوگ جو ''پروڈا'' کی وجہ سے حکومت میں شمولیت کے لئے نااہل تھے انہوں نے ایک اور بوڑھے مسلم لیگی خواجہ ناظم الدین کے تحت ''کونسل مسلم لیگ'' بنالی۔ پھر کیا تھا ایوب جو سیاست سے بدعنوانی ختم کرنے آیا تھا۔ وہ باقی یاجوج اور ماجوج کے لشکروں کو کیسے روک سکتا تھا۔ سیاسی پارٹیاں Mushrooms کی طرح یا ''دابۃ من الارض'' (سورۃ النمل) کی طرح ''اخرج الارض'' ہو گئیں۔ ولی خان اور باقی علیحدگی پسند یا جو لوگ خطوں

اور صوبائی آزادی کے ناموں پر پاکستان کو توڑنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی کوئی سیاسی لبادہ اوڑھ کر ''میدان'' میں آ گئے۔ لیاقت علی نے جو بنگال کے معزز سیاستدان ''سہروردی کو کتے'' کا نام دیا تھا۔ اس کا ایک سیاسی فرزند اور ''بنگالی غنڈہ'' مجیب الرحمٰن سہروردی کی پارٹی عوامی لیگ کا سربراہ بن گیا اور ملک کو دولخت کرنے کا جو عمل پاکستان کی تخلیق کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا، اس کو مزید پیش رفت دینا شروع کر دی۔ قارئین! جن غیر مسلم ممالک میں یہ کافرانہ سیاسی نظام چل رہا ہے وہاں ہر پارٹی کا کوئی ''منشور'' ہوتا ہے۔ پاکستان میں چھپے ہاتھوں نے نیا طریقہ ایجاد کیا ہے کہ ہر آمر کسی ''سلطانی پارٹی'' کی مدد سے حکومت چلاتا ہے، ان کو ''حزب اقتدار'' کہا جاتا ہے۔ مخالفت کے لئے باقی تمام سیاسی پارٹیوں کا منفی بنیادوں پر ایک اتحاد بنایا جاتا ہے کہ ''آمر جاوے ہی جاوے'' اس کی جگہ کون آوے بعد میں دیکھا جائے گا۔ لیکن یہ عمل شروع بے چاری مس فاطمہ جناح سے کرایا گیا کہ نہ صرف الگ الگ نظریات رکھنے اور الگ الگ مقاصد والی پارٹیوں کو اکٹھا کیا گیا۔ بلکہ ایک اسلامی نظریاتی جماعت بھی اس ''منفی اتحاد'' میں شامل ہوگئی۔ جس کا سربراہ پہلے قرآن پاک کی متعدد آیات کو رد کر کے کشمیر کے جہاد کو ہمارے لئے حرام قرار دے چکا تھا جو ذکر آگے پیراگراف نمبر 167 وغیرہ میں آ رہا ہے۔ اب اس نے نظریہ ضرورت کے تحت اسلام میں عورت کی سربراہی کو بھی ''حلال'' اور ''جائز'' قرار دے دیا۔

93۔ قارئین! اس سارے عمل کہ منفی بنیادوں یعنی ایوب کو شکست دلانے کے لئے مس فاطمہ جناح کو جو مختلف الخیال اور نظریات والی سیاسی پارٹیوں نے ایوب کے مقابلہ میں اپنا متحدہ نمائندہ بنایا، اس سے کیا فوائد یا نقصان ہوئے۔ ان پہلوؤں کو اس ''عمل'' کے نتائج اور نتائج کے اثرات سے ہی سمجھا جا سکتا ہے کہ اول ایک غلط روایت بن گئی کہ آئندہ بھی مخالفت برائے مخالفت والے ایک ''چھتری'' تلے منفی عمل کیلئے جمع ہو جاتے رہے۔ پاکستان کی مخالف جماعت احرار کا نصر اللہ (نواب زادہ) انہیں ''سربراہ'' کے طور پر مہیا ہو جاتا کہ

1968-69ء میں ایسے اتحاد والوں نے بھارتی ایجنٹ مجیب الرحمٰن کو نہ صرف رہائی دلوائی بلکہ پاکستان کا لیڈر نمبرون (One) بنادیا اور مخلص مسلم لیگی لیڈر نورالامین نے اسی زمانے میں کہہ دیا تھا کہ یہ "منفی اتحاد" کچھ نہ حاصل کر سکے گا، سیاستدان ملک کے ٹکڑے کر رہے ہیں، لیکن افسوس ساری بدنامی فوج کے سر تھوپی جائے گی۔ بہر حال نصر اللہ نے "منفی اتحادوں" کے اعمال جاری رکھے اور بھٹو کے خلاف ایسے ہی ایک منفی اتحاد کی "ناکامی" کے بعد ہمیں ضیاء الحق کا مارشل لاء "نصیب" ہوا جو گیارہ سال اسلام کے ساتھ "فراڈ" کرتا رہا۔ ایک دفعہ آغا مرتضیٰ پویا اس وقت کے "مسلم" اخبار کے مالک کے گھر کچھ دانشور فلسطین سے حماس پارٹی کے ایک وفد کو خوش آمدید کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے۔ نصر اللہ بھی موجود تھا، کہنے لگا: "ہم پاکستانی تو عربوں کی ہر طرح سے مدد کرتے ہیں لیکن اکثر عرب ہماری کشمیر کے سلسلہ میں مدد نہیں کرتے۔" میں نے کہا نصر اللہ صاحب! معنوی لحاظ سے تمہاری سوچ صحیح ہے لیکن منفی اتحادوں کی سربراہی کرتے کرتے تمہارا طرز بیان بھی منفی ہو گیا ہے۔ ہم فلسطین والوں کی مدد اس لئے نہیں کرتے کہ وہ عرب ہیں بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور ہم یہ کوئی ان پر احسان نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ سبحانہ اور رسول پاک ﷺ کی طرف سے اپنی ذمہ داری پوری کرتے ہیں۔ کوئی عرب اگر کشمیر کے سلسلہ میں ہماری مدد نہ کرے تو ہم اس کو مسلمان کے طور اس کی ذمہ داری یاد دلائیں گے۔ ساری مجلس پر سناٹا چھا گیا لیکن حماس کے میرے نزدیک بیٹھے دو صاحبان نے آ کر میرا ماتھا چوم لیا۔

94۔ تو مس فاطمہ جناح کی اس منفی اتحاد کی سربراہی سے علیحدگی پسند پارٹیاں یعنی ولی خان یا مجیب الرحمٰن کو جو "عروج" حاصل ہوا۔ قوم نے "نتیجہ" 1970ء میں دیکھ لیا کہ انہوں نے کیا کچھ حاصل کیا۔ پاکستان کی بانی جماعت مسلم لیگ کی "سرکاری لیگ" اور "بدکاری لیگ" آپس میں ایسی ٹکرائیں کہ مسلم لیگ ہی پاش پاش ہو گئی کہ 1970ء کے انتخاب میں کنونشن اور کونسل دونوں لیگوں کو کوئی درجن سے بھی کم سیٹیں حاصل ہوئیں۔ پورے پندرہ سال یعنی

1985ء تک مسلم لیگ کا نام ہی قصہ پارینہ ہو گیا۔ اب لفظ مسلم لیگ تو خانہ پری کے لئے ہے کہ ضیاء الحق نے ''جونیجو لیگ'' کو جنم دیا، کوئی چٹھہ لیگ ہے، کوئی پگارا لیگ ہے، کوئی قاف لیگ ہے اور کوئی نواز لیگ۔ یعنی آئے روز یہ ''لیگیں'' جنم لیتی رہتی ہیں۔ البتہ مس فاطمہ جناح کی آمد نے ایک دفعہ تو ایوب کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کو یہ ڈر بھی تھا کہ کوئی من چلا اس پر حملہ نہ کر دے۔ مجھے صدر ہاؤس میں دیکھ کر وہ ''باغ باغ'' ہو جاتا تھا کہ کوئی اس کے جاننے والا حفاظتی ڈیوٹی پر ہے۔ تو مجھے جہاں دیکھتا میری طرف چل کر میرے ساتھ ''ہیلو ہیلو'' کر لیتا تھا۔ میں بھی اکثر اپنی ''حاضری'' لگواتا رہتا تھا کہ ایوب خان تسلی میں رہے۔ بہر حال یہ سب ایوب کیلئے ایک بہت بڑا ''اندرونی دھکا'' تھا لیکن چھپے ہاتھ اب ''اندرونی گھر مکے'' اور سازش سے ایوب خان کو بہت بڑا ''بیرونی دھکا'' دے کر ایوب کی چھٹی کرانا چاہتے تھے۔ 1962ء میں اس نے ان کو ''مایوس'' کیا تھا وہ لوگ اب پاکستان کے ٹکڑے کر کے اس کو بھارت کے لئے ''سیکھم'' اور ''بھوٹان'' بنانا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں افسوس ہے ہماری کم علم قوم پر کہ انہوں نے آج تک ستمبر 65ء کی جنگ کے اسباب، عوامل، سازش کی کڑیوں اور نتائج کی ہرگز تحقیق نہیں کی اور اب تک اکثر لوگ اس جنگ کو ہماری فتح سمجھتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ اگر یہ ہماری فتح تھی تو صرف چھ سال بعد بھارت نے ہمیں دولخت کیوں اور کیسے کر دیا۔ چنانچہ کرنل غفار مہدی سمیت کچھ لوگوں نے ستمبر 1965ء کی جنگ کے کچھ حقائق سے پردے اتارے ہیں اور یہ عاجز کھلے طور پر نوائے وقت میں بے شمار مضامین لکھ چکا ہے اور اب ایک کتاب بھی شائع ہو چکی ہے کہ یہ جنگ ایک سازش تھی۔

95۔ چنانچہ یہ عاجز بہت اختصار سے بیان کرے گا کہ 1964ء میں یہ عاجز جب ایوب خان کی حفاظت کے لئے ایک دستہ کے ساتھ مری پہنچا۔ تو ایک دن دیکھا کہ مری کے ڈویژن کمانڈر میجر جنرل اختر ملک قادیانی نے ایوب کے ساتھ کئی گھنٹے لمبی ملاقات کی۔ جس کے بارے اندرونی ذرائع سے معلوم ہوا کہ اختر ملک نے گوریلوں کو مقبوضہ کشمیر میں بھیج کر کشمیر کو آزاد

کرانے کی ایک تجویز پیش کی تھی۔اب میں اختر ملک کے باپ سمیت اختر کے سب خاندان کو بچپن سے جانتا تھا اور اختر کے بارے بھی مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت بڑا ایکٹر اور بہروپیا تھا۔ پھر میں کبھی کسی قادیانی سے خیر کی توقع نہیں کرتا لیکن حیرانگی کی بات یہ تھی کہ ایک مخلص انسان کرنل شیر محمد خالد جن کا ذکر پیراگراف نمبر 5 میں ہو چکا ہے اور وہ 1955ء میں کشمیر میں نمبر 2 سیکٹر کمانڈر تھا۔اس نے ایوب کو ان زمانوں میں ایسی تجویز پیش کی تو ایوب نے کہا تھا کہ ہم بھارت کو ناراض نہیں کر سکتے۔علاوہ ازیں پیراگراف نمبر 89 میں ذکر ہو چکا ہے کہ ایوب نے 1962ء میں کشمیر کو آزاد کرانے کے سنہری موقع کو کھو دیا تھا، اب وہ کشمیر کو آزاد کرانے پر کیسے تیار ہو گیا؟ ظاہر ہے چھپے ہاتھ ایوب کو بے وقوف بنا رہے تھے۔ چنانچہ ہم راولپنڈی واپس پہنچے تو میرے ہم مکتب ملک یارن خان کو خفیہ پولیس کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ اختر ملک مری سے آ کر ایک مسٹر سبحان کے ہاں ہمارے وزیر خارجہ ذوالفقار بھٹو اور مالیاتی سیکرٹری غلام کذاب کے پوتے ایم ایم احمد کے ساتھ بڑی باقاعدگی سے ملتے ہیں کہ کوئی ''گھر مکہ'' پک رہا ہے۔ شاہد کشمیر میں کچھ کارروائی کا ''ارادہ'' ہے۔ جس کے لئے مالی وسائل کی بھی ضرورت ہے اور بیرونی ممالک کو کچھ "Soft" یعنی اپنے حق میں کرنا پڑتا ہے اور سب کچھ ایوب کی ''اجازت'' سے ہو رہا ہے کہ وزارت خارجہ نے ایوب کو ''تسلی'' دی ہے کہ نہرو کی جگہ ایک کمزور آدمی لال بہادر شاستری بھارت کا وزیراعظم بن گیا ہے۔ اگر پاکستان کسی طرح گوریلوں یا ملی جلی کارروائی سے کشمیر کے دریائے چناب سے مغرب کے کچھ ''حصے'' آزاد کرا لے تو اہل مغرب کو زیادہ اعتراض نہ ہوگا۔ کشمیر کا مسئلہ حل ہو جانے سے بھارت اور پاکستان ایک دوسرے کے نزدیک آ کر اہل مغرب کے بہتر ''اتحادی'' بن جائیں گے۔ یہ سب کچھ میرے لئے ''ہضم'' کرنا مشکل تھا، میں ہندو ذہنیت اور اہل مغرب کی عیاریوں سے واقف تھا، لیکن ''چھوٹا'' آدمی تھا کیا کرتا کچھ رفقاء کے سامنے اپنی بھڑاس نکال لیتا تھا۔ البتہ اختر ملک نے کچھ بھارتی پوسٹوں پر ''حملے'' شروع کرا دیئے اور ان باتوں کو خوب

''اچھالا'' جا رہا تھا کہ بڑا کام ہو رہا ہے۔ اس پر اپنی یونٹ کی Inteligence رپورٹ میں لکھایا کہ یہ غلط کارروائی ہے۔ دشمن کو خواہ مخواہ ''چوکنا'' کیا جا رہا ہے اور ایسی کارروائی کو گوریلا کارروائی نہیں کہہ سکتے۔

96۔ اپریل 1965ء میں ہم صدر ہاؤس کی ڈیوٹی چھوڑ کر لاہور چھاؤنی میں جانے والے تھے اور میں تو پلٹن کی ایڈوانس پارٹی لے کر لاہور پہنچ گیا۔ تو رن آف کچھ کا جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔ ہماری فوج میں 1958ء سے میجر جنرل عبدالحمید برہمی کے ماتحت ایک گروہ لڑائی لڑنے کے ایک نئے اور ''بوگس'' طریقہ پر کام کر رہا تھا۔ بعد میں یہ طریقہ اپنا بھی لیا گیا کہ زیادہ دفاع ''فائر'' سے کیا جائیگا اور زمین پر تھوڑی نفری ایک دوسرے سے ہزاروں گز دور رہ کر درمیانی علاقہ کی ''حفاظت'' فائر سے کرے گی۔ اصولی طور پر ایسی تبدیلیاں غلط نہیں ہوتیں لیکن ایسا کچھ ''محدود فاصلہ'' یعنی سینکڑوں گزوں تک ہو سکتا ہے۔ ہزاروں گز والی بات ''زیادتی'' تھی اور پھر ایسے فیصلے ہم ''میجروں'' پر چھوڑے جاتے جو حالات کے مطابق ایسے ''فاصلے'' طے کرتے۔ کرنل قیوم اور ہم جیسے چند لوگوں نے ''پروٹیسٹ'' کیا تو ہمیں ''قدیم'' قرار دے کر ہماری آراء رد کر دیں۔ دراصل حمید جس کو ہم یحییٰ کا ''سایہ'' کہتے تھے اور وہ یحییٰ کا ''ہم پیالہ'' بھی تھا، بڑا بوگس آدمی تھا۔ لیکن اپنی شخصیت پر اس نے بہت ''قلعے'' تعمیر کئے ہوئے تھے۔ ایک غیر معروف جرمن لکھاری کی کتاب کے انگریزی ترجمہ سے چند ''تلمیحات'' اپنا کر حمید ساری فوج کو ''بے وقوف'' بنا رہا تھا کہ وہ اور اس کا گروہ ہر چھاؤنی میں جا کر مہمان کے طور پر اپنے اوپر شراب لنڈھاتے رہتے تھے۔ مجھے تو اس سے بھی ''سازش'' کی بو آئی لیکن اختر ملک جو اس وقت بریگیڈیئر تھا۔ اس کے تحت 62-1961ء کی لاہور کی جنگی مشق ''مائل سٹون'' کے بعد یہ طریقہ اپنا لیا اور پیدل فوج کی اتنی ایسی تیسی کی یعنی اتنی کمی کی کہ سپاہیوں نے اپنے بریگیڈوں اور ڈویژنوں کو ''ٹیڈی'' کے نام دیئے۔ پروٹیسٹ صرف کرنل شیر محمد خالد نے کیا جو اختر ملک سے سینئر تھا۔ لیکن ان کے اسلامی خیالات کی وجہ

سے ان کو اوپر نہ جانے دیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا ''خدارا'' پیدل نفری کی اس طرح ایسی تیسی نہ کرو جو وافر تعداد میں ملک میں موجود ہے اور ''فائر'' پر اتنا بھروسہ نہ کرو جو باہر سے منگانا پڑتا ہے۔ یہ بوگس طریقہ ستمبر 1965ء میں ایک دن بھی نہ چلا اور اس کے بعد جنرل حمید برہمی کا کورٹ مارشل ہونا چاہیے تھا، لیکن الٹا اس کو ترقی دے دی۔ ہماری پلٹن کا ریکارڈ دیکھا جائے کہ ہم نے تو جون، جولائی 1965ء رن آف کچھ کے جھگڑے کے وقت اوپر والوں کو لکھا تھا کہ مزید پیدل افواج کھڑی کی جائیں۔ جو پلٹنیں ستمبر اور اکتوبر 1965ء میں کھڑی کیں اگر وہ اگست 1965ء میں کھڑی کر دیتے تو دہلی پہنچنے سے ہمیں کوئی نہ روک سکتا تھا۔ توپخانہ اور بکتر بند دستوں کے سلسلہ میں کئی لحاظ سے ہمیں بھارت پر برتری حاصل تھی۔ گو ہمارا فلسفہ جہاد دفاع نظریہ جہاد کے تابع تو نہ تھا لیکن جہاد کا جذبہ بھی ہمارے پاس تھا اور جذبہ ایمان بھی کہ ہم رسول پاک ﷺ کے عشق سے لبریز میدان جنگ میں داخل ہوتے تھے۔

97۔ بہر حال ستمبر 1965ء کی جنگ کے سلسلہ میں اوپر والوں کی کوتاہیوں، غداریوں اور نا اہلیوں کی باتوں یا قوم کو جو بے وقوف بنایا گیا۔ ایسی باتوں سے میری کتابیں بھری پڑی ہیں کہ چھپے ہاتھوں کی سازشیں اتنی گہری تھیں کہ سازشی چھوٹی سطحوں پر بھی ہمارے اندر اس طرح گھسے ہوئے تھے کہ مجھ چھوٹے سے ''میجر'' پر بھی ان لوگوں کی ''نظر'' تھی۔ اختصار سے تحریر کروں گا کہ ہماری وزارت خارجہ نے رن آف کچھ کی سرحد پر کسی چھپے ہاتھوں کی شہ پر بھارت کے ساتھ ہمیں سرحدی جھڑپوں میں ''الجھا'' دیا اور حالات اتنے خراب ہو گئے کہ بھارت نے ہمیں ''تنبیہ'' کی کہ وہ ہمارے خلاف کوئی اور ''محاذ'' کھول دیں گے۔ مئی، جون 1965ء میں دونوں ممالک کی افواج اپنی اپنی سرحدوں میں رہ کر حفاظتی طور پر ''مورچہ زن'' ہو گئیں۔ اور حفاظتی ''مائنز'' اور تاریں'' بھی لگا دیں۔ رن آف کچھ میں ہمیں بھارت پر کچھ ''برتری'' حاصل ہو گئی اور کچھ بھارتی فوجیں ہمارے آگے سے ''فرار'' ہو گئیں۔ تو یہ ''ڈرامہ'' کرانے والے چھپے ہاتھوں کے اشارے پر ہمارے وزیر خارجہ بھٹو نے ایوب خان کو باور کرایا، کہ

بھارت ثالثی منظور کر لے گا، ان کی موجودہ حکومت میں لڑنے کی طاقت نہیں۔ اور پھر ایسے ہی ہوا کہ بھارت ثالثی پر تیار ہو گیا اور دونوں ملکوں کی فوجیں چھاؤنیوں میں نہ صرف واپس چلی گئیں بلکہ ہمیں حکم ملا کہ ہم تمام تاریں اور مائنز بھی ہٹا لیں اور جولائی 1965ء میں ایسا ہو گیا۔ اب چھپے ہاتھوں کے ''پروگرام'' کے تحت ایوب خان کو بھٹو اور اختر ملک نے خوب بے وقوف بنایا کہ کشمیر میں ''گوریلے'' بھیجنے کا یہ بہترین وقت ہے اور ایوب ''فاتح کشمیر'' بن جائے گا۔ ''سکیم جبرالٹر'' کے تحت اختر ملک نے مقبوضہ کشمیر میں کارروائی شروع کر دی۔ ''گوریلے'' باہر سے نہیں بھیجے جاتے گوریلے ملک کے اندر تیار کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں اختر ملک نے کچھ کمانڈو دستے اور کچھ عام آزاد کشمیر کے فوجیوں کو ٹکڑیوں میں مقبوضہ کشمیر میں ''لانچ'' کر دیا۔ انہوں نے بھارتی پوسٹوں پر کچھ حملے کئے اور ان کو ''لانگ رینج'' کمانڈو کہہ سکتے ہیں اور کچھ لوگوں بریگیڈیئر گلزار کے بیٹے فاروق وغیرہ نے اچھا کام کیا۔ ادھر مجاہدین کا ریڈیو بھی تیار تھا جو ان حملوں کو گوریلا کارروائیوں کا نام دے کر بات بڑھا چڑھا کر بیان کی جا رہی تھی۔

98- یہ ایک بالکل ہی ''لا حاصل مشق'' تھی۔ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ہم کس کو بے وقوف بنا رہے ہیں بلکہ خود بے وقوف بن رہے ہیں۔ وزارت خارجہ نے کہا کہ فوج کا چوتھا حصہ گھر چھٹی بھیج دیا جائے اور بھارت کو یہ تاثر دیا جائے کہ یہ لڑائی ہم نہیں لڑ رہے۔ کچھ رضا کار ہیں اور کچھ مقبوضہ کشمیر کے لوگ ہیں لیکن چند دن کے بعد نہ صرف ان فوجیوں سے کچھ فوجی پکڑے گئے بلکہ بھارتیوں نے جو اپنے فوجی ہماری پوسٹوں پر حملہ کیلئے بھیجے، ان میں بھارتی بریگیڈیئر بھومی چند کے دستوں نے ہمارے بریگیڈیئر خلجی کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ کیا۔ تو سکیم جبرالٹر کی ایک کاپی جو بریگیڈیئر خلجی کی ایک بش شرٹ کی جیب میں تھی، وہ بھی بھارتیوں کی ہاتھ لگ گئی۔ تو بھارتیوں نے فائر بندی کے ہمارے خالی علاقوں میں سے بھی کچھ مقامات پر قبضہ کر لیا۔ اب ہماری نالائق جنرل موسیٰ کی کمانڈ نے میدانی علاقوں سے پیدل دستے آزاد کشمیر بھیجنے شروع

کر دیئے۔ اور ہمارا مغربی پاکستان کا دفاع اور کمزور ہو گیا۔ اختر ملک کو معلوم تھا کہ بھارتی ضرور ردعمل کے طور پر ہماری فائر بندی لائن پر حملہ کریں گے تو اس نے ایک جوابی حملہ کی چھمب جوڑیاں کے علاقہ میں بڑی ''جاہلانہ'' تجویز بنا رکھی تھی۔ کچھ پیدل دستے آزاد کشمیر سے تیار رکھے تھے اور کچھ مغربی پاکستان سے ادھار مانگ کر دستوں کو استعمال کرنا تھا کہ حملہ کر کے کچھ علاقے آزاد کرا کے وہ دستے واپس مغربی پاکستان اپنی ذمہ داریوں کے علاقوں میں چلے جائیں گے۔ یہی حالت توپخانہ اور بکتر بند دستوں کے لئے تھی کہ یہ لوگ ابتدائی حملے کے بعد اپنی ذمہ داری کے علاقے میں واپس چلے جائیں گے۔ بہر حال اختر ملک کی کارروائی ''حیران کن'' تھی، تو ابتدائی طور پر بہت کامیابی حاصل ہوئی کہ ہم نے چھمب اور جوڑیاں فتح کر لیے۔ لیکن آگے علاقہ تنگ تھا اور کامیابی نہ ہونا تھی کہ بھارت والے چوکنے ہو گئے اور ہماری فوجیں ایک "Funnel" میں پھنس گئیں۔ تو اختر ملک نے ایک اور یعنی تیسرے بریگیڈ کی مدد مانگ لی۔ تو اب صرف یحییٰ خان کے دو بریگیڈ رہ گئے تھے جنہوں نے قصور محاذ کے ہمارے بکتر بند دستوں کے جوابی حملہ میں شامل ہونا تھا۔ تو وہاں صرف ایک بریگیڈ چھوڑ کر یحییٰ خان ایک بریگیڈ لے کر راستے سے ہمارے لاہور کے دفاع کے ڈویژن کی ٹرانسپورٹ لیتے چھمب جوڑیاں کے محاذ پر پہنچ گیا اور اس محاذ کی کمانڈ سنبھال لی لیکن اکھنور کی طرف پیش قدمی نہ ہو سکی تو یحییٰ خان نے ایک اور پیدل بریگیڈ کی مدد مانگ لی تو گیارہویں ڈویژن سے بریگیڈیئر صاحب دار کے بریگیڈ کو چھمب جوڑیاں جانے کا حکم ملا۔ جو ابھی کھاریاں پہنچے تھے تو بھارت نے 6 ستمبر صبح کو لاہور قصور محاذ پر حملہ کر دیا۔ بریگیڈیئر صاحب داد کا بریگیڈ مشکل سے اپنی ذمہ داری کے علاقے میں 6 ستمبر دوپہر کے بعد پہنچا کہ بھارتی حملے کو وہاں معجزانہ طور پر روک لیا۔

99- توبہ میرے اللہ، یہ سب کچھ یاد کر کے یہ عاجز اپنا سر پیٹ لیتا ہے۔ اول حملہ غلط جگہ پر کیا اور پہلی کامیابی کے بعد وہاں پھنس گئے۔ تین بریگیڈ فوج نے کچھ حاصل نہ کیا کہ اکھنور پہنچ جاتے

اور جموں، نوشہرہ کا رابطہ ہی کاٹ دیتے۔ وہ کام بھی نہ ہو سکا، اس کے برعکس پٹھانکوٹ، جموں کے درمیان خاص کر سانبھہ کے کھلے علاقے میں ایک بر گیڈ آسانی سے دشمن کے ذرائع آمدورفت کو کاٹ لیتا۔ پھر اس زمانے میں تو قدرتی طور پر بھارتی بکتر بند ڈویژن وہاں اجتماع کر رہا تھا، جو ہمارے جال میں پھنس سکتا تھا۔ اب مددگار توپخانہ اور بکتر بند دستے بڑی مشکل سے سیالکوٹ اپنی ذمہ داری کے علاقے میں واپس پہنچے۔ دراصل یہ کارروائی اختر ملک کو تو کرنا ہی نہ چاہیے تھی۔ مظفر آباد سے لے کر تمام آزاد کشمیر کا محاذ اس کے پاس تھا۔ یہاں کسی اور کو یہ کارروائی کرنا چاہیے تھی۔ اختر ملک نے بکتر بند دستوں اور توپخانہ کی مدد سے ایک آزاد کشمیر بر گیڈ (پانچ پلٹنوں والے) سے سب کام کرنا تھا۔ حفظ ماتقدم کے طور میدانی علاقوں میں گجرات کے نزدیک ایک بر گیڈ جو سیالکوٹ محاذ کیلئے ریزرو تھا وہ اختر ملک کی اس کارروائی کیلئے بھی ریزرو تھا۔ اختر ملک نے دوسرے دن ہی یہ مدد مانگ لی اور اس بر گیڈ کو بھی وہاں ''پھنسا'' دیا اور تیسرے بر گیڈ کی مدد مانگ لی اور ہماری نالائق فوجی کمانڈ اس کو بڑی کامیابی سمجھ رہی تھی۔ تو یحیٰی خان کی لابی نے اس کو ''پانچ سواروں'' میں شامل کرنے یا کامیابی کے ''سہرے'' باندھنے کے لئے، اختر ملک کی جگہ کمانڈ دے دی۔ تو قادیانی اور اختر ملک کی ''لابی'' اب تک قوم کو بے وقوف بنا رہی ہے کہ اگر یہ تبدیلی نہ ہوتی تو اختر ملک اکھنور پر قبضہ کر لیتا۔ یہ بڑی نمایاں کامیابی ہوتی اور اس کے آنے والی جنگ میں ہمارے حق میں بہت اچھے اثرات ہوتے اور جنگ کا پانسہ ہمارے حق میں تبدیل ہو جاتا۔

100۔ یہ سب لال بجھکڑ والی سوچیں ہیں۔ اکھنور پر قبضہ سے صرف جموں اور نوشہرہ کے درمیان رابطہ ٹوٹ جاتا اور یہ ''وقتی'' کامیابی ہوتی۔ ہم نیچی جگہ پر تھے، بھارتی اونچی جگہ پر تھے۔ جیسے ہمارا توپخانہ اور بکتر بند دستے اپنی ذمہ داری والے علاقے میں واپس جاتے، بھارت والے یہ علاقے فائر اور بہتر پوزیشن میں ہونے کی وجہ سے ہم سے واپس لے لیتے۔ اول تو اختر ملک بھی اسی طرح ناکام ہوتا جس طرح یحیٰی ناکام ہوا۔ کام تو اس بر گیڈ نے کرنا تھا جو حالات

موافق نہ ہونے کی وجہ سے مزید کامیابی نہ حاصل کر سکا۔لیکن دراصل اختر ملک کی یہ سوچ اور عمل تو اس سازش کی ''کڑی'' تھی کہ میدانی علاقوں کے دفاع کرنے والی افواج کو اپنی ذمہ داری والے علاقے سے اٹھا کر آزاد کشمیر میں پھنسایا جا رہا تھا تا کہ بھارت لاہور اور گرد و نواح والے علاقوں پر آسانی سے قبضہ کر لے۔ پیدل فوج جس کی پہلے ہی ہمارے پاس کمی تھی اس میں سے تیرہ پلٹنیں چھمب جوڑیاں میں کوئی تزویراتی کامیابی حاصل کئے بغیر ''ناکارہ'' ہو گئیں کہ آگے جنگ میں ہم ان کو کہیں ''استعمال'' نہ کر سکے اور بھارتیوں نے کچھ ''زمین'' تو کھو دی لیکن ان کا کوئی ''تزویراتی'' نقصان نہ ہوا کہ کسی اور محاذ سے کچھ دستے وہاں تبدیل کرتے۔

101۔ 1965ء میں ہمیں شکست دلانے کے لئے کئی ''میدانوں'' اور ''پہلوؤں'' پر سازش پھیلی ہوئی تھی۔ جب اگست میں بھٹو اور اختر ملک کی اس تجویز ''جبرالٹر'' پر کام شروع ہوا۔ تو اس عاجز نے شور مچانا شروع کر دیا۔ کئی افسران میرے ''ہم خیال'' بن گئے کہ ہم نے واویلا کیا کہ اس کارروائی کی وجہ سے بھارت ہم پر حملہ کرے گا اور ہم ''جنگ'' کیلئے تیار نہیں۔ اگر یہ تجویز جاری رہنا ہے تو مزید پلٹنیں کھڑی کی جائیں اور ہم اس طرح چھاؤنیوں میں نہ بیٹھے رہیں۔ کچھ دستے آگے سرحدوں پر ہونا چاہیں۔ بھٹو، اختر ''لابی'' کی مجھ چھوٹے سے میجر پر بھی ''نظر'' تھی کہ میری تبدیلی کے احکام آ گئے اور مجھے مردان ہمارے ٹریننگ سنٹر میں تبدیل ہونا تھا۔ میں نے Represent کر دیا کہ مجھے جنگ نظر آ رہی ہے اور میں ان حالات میں تربیت کے کاموں کی بجائے ان لوگوں کے شانہ بشانہ جنگ میں شمولیت کو اپنے لئے اعزاز سمجھوں گا جن کو میں پچھلے چار سالوں سے تربیت دے رہا ہوں۔ اختر اور بھٹو لابی نے ہمارے ''بڑوں'' کو اس طرح ''برین واش'' کیا ہوا تھا کہ میرا بریگیڈ کمانڈر آفتاب کھلے طور پر دوسرے افسروں کے سامنے مجھ پر ''برس'' پڑا۔ ''کہ امیر افضل تم اکیلے ایسے دانا ہو جس کو جنگ نظر آ رہی ہے، جی ایچ کیو والے اور ہم سب بے وقوف ہیں۔'' میں نے کہا ''بریگیڈیئر

صاحب! مجھے ایک عام قسم کا میجر مت سمجھو۔ جب مجھے کمیشن کے لئے پہلی دفعہ چنا گیا تھا تو تم اس زمانے میں طفل مکتب تھے۔ فطرت کا کوئی راز ہے کہ تم جیسے لوگ بر گیڈیئر بنے پھرتے ہیں اور ہم جونیئر افسر ہیں۔ آپ میری درخواست پر جو افلاطونی ''بکھیرنا'' چاہو بکھیر دو۔ لیکن قانوناً تم اس کو روک نہیں سکتے۔ اگر جی ایچ کیو نے میری عرضداشت نہ مانی۔ تو ملک کے صدر کے دروازے کھٹکھٹاؤں گا۔'' سنتے ہیں کہ بر گیڈیئر آفتاب نے درخواست پر لکھا کہ میجر امیر افضل ایک بوڑھا افسر ہے جو 28 سال نوکری کر چکا ہے۔ اگر جنگ چھڑ بھی جائے تو یہ افسر کوئی اہم کام نہ کر سکے گا تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔'' لیکن جی ایچ کیو میں کوئی سنجیدہ افسر بیٹھا تھا۔ جس نے ریمارکس دیئے، امیر افضل ایک مخلص افسر معلوم ہوتا ہے اس کا ریکارڈ چیک کیا جائے کہ جنگ میں مخلص لوگ بہتر کام کرتے ہیں۔ تو میری پوسٹنگ کا معاملہ التواء میں پڑ گیا۔

102۔ اب یکم ستمبر 1965ء سے جو دونوں فوجوں کا ٹکراؤ ہو رہا تھا کہ فضائی فوج بھی لڑائی میں شامل ہو گئی تو باقی محاذوں پر تو فوجوں کو کچھ چوکنا کیا گیا۔ لیکن چھپے ہاتھوں کی سازش یہ تھی کہ لاہور بھارت کو ''پلیٹ'' میں دینا ہے اور بھارتی جنرل چودھری نے لاہور ''جم خانہ'' میں آ کر ''پیگ'' پینا ہے۔ بھارت والے 6 ستمبر کو ہم پر حملہ آور ہو رہے تھے، تو تب تک لاہور محاذ میں فوجوں کو چھاؤنی میں روکا جا رہا تھا کہ وزارت خارجہ بڑی شاہراہ کے گرد فوجوں کو بھیجنے کی اجازت نہ دے رہی تھی کہ غیر ملکوں میں ہمارا ''کیس'' کمزور ہو جائے گا کہ ہمیں ''جارح'' قرار دیا جائے گا۔ توبہ میرے اللہ۔ کون کس کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ ہماری پلٹن تو لاہور شہر میں برڈ ورڈ روڈ والی بارکوں میں تھی اور ذمہ داری کا علاقہ ضلع شیخوپور میں شاہدرہ سے آگے مقبول پور کے علاقہ میں تھا۔ وہاں میں نے اپنی مدد کے لئے کافی سویلین مجاہد تیار کئے ہوئے تھے۔ مجھے حکم مل گیا تھا کہ میری پوسٹنگ شاید نہ رک سکے۔ میں تو یہ چارج کیپٹن ظہور رانا کو دے دوں۔ ہماری 16 پنجاب کا کرنل گول والہ پارسی تھا جو نیا تھا اور صرف میجر غلام حسن کو

اور مجھے جانتا تھا۔ دل سے وہ چاہتا تھا کہ میری پوسٹنگ رک جائے اور اکثر مجھے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ 5 ستمبر صبح سات بجے ہمیں ڈویژن ہیڈکوارٹر میں ''نئے احکام'' کیلئے بلایا گیا۔ وہاں حکم ملا کہ مقبول پور کے علاقہ کا دفاع اب صرف میجر غلام حسن ایک کمپنی اور سویلین مجاہدوں سے کرے گا اور حسب معمول ہمارے میجر مبارک کی کمپنی راوی سائفن کا دفاع کرے گی۔ تیسری کمپنی، ہم پدھری کے علاقہ کے دفاع کے لئے تیسری بلوچ پلٹن کو دے دیویں۔ گول والہ ہیڈکوارٹر کمپنی اور چوتھی کمپنی کے ساتھ برگیڈ کی ریزو کمپنی اور جوابی حملہ کا کام کریں گے۔ پلٹن کے اس طرح ٹکڑے نہیں کئے جاتے لیکن فطرت کی یہ کوئی مشیّت تھی جو آگے واضح ہوگی کہ ہماری وجہ سے اور لوگ بھی 5 ستمبر کو محاذ پر چلے گئے۔ مزید حکم ملا کہ دیکھ بھال والے دستے 5 ستمبر سورج غروب ہونے کے بعد محاذ پر جا سکتے ہیں۔ لیکن ہر پلٹن کی بڑی یا زیادہ نفری 6 ستمبر پہلی روشنی کے بعد آگے محاذ پر جائیں۔ یہ عاجز پلٹن کا ٹرانسپورٹ افسر بھی تھا۔ مجھے اپنے دوست میجر صادق کے ذریعہ سے معلوم ہوگیا تھا کہ ڈویژن والے ٹرانسپورٹ دینے کا جو وعدہ کر رہے ہیں وہ پورا نہ ہو سکے گا کہ ٹرانسپورٹ جو یحییٰ خان کو ''پانچ سواروں'' میں شامل کرنے چھمب جوڑیاں گئی تھی واپس نہیں آئی۔

103۔ تو عرض کی کہ جناب فوجی سکھلائی میں دیکھ بھال والے لوگ علاقے میں دن کی روشنی میں آگے جاتے ہیں اور علاقے میں نشان لگا کر گائیڈ مقرر کرتے ہیں۔ بڑی فوج چھپاؤ کے ساتھ اندھیرے میں ان نشانوں اور گائیڈوں کی مدد سے پوزیشن لیتی ہے۔ یہ آپ کا الٹی قسم کا حکم سمجھ نہیں آیا اور ہماری پلٹن کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ آپ کی ٹرانسپورٹ واپس لاہور نہیں پہنچی، میں اپنے جوانوں کو کیسے اگلے محاذ پر جگہ جگہ پہنچاؤں گا۔ ڈویژن کا جی۔ ون G-One کرنل افتخار بشیر کہنے لگا۔ ''امیر افضل تمہارے ساتھ نوکری مشکل ہو جاتی ہے کہ سخت سوال کرتے ہو۔ 5/6 ستمبر شام کے وقت بھارت سے کچھ غیر ملکی مہمان آ رہے ہیں۔ ان سے پردہ ہے کہ باہر ملکوں میں یہ خبر نہ پھیل جائے کہ پاکستانی فوجیں جنگ کی

تیاری کر رہی ہیں۔'' میں نے کہا دس گھنٹے بعد جب 6 ستمبر کو ہم کھلے طور پر یڈ کرتے آگے محاذ پر جائیں گے تو چند گھنٹے پہلے اس خبر کے پھیلنے میں کیا نقصان ہے۔ لیکن ''کرفیو'' لگانا بھی ہے تو شالامار سے باٹا پور، واہگہ روڈ پر لگاؤ ہمیں کیوں ''باندھ'' رہے ہو۔ تو افتخار بشیر مجھے جنرل سرفراز کے پاس لے گیا کہ یہ تمہارے ملک صاحب یہ مشورہ دیتے ہیں۔ سرفراز نے کہا جی ایچ کیو والوں سے اس بارے میں اجازت لو اور پوچھو۔ آگے ایم او ڈائریکٹوریٹ کا کرنل اسلم پیپی جو میرے ساتھ سپاہی رہ چکا تھا ڈیوٹی پر تھا کہنے لگا ''ہم وزارت خارجہ سے اگر پوچھیں گے تو وہ پرانا جواب دیں گے۔ اس لئے میں پہلے احکام میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا کہ فوجیں صرف 6 ستمبر پہلی روشنی سے پہلے آگے محاذ پر نہ جائیں۔ تم لوگ اپنی Discreation استعمال کرو۔ سرفراز کہنے لگا: امیر افضل کو محدود اجازت دے دو لیکن شالامار، باٹا پور کے درمیان رات کے بارہ بجے تک کوئی فوجی ''حرکت'' نہ ہو۔ میں نے یونٹ میں پہنچ کر حکم دیا کہ ہمارے پاس گاڑیاں کم ہیں۔ وہ میں نے سب ''ٹکڑوں'' میں بانٹ دیں کہ گھر کا چکر لگا کر میں دوپہر تک پہنچ جاؤں گا اور ہم ایک ایک کر کے محاذ پر پہنچنا شروع کر دیں گے۔ میرا گھر پرانی انارکلی میں تھا، پہلے محاذ پر جاتے داتا صاحب دربار پر سلام کر کے شاہدرہ جاتے تھے۔ اب محاذ تبدیل ہو چکا تھا، تو میں جلد داتا دربار پہنچا، سلام عرض کیا، دو نفل ادا کئے تو گویا غائب سے آواز آئی۔ ''اٹھ جلدی کر دیر نہ کر جلدی محاذ پر پہنچ اور باقی لوگوں کو بھی محاذ پر لے جاؤ۔'' گھر بیوی، بچوں کو الوداع کہا اور پلٹن میں پہنچ گیا۔ ہر دستے کو کہا کہ جتنے آدمی گاڑی میں جا سکتے ہو۔ پھیرے لگا لگا کر اپنی ذمہ داری والے علاقہ میں پہنچو۔ اگر کوئی چیک کرے یا روکے تو ان کو بتاؤ ہمارے فاصلے دور ہیں۔ میجر صاحب نے ڈویژن والوں سے خاص اجازت لے کر ہمیں پھیرے لگا لگا کر آگے پہنچانے کا بندوبست کیا ہے۔ میں نے ملی جلی دعاء خیر پڑھی اور الگ الگ جگہوں پر جانے والوں سے الوداعی دعا سلام کیا اور یہ عاجز جلدی اپنی جمگاہ میں پہنچ گیا جو بھسانی پل کے علاقہ میں بی آر بی سے ایک یا دو میل پیچھے تھی کہ

ہم ریز رو میں تھے۔

104- عصر کے قریب گیارہویں بلوچ کے کرنل اقبال قریشی میرے پاس پہنچ گئے۔ کہنے لگے کہ تمہیں دیکھ کر میری پلٹن والوں نے بھی محاذ کی طرف کوچ کرنا شروع کر دیا ہے اور بارکوں کو خالی دیکھ کر میں بھی آ گیا ہوں۔ کیا کوئی حکم میں تبدیلی تو نہیں ہوئی کہ لوگ کل 6 ستمبر کی بجائے آج ہی آگے نکلنے شروع ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ کوئی فطرت کا راز معلوم ہوتا ہے جس نے ہمیں محاذ پر بروقت بھیج دیا ہے۔ کہنے لگا اچھا میرا کیپٹن مسعود سویلین کپڑوں میں چند جوانوں کے ساتھ بھیانی پُل پر پہنچا ہوا ہے۔ میں جاتا ہوں اور اس کو مزید چوکنا کرتا ہوں اور اس کی ساری نفری اس کو پہنچانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ میں نے کہا مسعود کو میرا سلام دینا کہ اس دفعہ ذمہ داریوں میں کچھ تبدیلی کی وجہ سے تمہارا ''لالہ'' (امیر افضل) تمہارے پیچھے ایک جمگاہ میں ہے اور کہہ رہا ہے کہ تم چونکہ اس محاذ کے ''رکھوالے'' ہو تو وہ رات خوب آرام سے سو جائے گا۔ قارئین! بھیانی پُل بھارت کی سرحد سے بہت نزدیک اور صرف ایک یا ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے اس لئے مسعود وہاں دیکھ بھال کے لئے پہنچا ہوا تھا۔ بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ میرا پیغام اس کے لئے ''رہنما'' بن گیا کہ ساری قوم سو رہی ہے۔ مسعود تُو آگے بڑھ اور اور بی آر بی سے آگے دفاع لے کر دشمن پر کڑی نظر رکھ۔ قارئین! یاد رہے کہ باٹا پور پل وغیرہ تو سرحد سے چار پانچ میل پیچھے ہیں۔ وہاں تو دشمن کئی گھنٹوں بعد پہنچا کہ آگے سے رینجر والوں اور میجر عارف جان شہید کے دیکھ بھال والے دستوں نے مقابلہ کیا اور میجر علم دین بھی شہید ہوا۔ لیکن کیپٹن مسعود کے ساتھ دشمن کا ٹکراؤ بہت سویرے اور بہت جلدی ہو گیا تھا کہ مسعود نے ایک بھارتی پلٹن کو تہس نہس کر دیا کہ وہ ''چوکنا'' تھا۔ اس نے اینٹی بکتر توپیں، گراؤنڈ رول میں استعمال کر کے پورے محاذ کو چوکنا کر دیا اور دشمن کو اپنے سامنے اتنا ناکارہ کیا کہ وہاں دشمن اپنے حملوں کو زیادہ دیر جاری نہ رکھ سکا۔ اوپر والوں کی کوتاہی کو رب سبحانہ نے نظر انداز کیا اور کسی نیک عمل والے کی وجہ سے لاہور کو

بچانے کا یہ پہلا معجزہ کر دیا۔

105۔ مجھے غیر ملکی مہمانوں کی آمد میں یہ دلچسپی تھی کہ جب وہ لاہور پہنچ جائیں تو میں سڑک کو زیادہ آزادی سے استعمال کر سکوں گا۔ اس لئے میں نے حوالدار معروف کو تھانہ مناواں بھیج دیا کہ وہاں پولیس والوں سے ملاپ کر کے چھپ کر ادھر ہی بیٹھا رہے۔ جب یہ ''مہمان'' تھانہ مناواں سے گزر کر لاہور جائیں تو مجھے آ کر خبر دینا۔ رات تقریباً آٹھ بجے معروف واپس آیا کہ کچھ امریکی مہمان تھے۔ تین جیپوں میں تھانہ مناواں پہنچے لیکن دو جیپوں کے ڈرائیور اور ایک جیپ واپس چلی گئی۔ میری بلا سے اس وقت میری دلچسپی مہمانوں کے لاہور پہنچنے سے تھی کہ میں شالامار سے آگے بھی پکی سڑک کو استعمال کروں۔ بعد کی تحقیق سے پتہ چلا کہ شاستری جنگ میں نہ ''کود'' رہا تھا کہ پاکستان سخت مقابلہ کرے گا۔ اس کو جنگ میں ''دھکا'' دینے کے لئے یہ اس کو ''سمجھانا'' تھا کہ محاذ خالی ہے۔ لاہور بھارت والوں کو پلیٹ میں مل جائے گا۔ یہ جیپوں کے ڈرائیور بھارتی فوج کے افسر تھے جن کو لیفٹیننٹ جنرل ہربخش سنگھ نے بھیجا تھا۔ جوان کی رپورٹ کا اٹاری میں بیٹھ کر انتظار کر رہا تھا۔ اس نے آدھی رات کے قریب دہلی جی ایچ کیو میں خبر بھیجی کہ پاکستان فوج محاذ پر نہ پہنچی تھی۔ وہاں جنرل چودھری کے دفتر میں گلزاری لال نندہ اور وزیر دفاع چون نے بڑی مشکل سے شاستری سے حملہ کی ''ہاں'' کرائی۔ 6 ستمبر پو پھٹنے یا پہلی روشنی میں نہ صرف لاہور محاذ پر بلکہ سیالکوٹ کے جسٹر محاذ پر اور قصور کے روہیوال محاذ پر بھی حملے ہو گئے۔ جسٹر محاذ پر تھرڈ پنجاب چوکنی تھی اور حملہ پسپا کر دیا۔ روہیوال محاذ پر ساتویں پنجاب کے کچھ علاقہ پر بھارتی کامیاب ہوئے لیکن پلٹن کے میجر (بعد میں کرنل اور ستارہ جرات) محمد یونس نے جوابی حملہ کر کے بھارت کی حملہ آور فوج کو تہس نہس کر دیا۔ لاہور محاذ پر حملہ کی کہانی آگے آ رہی ہے۔ یہ سب لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ شمال میں جسٹر سے لے کر جنوب میں روہیوال تک کے علاقے ہربخش سنگھ کے ماتحت تھے۔ وہ چوکنا تھا اور فوج کو چوکنا کئے ہوئے تھا۔ تو صبح سویرے اس کے علاقے میں حملے ہو

گئے۔ باقی بھارتی فوج بھی ''تیار'' تو تھی لیکن حملہ کرنے کے وقت کی خبر ان کے کور ہیڈ کوارٹروں میں آدھی رات کے بعد پہنچی تو آگے لڑائی اور حملہ کی خبر نہ پہنچائی جا سکی اور سیالکوٹ کے سچیت گڑھ محاذ، قصور کے قیصر ہند محاذ دونوں جگہوں پر 6 ستمبر صبح سورج چڑھے پگڑیوں والے سنتری کھڑے تھے اور یہی حالت سلیمانکی اور گدرا کے محاذوں پر تھی۔

106۔ قارئین! پوری تحریریں پڑھیں کہ چھپے ہاتھوں یعنی امریکہ والوں نے کیسے دونوں ملکوں کو ٹکرا دیا۔ نتائج البتہ فطرت کی خواہش کے مطابق ہوتے ہیں کہ پاکستان کچھ ''بچ'' گیا۔ لیکن بعض دفعہ فطرت ''مخل'' نہیں ہوتی۔ 48-1947ء کی کشمیر کی جنگ کے بارے میں 1990 کے پشاور کے سیمینار میں بریگیڈیئر محمود جان نے جو طارق ہیڈکوارٹر میں اس جنگ میں میجر تھا۔ اعلان کیا تھا کہ 48-1947ء کی جنگ کو ''جنگ'' نہیں کہہ سکتے وہ تو ''دوطرفہ'' جنگی مشق تھی۔ ہائر کنٹرول لندن سے دہلی میں ماؤنٹ بیٹن کو ''ہدایات'' دیتا تھا۔ ایک لوئر کنٹرول بھی دہلی میں تھا اور دوسرا راولپنڈی میں، دور کشمیر میں دونوں افواج کو جنگی مشقوں کی طرح لڑایا جاتا رہا۔ جب دونوں فوجیں جھنگڑ، پونچھ، اوڑی لائن پر پہنچ گئیں جس کی ''نشاندہی'' جنرل گریسی اپنے 20 اپریل 1948ء کے خط میں کر چکا تھا تو توپوں کے فائر سے دسمبر 1948ء میں ''آتش بازی'' کرا کے یکم جنوری 1949ء کو فائر بندی کرا دی۔ جس پر ہم اتنے سالوں سے بیٹھے ہیں اور ٹھک ٹھک کر رہے ہیں۔ قارئین! اب سوچیں کہ یہ امریکی مہمان 5/6 ستمبر رات کو لاہور کیا کرنے آئے تھے؟ لاہور میں ایک انٹرنیشنل ایگریکلچرل ادارے کی بہت بڑی پارٹی یا ''ڈنر'' تھا۔ سینئر فوجی افسروں جنرل سرفراز اور بریگیڈیئر قیوم شیر سمیت اس ڈنر میں ''مدعو'' تھے۔ شراب خوب لنڈھی اور دونوں لاہور کے ''محافظ'' جن کو بعد میں تمغہ ہلال جرات سے بھی نواز دیا گیا تھا۔ نشے میں دھت 6 ستمبر صبح نو بجے بستروں سے اٹھے اور تب تک ہم لوگ بھارتیوں کے ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے حملے کو بھی پسپا کر چکے تھے۔ قیوم شیر جس کا بریگیڈ ریزرو تھا اس نے تو

اپنے ماتحتوں کو بھی ''تنبیہ'' نہ کی تھی کہ اس کی یونٹیں 18 بلوچ اور 23 کیولری 6 ستمبر صبح اپنی بارکوں میں پی ٹی پریڈ کر رہی تھیں۔ تو بہ میرے اللہ۔ قارئین! میری کتابیں ایسی کوتاہیوں، نااہلیوں اور غداریوں کی باتوں سے بھری پڑی ہیں لیکن اس کتابچہ میں یہ عاجز تاریخ نہیں لکھ رہا۔ میرے محاذ پر گیارھویں بلوچ بروقت پہنچ گئی اور دشمن کو پاش پاش کر دیا۔ باٹا پور محاذ پر کرنل بعد میں جنرل تجمل ملک کی تیسری بلوچ بھی بروقت پہنچ گئی اور دشمن کو تہس نہس کر دیا۔ برکی محاذ پر سرحد برکی سے آگے بہت دور تھی۔ دشمن کو ہڈیارہ نالہ پر سترہویں پنجاب کے میجر شفقت بلوچ نے کچھ روکا اور گو میجر عزیز بھٹی برکی پل پر 6 ستمبر صبح پہنچا کہ وہ رات کو گھر سویا تھا۔ لیکن یہاں دشمن بھی 10 ستمبر کو پہنچا تو لاہور محاذ پر دشمن کسی جگہ بی آر بی کو پار نہ کر سکا۔

107۔ 8 ستمبر کو مجھے برگیڈ کی طرف سے ایک بڑا ''جاہلانہ'' حکم ملا کہ میں ایک تھری ٹن گاڑی کے پیچھے پانی کا ٹینک باندھ کر ان کو راوی سائفن سے باٹا پور تک چلا کر دیکھوں کہ بی آر بی کے اگلے کنارے پر وہ چل بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ مقصد یہ تھا کہ کیا ٹینک اگلے کنارے پر چل سکیں گے یا نہیں۔ ایسا کام امن کے زمانے میں مطالعہ کر کے تیار رکھا جاتا ہے اور اب بھی جو افسر بی آر بی کا دفاع کر رہے تھے وہ لوگ ایسا کام دیکھ بھال سے کر سکتے تھے۔ بہر حال شاید مجھے میرے ''گستاخانہ'' رویوں کی سزا دینا ''مقصود'' ہو۔ میں نے یہ حکم مانا لیکن ساتھ اپنی جیپ بھی رکھ لی کہ مجھے معلوم تھا کہ دشمن اس بڑی گاڑی کو جلد ''ٹارگٹ'' بنالے گا اور پھر ایسے ہی ہوا۔ دو میل کے سفر کے بعد وہ گاڑی دشمن کے فائر سے ناکارہ ہوگئی۔ شکر ہے کہ ڈرائیور بچ گیا۔ میں نے اگلے کنارے پر جیپ کے ذریعہ سے سفر کیا کہ تھوڑا چل کر کہیں کوئی آڑ ملتی تو جیپ کو روک لیتا اور بی آر بی کے سامنے جو میں نے بھارتی مردہ لاشیں دیکھیں تو ظاہر ہو گیا تھا کہ بھارت والے اب لاہور کے محاذ پر کوئی بڑا حملہ نہیں کر سکتے اور ہمارے لئے جوابی حملے کا بہترین موقع تھا۔ گو ہمارے بڑوں کی سکیم تھی کہ جوابی حملہ بھارتیوں کو بی آر بی کے پار کرنے کے بعد ہوگا۔ بہر حال میجروں اور ایک دو کرنیلوں کے زور دینے سے سارے محاذ

کے سامنے بھارتی پوسٹوں پر محدود حملے شروع ہو گئے زیادہ کامیاب حملہ واہگہ روڈ پر ہوا کہ بھارتی میجر جنرل نرنجن پرشاد اپنی جیپ چھوڑ کر محاذ سے پیدل فرار ہو گیا۔ ہماری 16۔ پنجاب پلٹن کی ریزرو میجر نذیر گل کی کمپنی بھی 9 ستمبر کی اس جوابی کارروائی میں شامل تھی کہ کچھ جوان شہید ہوئے اور میجر نذیر گل زخمی ہو گیا۔ یہ عاجز 9/10 ستمبر کی رات کو میجر گل کی جگہ لینے بی آر بی سے آگے ڈوگرئی گاؤں سے بھی آگے واہگہ محاذ پر پہنچ گیا۔ میجر مبارک کی کمپنی ہمیں واپس مل گئی تھی اور فیصلہ ہوا کہ ہماری دونوں کمپنیاں 10 ستمبر کو مزید حملہ کر کے دشمن کو اپنے علاقہ سے باہر پھینک دیں گی اور بکتر بند دستے ہماری مدد کو پہنچ گئے تھے۔

108۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں بھی ہراول میں میجر مبارک کی کمپنی کے ساتھ رہوں گا اور جہاں یہ کمپنی رک گئی تو کرنل گول والہ میجر نذیر گل والی کمپنی کو میرے پاس پہنچادیں گے کہ حالات کا واقف ہونے کی وجہ سے میں بہتر کارروائی کے لئے نئی کمپنی کو استعمال کر سکوں گا۔ لیکن ہم نے تھوڑی ہی پیش قدمی کی تھی کہ میجر مبارک شہید ہو گئے۔ ان کی لاش پیچھے بھیجتے ہی میں نے اس کمپنی کی کمانڈ سنبھال لی اور واہگہ تک دشمن کا صفایا کر دیا لیکن بعد دوپہر تجویز تبدیل کر دی گئی اور مجھے حکم ملا کہ میں واپس 14 میل کے پتھر ڈوگرئی گاؤں سے آگے آ جاؤں، اب ہم ''ساکن دفاع'' کریں گے کہ لاہور محاذ سے آگے پیش قدمی نہ کی جائے گی۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ قصور محاذ پر ہمارا بڑا جوابی حملہ ناکام ہو گیا ہے اور دشمن نے سیالکوٹ محاذ پر بہت بڑا حملہ کر دیا ہے۔ اب ہم ہر جگہ ''دفاع'' کریں گے۔ مانا کہ پیدل فوج کی کمی کی وجہ سے کسی بڑے پیمانہ پر پیش قدمی مشکل تھی۔ لیکن دفاع میں بھی جارحیت پیدا کرنا ضروری ہوتی ہے۔ لیکن اصلی بات آگے آ رہی ہے کہ ایوب خان دل چھوڑ چکا تھا۔ ہماری ساری فوج میں دو جنرلوں ٹکا خان اور ابرار حسین اور دو بریگیڈیئروں محمد اکبر اور ظفر کے علاوہ کوئی ایک سینئر افسر لڑنے والوں کو لڑائی لڑانے کے قابل نہ تھا۔ یہ لڑائی چند کرنیلوں اور زیادہ میجروں اور کپتانوں نے لڑی، اسی وجہ سے ستمبر 65ء کی جنگ کو میجروں کی لڑائی کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو

بچانے کی سعادت ''تین الفوں'' کو دی ایک خود ''الف۔اللہ کو'' دوسرے ''الف۔ایئر فورس'' کو اور تیسرے ''الف۔آرٹلری'' کو۔

109۔ قارئین کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں کہ اختر ملک اور بھٹو کی لابی اور سازشی ہمارے اندر بے حساب سطحوں پر ''گھسے'' ہوئے تھے اور انہوں نے مجھے ایک بوڑھا میجر قرار دلوا کر مردان سنٹر میں پوسٹ کروا دیا۔ تو قدرت نے مقبول پورہ کے پر امن محاذ کا چارج مجھ سے چھڑا کر مجھے لاہور کے بڑے اور واہگہ محاذ پر مرکزی کردار عطا کر دیا۔ یہ عاجز اس محاذ کا سب سے آگے والا کمانڈر بن گیا اور ایک ''ننگی جگہ'' جس کے سامنے نہ کوئی تار تھی نہ مائنز اور نہ کوئی ''آڑ'' وہاں دفاع لینا پڑ گیا۔ تو میں نے اپنے دفاع کو ''متحرک'' کیا کہ اپنے سے بہت آگے چھوٹی چھوٹی متحرک پوسٹیں لگائیں کہ دشمن کے دباؤ پر بائیں نکل جایا کرنا اور دشمن پر بازو سے فائر کرتے رہنا جب تک ایسا کر سکو، جب کچھ نہ کر سکو تو اپنی دفاعی پوزیشن میں واپس آ جانا۔ ایسی ہی پوسٹیں لگانے کے لئے 11 ستمبر کو میں آگے گیا ہوا تھا کہ سورج غروب ہونے کے بعد اپنی پوزیشن میں پہنچا تو حکم ملا کہ دونوں کمپنیاں اپنی یہ پوزیشن چھوڑ کر جلد سے جلد نئے پُل کے پاس بی آر بی پر پہنچیں۔ جو باٹا پور کے پل کے برباد ہو جانے کے بعد اس سے شمال میں میل، ڈیڑھ میل دور بنایا گیا تھا۔ مجھے اس حکم میں ''سازش'' کی بُو آئی، نذیر گل کی کمپنی کی کمانڈ آ کر کیپٹن صغیر حسین نے سنبھال لی تھی۔ ہم دونوں نے مشورہ کے بعد پروٹیسٹ کیا جو ہمارے کرنل گول والہ نے اوپر والوں کو پہنچا دیا کہ دشمن نے تو ابھی واہگہ سے اس طرف پیش قدمی شروع نہیں کی۔ ہم خواہ مخواہ کیوں فرار ہو رہے ہیں کہ بی آر بی کا دفاع اس سے آگے رہ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ پہلے تو ہمارے پروٹیسٹ کو کچھ مان لیا گیا۔ کہ اگلے حکم کا انتظار کریں۔ ایک گھنٹہ بعد پسپائی کے سخت احکام ملے۔ گول والہ اور صغیر پہلے پسپائی اختیار کر گئے۔ میں نے ان کی ''پسپائی'' اور اپنی ''پسپائی'' کو بھی Cover کرنا تھا۔ توبہ میرے اللہ۔ اسلام میں اسی لئے پسپائی کی خاص حالات کے بغیر اجازت نہیں کہ پسپائی ''بھگدڑ'' بن جاتی ہے۔ بڑی

مشکل سے جوانوں کو کنٹرول کرتے جب نئے پل کے پاس پہنچا۔ تو ہمارا نیا بریگیڈیئر کمانڈر قیوم شیر گھبراہٹ میں آئیں بائیں شائیں مار رہا تھا اور مجھے کہنے لگا ''تم نے بہت دیر کر دی ہے۔ جلدی پل کو پار کرو۔ میں نے یہ پل اڑنا ہے۔'' میں نے کہا کہ میں سب سے آگے والا کمانڈر ہوں، سارے محاذ پر میری نظر ہے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے میں واہگہ کے نزدیک تک چکر لگا آیا تھا۔ دشمن ہماری طرف کوئی پیش قدمی نہیں کر رہا، تم کس کے ڈر سے یہ کارروائیاں کر رہے ہو۔'' کہنے لگا ''تمہیں کیا معلوم ہے، دشمن کے تین ٹینکوں نے راوی سائفن پار کر لیا ہے۔'' میں نے کہا۔ توبہ میرے اللہ۔ ایسا کرنے کے لئے دشمن کو ایک لاؤ لشکر کی ضرورت ہے۔ جواب بھی محاذ پر نظر نہیں آ رہا۔ پھر راوی سائفن پر 15 بلوچ کا بی ایچلان ہے۔ پلٹن آگے پیش قدمی کر کے دشمن کے علاقے کے گاؤں منجھ اور گگڑ تک پہنچی ہوئی ہے۔ کیا وہ لوگ اپنے ریر (Rear) کی حفاظت نہیں کر رہے۔ تو بریگیڈیئر قیوم شیر کہنے لگا: پھر ہڈیارہ سائفن کو پار کیا ہوگا۔ تو میں ہنس پڑا کہ ہڈیارہ تو ''اکاڈیٹ'' ہے کہ نہر اوپر سے گزرتی ہے۔ نیچے سے ہڈیارہ نالہ گزرتا ہے۔ اور ''غلط العام'' کے طور اس کو بھی ''سائفن'' کہہ دیا جاتا ہے۔ وہاں نالہ میں کیچڑ ہے۔ وہاں سے کون سا ٹینک گزرے گا؟۔

110۔ اسی دوران 18 بلوچ کا میجر (بعد میں میجر جنرل) غلام محمد بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ تو اس نے کہا کہ میجر امیر افضل ہم سب جونیئر افسروں کا ''لالہ'' ہے کہ ان کی باتوں میں بڑا وزن ہوتا ہے۔ ہمیں حالات کی چھان بین ضرور کرنا چاہیے۔ تو میں نے مذاقاً گزارش کی کہ اگر دشمن کے تین ٹینک راستہ بھول کر راوی سائفن پر پہنچ بھی گئے ہیں تو وہ اس وقت ہمارا کیا کر لیں گے۔ بلوچ پلٹن والوں کو خبر دیں کہ وہ ان کو ''پکڑ'' لیں۔ تو سب ہنس پڑے۔ چھان بین کے وعدہ پر پل کو نہ اڑانے کا فیصلہ ہوا اور مجھے پل کے پیچھے دفاع میں رہنے کے احکام ملے۔ میں نے جوانوں کو کہا ''خوب اور اچھی طرح سے نیند کر لو ایک آدھ سنتری رکھو۔ یہاں دشمن کا کوئی خطرہ نہیں'' اور یہ عاجز خود بھی خوب سویا۔ قارئین! اس شوشہ کی چھان بین کئی صفحات کا

مضمون ہے۔ جنھوں نے ایسے ''شوشہ'' پر یقین کرلیا یا اثرات لئے۔ ان سب کو جنگ کے بعد ''توبرے'' چڑھا کر فوج سے نکال دینا چاہیے تھا کہ ایسے لوگ نہ صرف مومن کی فراست سے عاری تھے۔ بلکہ فوجی فراست سے بھی عاری تھے۔ لیکن کون ''توبرے'' چڑھاتا۔ ایوب خان اور موسیٰ خان، وہ خود نہ صرف چھپے ہاتھوں کی ڈگڈگی پر ناچتے تھے۔ بلکہ کسی حد تک اپنی کرسی قائم رکھنے کے لئے فوجی معاملات کی حفاظت بھی نہ کرتے تھے۔ بہرحال 12 ستمبر پہلی روشنی کے ساتھ کرنل گول والا میرے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔ ''امیر افضل! تم نے جو بریگیڈیئر قیوم شیر کے ساتھ سخت لہجہ اپنایا تو وہ کہتا ہے کدھر ہے تمہارا وہ بہادر کمپنی کمانڈر اس کو کہو کہ کل والی چھوڑی ہوئی پوزیشن پر دوبارہ قبضہ کرلو۔'' گولہ والا ڈر اس لئے رہا تھا کہ شاید میرا کیسا رویہ ہوگا اور کوئی شرط بھی پیش کردوں گا۔ کہ ہمیں فرار کیوں اور کس نے کرایا اس کے خلاف انکوائری ہونا چاہیے۔ میں آگے سے ہنس پڑا اور گول والا کو کہا کہ ''یہ کام ہمارے بغیر کوئی دوسر کر ہی نہیں سکتا۔'' اور اپنی کمپنی کو اشارہ کردیا کہ آؤ اللہ تعالیٰ کے راستے پر چل کر ملک کو بچائیں۔ باقی احکام میں چلتے چلتے راستے میں دیتا جاؤں گا۔ گول والا کہنے لگا: میں نے تمہیں اور بھی بہت کچھ بتانا ہے، میں اور کیپٹن صغیر تمہارے پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ تم ڈوگرئی سے آگے نہ جانا، پہلے اس گاؤں کی پوری تلاشی لینا۔ اگر دشمن وہاں تک نہیں پہنچا تو تب اگلی پوزیشن پر قبضہ کرنا اور ہاں بکتر بند دستے بھی تمہاری مدد کے لئے آرہے ہیں۔ میں نے ''سب احکام کے لئے بسروچشم، بکتر بند دستے اپنے کنٹرول میں رکھنا۔ مجھے ضرورت پڑی میں ان کو آگے منگوالوں گا وغیرہ۔ بات وقت کی ہے، جلد کارروائی کی ضرورت ہے۔

111۔ قارئین! اس پیش قدمی کا سرور میری زندگی کا انوکھا تجربہ ہے یا تو وہ قدم میرے نہ تھے جن میں چل رہا تھا۔ یا بدن جوان قدموں نے اٹھایا ہوا تھا۔ وہ یہ مادی بدن ہرگز نہ تھا، وہ کوئی ا روحانی بدن تھا۔ ڈوگرئی تک کا ڈیڑھ، دو میل کا فاصلہ پل بھر میں طے ہوگیا اور دشمن کے گولے ڈوگرئی میں گر رہے تھے۔ جن ''چھپے ہاتھوں'' نے ہمیں فرار کرایا تھا، انہوں نے

بھارتیوں کو بتا دیا ہوگا کہ علاقہ خالی ہے اور بھارتی بھی اس پوزیشن پر قبضہ کرنے کے لئے پیش قدمی کر رہے تھے۔ جنگیں زمان ومکاں کے اصول کے تحت لڑی جاتی ہیں۔ جس نے زمان ومکاں کا صحیح استعمال کیا، وہی جنگ جیت جاتا ہے۔ میں ہرگز ڈوگرئی کی تلاشی کے لئے نہ رکا اور نہ دشمن کے گولوں کی پرواہ کی، پیچھے خبر دی: ''ڈوگرئی خالی ہے، میں آگے جا رہا ہوں۔'' ڈوگرئی گاؤں سے آگے نکلتے چلتے چلتے حکم دیا۔ حمید میرے دائیں۔ امیر میرے بائیں، اعجاز میرے پیچھے، کل والی پوزیشن میں اپنے اپنے مورچوں میں پہنچو اور ہاں مجھ بوڑھے کا خیال رکھنا کہ میرا سانس ٹوٹ جائے تو مجھے سہارا ضرور دینا اور پل بھر میں ہم پرانے مورچوں میں تھے۔ دشمن ہماری اس حرکت سے بے خبر کھلی فارمیشن میں پیش قدمی چلتے چلتے کر رہا تھا۔ میں نے حکم دیا۔ خبردار کہ کوئی آدمی دشمن پر فائر نہ کرے۔ میں فائر کا سب کو اکٹھا حکم دوں گا۔ جب دشمن تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلہ پر پہنچا، تو میرے حکم سے سب نے فائر کھول کر دشمن کو ڈھیر کر دیا۔ رات کے اندھیرے میں مشین گن کی گولیوں کا ایک بکس غلطی سے وہاں رہ گیا تھا۔ نائیک نجیب گل نے اس کا خوب استعمال کیا دشمن نے سمجھا کہ شاید کسی آگے لگی ہوئی پوسٹ نے ان کا اتنا نقصان کیا۔ تو انہوں نے ہم پر سخت فائر کر کے مزید پیچھے والی کمک سے پیش قدمی جاری رکھنے کی کوشش کی تو کیپٹن صغیر کی کمپنی میرے دائیں بازو پر مورچہ زن ہو چکی تھی۔ انہوں نے بازوؤں سے میری کمپنی کو امدادی فائر دے کر دشمن کو تہس نہس کر دیا اور دشمن اپنے زخمیوں کو نکالنے اور ہمارے چنگل سے نکلنے کے قابل نہ تھا۔ تو انہوں نے اپنی مدد کے لئے بکتر بند دستے بلا لئے۔ تو ہماری 23 کیولری کا شیر دل کیپٹن سرور میری مدد کو پہنچ گیا اور دشمن کے دو ٹینک برباد کر دیئے۔ لیکن کیپٹن سرور کچھ زیادہ ہی آگے نکل گیا تھا۔ میں نے اس کو پیغام بھجوایا کہ وہ ذرا پیچھے کو ''ہل ڈاون'' پوزیشن اختیار کرے۔ لیکن اس کی قسمت میں شہادت لکھی تھی کہ اس کا ٹینک ''ہٹ'' ہو گیا اب گول والا بھی پہنچ گیا تھا اور اس نے دفاعی جنگ کی کمانڈ سنبھال لی۔ گھمسان کی جنگ میں ہمارے بھی کافی جوان شہید و

زخمی ہوئے لیکن دشمن کا نقصان سینکڑوں میں تھا۔ بعد دوپہر اپنے زخم چاٹتے وہ ہمارے ''چنگل'' سے نکل گیا کہ حسب معمول میں نے اپنے دفاع کو طول دے کر ''متحرک'' کرلیا۔

112۔ یہ عاجز لڑائی کی صرف خاص خاص باتیں لکھتا ہے اور جو بات لکھی جاتی ہے، ذرا وضاحت کرنا پڑتی ہے کہ قارئین بات کو سمجھ جائیں۔ اگر تمام واقعات لکھوں تو ایک کتاب میں بھی وہ نہ سمائیں گے اگلے بارہ دن دشمن کے ڈائریکٹ فائر اور سیدھے دو بدو مقابلے سے اس تھرتھراتی زمین پر کیسے گزارے اس کو ہم جانتے ہیں یا اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ حکم ہے کہ ہر بریگیڈ کمانڈر ہر دوسرے دن اپنی ماتحت پلٹن کے پوزیشن میں جاتا ہے۔ ہمارے بریگیڈیئر قیوم شیر کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ کسی ایک دن ہمارے بٹالین ہیڈ کوارٹر تک آ کر ہماری پرسان حالی کر جاتا۔ وہاں آنے والا فائر کی آواز سے بھی سہم جاتا تھا کہ ہر گولہ جو ہم دشمن پر فائر کرتے تھے ہمارے سروں سے گزر کر آگے جاتا تھا اور ہر گولہ جو دشمن فائر کرتا تھا وہ ہمارے سروں سے گزر کر پیچھے گرتا تھا۔ یا ہم پر گرتا تھا۔ ہمارے دونوں کوارٹر ماسٹر حوالدار رحیم گل اور منصب خان جو ہمارے لئے روٹی لاتے تھے کہ ایک دن ''ناغہ'' بھی کر دیا کہ ہم تک وہ نہ پہنچ سکے۔ مجھے صاف طور پر بتا گئے کہ یہاں کے دفاع والے جوان کوئی اور قسم کے انسان بن چکے تھے جو یہ سب کچھ برداشت کر رہے تھے۔ وہ تو یہ ایک گھنٹہ بھی ہمارے پاس رکتے تھے، توبہ توبہ کرتے رہتے تھے، اتنی مشکل جگہ کی ذمہ داری اتنے دنوں کے لئے صرف ہماری دو کمپنیوں کے پاس کیوں رکھی جب کہ اس محاذ پر ہمارے دو بریگیڈ موجود تھے۔ کوئی سازش تھی کہ دشمن اس تھوڑی سی فوج کو ختم کرنے کے بعد آسانی سے شالامار باغ پہنچ سکتا تھا۔ کہ آگے والے بھارتیوں نے جھوٹ بولا ہوا تھا کہ وہ شالامار باغ تک پہنچے ہوئے ہیں یا فائر بندی کے بعد بھارتی بڑ مار سکیں گے کہ وہ لاہور کے تاریخی مقام شالامار پہنچے ہوئے ہیں یا میری ''گستاخی'' کی وجہ سے ہمیں ''سزا'' دی جا رہی تھی۔ مجھے تو سب کچھ منظور تھا لیکن باقیوں کا تو کوئی ''قصور'' نہ تھا۔ بہر حال گھڑی گھڑی جوان شہید ہو رہے تھے اور میرے پاس تو وہ لوگ بہت کچھ ''چھوڑ'' کے جا

رہے تھے۔ جواب تک میں نے ''سنبھالا'' ہوا ہے۔ کہ ہر شہید پر شہادت پہلے سے چھا جاتی ہے۔ کسی پر کچھ دن پہلے اور کسی پر کچھ لمحہ پہلے۔ یہاں صرف ایک سید زادے لیفٹیننٹ افتخار جعفر کا ذکر کروں گا کہ ایک دن دشمن کے ٹینکوں نے ہماری بری حالت کی ہوئی تھی مورچہ سے سر باہر نکالنا مشکل ہو گیا کہ حوالدار میجر تازہ گل نے ہاتھ اوپر کیا۔ تو دشمن کے ٹینک نے برسٹ مار کر اس کا ہاتھ اڑا دیا۔ میں نے مطالعہ کے بعد ایک جگہ چنی کہ ہمارا کوئی ٹینک حفاظت سے وہاں آ کر دشمن کے ٹینک کو اڑا سکتا تھا۔ تو سید زادہ جعفر رضا کارانہ طور پر ٹینک وہاں لایا اور سب کچھ مجھ سے سمجھنے کے بعد جب فائر کیلئے تیار ہو گیا تو مجھے بھی اپنے ساتھ نعرہ ''مولا علی'' اور اللہ اکبر میں شامل کرتے دشمن کے ٹینک کو اڑا دیا۔ میں نے جب مبارک دی تو کہنے لگا ''میجر صاحب! مبارک آپ کو ہو کہ آپ نے تو ہماری کہانیاں بھی لکھنی ہیں۔'' دو دن بعد دشمن نے میرے بائیں بازو سے آگے بڑھ کر مجھے گھیرے میں لینے کی کوشش کی تو افتخار جعفر آگے مقابلہ کے لئے نکلا کہ میجر امیر افضل کی پوزیشن کی حفاظت ضروری ہے اور دشمن کو پسپا کر دیا لیکن خود بھی شہادت حاصل کر لی۔

113۔ قارئین! اس میدان جنگ کے واقعات، مشاہدات، تجربات اور ''واردات'' کے بیانات کئی کتابوں کے مضامین ہیں۔ کچھ باتیں میں ''افشا'' نہیں کرنا چاہتا۔ صرف چند ''واردات'' کی جھلکی دوں گا کہ باور کرایا جاتا۔ اے سپاہی! تم بڑی غلط فہمیوں کا شکار تھے اور ہو، سوچتے تھے کہ 1947-48ء کی کشمیر کی جنگ میں تمہیں انگریز جنرلوں نے ''باندھ'' کر لڑایا۔ اب جنگ ہوئی تو ہم دہلی سے ادھر نہ رکیں گے۔ ہمارے اندر ایسا ''کون'' ہو گا جو ہمیں روکے۔ بھلا بتاؤ کہ تم دہلی جا کر کیا کرو گے؟ اور پسی ہوئی بھارتی قوموں خاص کر مسلمانوں اور اچھوتوں کو کیا دو گے؟ یہ کافرانہ نظام؟ یہ تو ان کے پاس بھی وجود ہے۔ پھر کیا ایوب خان اور موسیٰ خان جیسے مومن کی فراست سے عاری اور منافقوں کو فتح کے ''سہرے'' باندھے جا سکتے ہیں؟ اور پھر کیا تمہاری فوج اسلامی فوج ہے؟ تمہارے بیچ یحییٰ خان اور حمید برہمی کی قسم کے

لوگ جنرل بنے ہوئے ہیں۔ جن کا کردار تم خود راولپنڈی کلب میں 1952ء سے 1957ء تک ''دیکھتے'' رہے ہو۔ یادرہے جہاد میں جذبہ محدود حد تک مددگار ہوسکتا ہے تمہارا دفاعی نظام کافرانہ ہے۔ تم لوگ جہاد کے نظریہ اور طرز زندگی ہونے یا اس کے تقاضوں اور تنظیم یا اسلامی فلسفہ حیات سے نابلد ہو۔ تمہارے بیچ کچھ مخلص لوگ ہیں اس لئے اس دفعہ کچھ بچ گئے ہو۔ لیکن کب تلک؟ قارئین! یہ صرف ایک پہلو تھا۔ دوسری طرف بھٹو لابی مجھے جنگ اور محاذ سے ہٹانے اور بھارتیوں کو شالامار باغ تک پہنچانے کی ہر سازش میں مصروف تھی۔ 18 ستمبر کو میجر فرید ملک سیکورٹی ڈیوٹی سے ''ریلیو'' ہو کر محاذ پر پہنچ گیا اور مجھ سے کمپنی کی کمانڈ لے لی کہ ڈویژن ہیڈ کوارٹر والوں نے اس کے ذریعہ حکم بھیجا کہ اگر میجر فرید، جنگ کے زمانے میں تبدیلی کے حکم مان رہا ہے۔ تو میجر امیر افضل، مردان تبدیلی کے احکام کیوں نہیں مانتا۔ لیکن یہ حکم میرے پارسی کرنل گول والا کی بھی ''برداشت'' سے باہر تھا۔ محاذ کی کمانڈ میرے سپرد کر کے وہ بر گیڈ ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔ ان کو کہا کہ ڈویژن والوں کو ایسا حکم دیتے شرم نہیں آتی۔ میرا ایک میجر شہید ہو گیا ہے اور دوسرا زخمی۔ ڈویژن کا کوئی سٹاف افسر آگے آ کر میجر امیر افضل کی جگہ لے لیوے تو میں میجر امیر افضل کو Spare کر دوں گا۔ البتہ وہ محاذ چھوڑتا ہے یا نہیں میں اس کو مجبور نہیں کر سکتا کہ اس کی درخواست کا جی ایچ کیو سے جواب نہیں آیا۔ بر گیڈ والوں نے جب یہ پیغام ڈویژن ہیڈ کوارٹر پہنچایا تو ڈویژن والے ''مکر'' گئے کہ انہوں نے میجر فرید کو ایسا پیغام دیا تھا۔ کوئی سٹاف افسر ذمہ داری نہ اٹھانا چاہتا تھا۔

114۔ جنگ کی شدت میں البتہ اضافہ ہو رہا تھا۔ میجر فرید جو جنگ کو اور مقامات پر دیکھ چکا تھا۔ حیران ہو گیا کہ جوان یہ حالات کیسے برداشت کر رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ شامل ہوئے 24 گھنٹوں کے بعد 19 ستمبر کو اس نے کرنل گول والا کو صاف کہا کہ یہاں سے مزید لڑائی کی ان جوانوں کی سکت ختم ہونے والی ہے ہماری تبدیلی کی جائے یا ہمارے دائیں بائیں سے آگے بڑھ کر دشمن پر دباؤ ڈالا جائے کہ ہم پر سید ھے اور نزدیک کے حملے بند ہوں۔ گول والا نے کہا

وہ کل یہی بات بر گیڈیئر قیوم شیر کو کہہ آیا۔ ے لیکن میں ان کو ''مجبور'' نہیں کر سکتا۔ بات بھی بڑی حیرانگی کی تھی کہ اتنے دنوں ہماری دو کمپنیاں دشمن کا دباؤ برداشت کریں اور ان کو اس طرح بے یارومددگار چھوڑ دیا جائے۔ جعفر شہید کی شہادت کے بعد بکتر بند دستے بھی اور پیچھے چلے گئے اور اوپر والوں نے ہماری یہ حالت کی ہوئی تھی ''کہ چڑھ جا بچہ سولی رام بھلی کرے گا۔'' بھٹولابی والے کمزور محاذ رکھ کر بھارتیوں کو شالا مار تک پہنچانا چاہتے تھے۔ بہر حال دشمن اب ہمارے بہت نزدیک پہنچ گیا۔ اسی 19 ستمبر کو سورج غروب ہونے کے بعد جب اندھیرا چھا گیا تو بھارتیوں نے دن کی دیکھ بھال سے ہمارے توپخانہ کے دونوں اوپی اور بیٹری کمانڈر کی سیٹوں کا کوئی نشانہ باندھ رکھا تھا کہ ڈائریکٹ فائر سے دونوں سیٹیں اکٹھی برباد کر دیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اپنے توپخانہ کی Cover میں بھارتیوں نے ہماری طرف سیدھی پیش قدمی شروع کر دی۔ مجھے علاقے کے ٹارگٹ نمبر جو مقرر کیئے گئے تھے زبانی یاد تھے۔ میں پیچھے دوڑا کہ 18 بلوچ کے کیپٹن خورشید کی کمپنی کے ساتھ جو توپخانہ کے میجر ضیاء الدین او پی، اوپی کا کام کر رہے تھے ان سے دشمن پر فائر کراتا ہوں جونہی پہنچا تو دیکھا کہ نہ صرف وہاں بھی توپخانہ کی سیٹ کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ بلکہ کیپٹن خورشید اور میجر ضیاء الدین بھی شہید ہو چکے تھے اور کمپنی کا صوبیدار شہداء کو پیچھے بھیج رہا تھا۔ اس کمپنی کا دشمن کے ساتھ سیدھا یا دوبدو لڑائی کا واسطہ تو نہ تھا۔ میں صوبیدار صاحب کو کچھ تسلی دے کر جلد گول والا کے ہیڈ کوارٹر واپس پہنچا۔ تو چند لمحوں بعد سامنے سے میجر فرید کی آواز آئی کہ وہ زخمی ہو گیا ہے اور جیپ پر ہسپتال جا رہا تھا۔ زخم کتنا تھا؟ اس پر بعد میں لے دے ہوتی رہی اور جنگ کے بعد بھی۔ لیکن ہم کسی اور مقصد کے تحت مضمون لکھ رہے ہیں۔

115۔ بہر حال میں نے کرنل گول والا کو کہا کہ افسر کے بغیر کمپنی زیادہ دیر مقابلہ میں نہ ٹھہر سکے گی۔ میں اپنی پرانی پوزیشن میں پہنچنے کیلئے آگے جا رہا ہوں، گول والا نے کہا ''اکیلے مت جاؤ'' میں نے کہا میرا کون ساتھی بنے گا۔ میں کسی کو زبردستی ساتھ نہیں لے جانا چاہتا، جو مجھے بھی

پیچھے کھینچے۔ لیفٹیننٹ (بعد میں کرنل) افتخار کہنے لگا ''وہ تیار ہے لیکن افسوس یہ ہو گا کہ جگہ کی واقفیت نہیں اور آپ کے آگے سینہ تان کر پیش قدمی کرنے کی بجائے آپ کے پیچھے چلنا ہو گا۔'' میں نے کہا ''کوئی بات نہیں، صرف یہ یاد رکھنا کہ بڑھاپے کی وجہ سے وہاں پہنچتے پہنچتے میرا سانس اکھڑ چکا ہو گا۔ تم وہاں پہنچ کر وہاں ایک زوردار نعرہ تکبیر لگا دینا۔'' عسکریت کے طالب علموں کو معلوم ہے کہ اندھیری رات میں حملہ والی جگہ تو کمک بھی نہیں بھیجی جا سکتی۔ اور کمانڈ سنبھالنا بھی مشکل ہوتا ہے کہ کیا معلوم اپنے لوگ پوزیشن میں ہوں گے یا دشمن وہاں پہنچ گیا ہو گا۔ بہرحال ہمارا اپنے رب پر توکل پورا ہوا اور افتخار نے نعرہ تکبیر اور میرے پوزیشن میں پہنچنے کا اعلان بھی کر دیا۔ تو صوبیدار چنار گل نے جوابی نعرہ تکبیر کے بعد پشتو اور پنجابی میں یہ بھی کہا۔ ''مجاہدو! تگڑے ہو رب سبحانہ نے میجر امیر افضل کو پھر تمہاری رہنمائی کیلئے بھیج دیا ہے۔'' یہ اس لئے ضروری تھا کہ جوانوں کو کچھ یقین سا ہو گیا تھا کہ میجر صاحب کو گولی نہیں لگتی اور ایسے ''طلسماتی'' آدمی کی کمانڈ کو سپاہی پسند کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ جنگوں کے تجربوں کی وجہ سے دشمن کے توپخانے کا فائر رکتے ہی یہ عاجز مورچے میں کھڑا ہو جاتا تھا اور جوانوں کو ہوشیار کرتا تھا۔ تو کچھ جوان سمجھتے تھے کہ فائر کے دوران بھی میں مورچے میں کھڑا رہتا ہوں۔ بہرحال میرے پہنچنے کی خبر کے بعد جوانوں نے تقاضا کیا کہ ہمارا توپخانہ حملہ آور دشمن پر فائر کیوں نہیں کر رہا ہے۔ اب جوانوں کو کیا بتاتے کہ ہمارا توپخانہ کے ساتھ ملاپ نہیں۔ تو میں نے حکم دیا کہ اینٹی ٹینک کا گولہ ہی اپنے سامنے فائر کر دو۔ اب اس فائر اور گولا کے گرنے سے جو روشنی ہوئی تو ہمیں دشمن اپنے بہت نزدیک نظر آیا۔ کچھ لوگ اینٹی ٹینک گولہ کی زد میں آئے اور کچھ کو جوانوں نے فائر کر کے واصل جہنم کر دیا۔ اور وقفے وقفے سے ہم یہ کارروائی دہراتے رہتے تھے۔ تو آدھی رات کو دشمن کا حملہ تھم گیا۔ اور دشمن نے ہمارے چنگل سے نکلنے کی کوشش شروع کر دی۔

116۔ اگلا دن یعنی 20 ستمبر بھی دشمن نے ہم پر فائر کرنے کی کوئی کسر نہ چھوڑی، لیکن ہماری طرف

پیش قدمی نہ کی۔ ظاہر ہے کہ دشمن کسی بڑے حملہ کی تیاری کر رہا تھا کہ انہوں نے جھوٹ بولا ہوا تھا کہ وہ بی آر بی کو پار کر چکے ہیں اور کسی وقت بھی فائر بندی سے پہلے شالامار باغ پر قابض ہو جائیں گے۔ سامنے دشمن ہم سے صرف تین چار سو گز دور تھا اور اس کے سب سیدھے حملے پسپا ہو چکے تھے۔ بائیں بازو کی طرف ایک حملہ لیفٹیننٹ جعفر شہید کی قربانی سے پسپا ہو چکا تھا۔ لیکن اب دشمن خودکشی والے حملوں کے لئے بھی تیار تھا کہ 21 ستمبر عصر کے وقت میرے بائیں بازو اور میرے فائر کی زد سے باہر دشمن کا ایک لاؤ لشکر ٹینکوں کی مدد سے لکھنکے گاؤں سے بی آر بی کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ ظاہر ہے دشمن بی آر بی کے ساتھ سر پھوڑ کر کچھ حاصل نہ کر سکتا تھا۔ جب ہم اس کے بازو پر بیٹھے تھے۔ دشمن کا مقصد ہمیں گھیرے میں لینا تھا اور میں نے گول والا کو آگاہ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمارے ٹینک جو ہمارے پیچھے ہمارے بائیں بازو کی حفاظت میں تھے۔ وہ میجر وحید قادر کے ماتحت پیچھے پسپا ہوتے نظر آئے اور جعفر شہید کی شہادت کے بعد، ان لوگوں نے ہماری ویسے بھی کوئی مدد نہ کی تھی۔ بہر حال یہ صورت حال بہت بھیانک تھی۔ گول والا خود بھی کچھ دیکھ رہا تھا لیکن میری رپورٹ سن کر گول والا، کسی وائرلیس سیٹ پر برگیڈ کو یہ گھمبیر حالات پاس آن کرنا نہ چاہتا تھا۔ صرف اتنا کہا کہ صورت حال ہمارے ہاتھوں سے نکل رہی ہے اور لیفٹیننٹ (بعد میں کرنل) افتخار، برگیڈیئر قیوم شیر کو زبانی صورت حال سے آگاہ کرنے کے لئے برگیڈ پہنچ رہا ہے۔ افتخار سورج غروب ہونے کے بعد قیوم شیر کے پاس پہنچا کہ دشمن ہمیں گھیرے میں لینے والا ہے۔ ہمارے ٹینک ہماری مدد سے پسپا ہو گئے ہیں۔ قیوم شیر نے کہا فائر بندی ہو رہی ہے۔ دشمن پاگل تو نہیں کہ آخری وقت اتنی سخت لڑائی مول لے۔ تم لوگ ویسے ہی گھبرا رہے ہو، اس وقت ویسے بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ افتخار یہ ٹکا سا جواب لے کر مڑا تو ہمیں گھیرا پڑ چکا تھا اور افتخار ہمارے پاس نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بلکہ اس نے فائر کی آواز سے صحیح انداز لگایا کہ دشمن نے ہماری دونوں کمپنیوں پر سامنے سے بھی حملہ کر دیا تھا۔ مجھ پر ڈوگرہ پلٹن نے اور کیپٹن صغیر کی کمپنی پر

بھارتی پنجاب رجمنٹ نے اور نویں جاٹ ہمارے پیچھے ڈوگرئی پہنچ چکی تھی۔ یہ ناموں اور نفری کی پوری نشاندہی تو خیر جنگ کے بعد ہوئی۔ البتہ افتخار نے بریگیڈیئر قیوم کو دوبارہ رات کے دس بجے جا کر بتایا کہ ہماری دو کمپنیاں گھیرے میں آ چکی ہیں جو اپنی آدھی نفری سے لڑ رہی تھیں اور سامنے سے بھی ان پر حملہ ہو گیا ہے۔ قیوم شیر نے کہا کہ وہ کیا کر سکتا ہے، صبح سویرے محاذ پر جا کر حالات دیکھ کر کچھ کروں گا۔

117۔ قارئین! قیوم شیر بہت کچھ کر سکتا تھا۔ رات کو آ کر حالات کا مطالعہ کرتا، ہمارے ساتھ رابطہ باندھتا۔ صرف ہم دشمن کے گھیرے میں نہ تھے، بھارت کی ایک پلٹن نویں جاٹ بھی ڈوگرئی گاؤں میں ہمارے گھیرے میں تھی۔ جس کی کوئی دفاعی پوزیشن نہ تھی۔ صبح سویرے سورج چڑھے ڈوگرئی گاؤں میں ٹینکوں کے تین چار گولے داغ دیئے جاتے تو چند جوان ان سے ہاتھ کھڑے کرا سکتے تھے۔ پھر بھارت والے ہماری پوزیشن پر جیسے انہوں نے حملہ کیا اور آگے ذکر آ رہا ہے۔ ایسا حملہ کبھی نہ کرتے کہ اس کا کوئی فائدہ نہ تھا کہ ہمارا گھیرا ختم ہو چکا ہوتا۔ قارئین! میں اپنی کون سی آہ و زاری لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ جنگ کے چند دن بعد جب بریگیڈیئر قیوم شیر نے اپنی چھاتی آگے کی کہ جنرل موسیٰ اس پر ہلال جرات کا بہادری کا تمغہ ''پن'' کرے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ رب سبحانہ نے مجھے طاقت دی کہ میں یہ ''منظر'' برداشت کر گیا۔ ورنہ اگر میں ادھر ہی اعلان کر دیتا کہ ''بریگیڈیئر قیوم شیر میری طرف دیکھو! کیا تمہیں یہ اعزاز لیتے شرم نہیں آ رہی؟'' اور میں یہ کچھ کہنے میں حق بجانب ہوتا۔ میرے خلاف فوج جو کارروائی کرتی مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔ لیکن میں ''چپ'' اس لئے رہا کہ میں میجر غلام حسن کے ساتھ ''خاموش'' رہنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ جنگ کی طرف واپس مڑتے 21/22 ستمبر ساری رات دشمن سے دو بدو لڑائی ہوتی رہی کوئی معجزہ تھا کہ ہم حیران ہوئے کہ 22 ستمبر پہلی روشنی جب ہوئی تو میری کمپنی کے تقریباً چالیس اور کیپٹن صغیر کی کمپنی کے تقریباً ساٹھ مجاہدین زندہ تھے۔ اور دشمن بھی ہمارے سامنے تقریباً دو،

تین سو گز کے فاصلے پر مورچہ زن ہو کر اپنے زخم چاٹ رہا تھا۔ مزید حملہ کی اس میں بھی سکت ختم ہو چکی تھی، لیکن بھارت کی جو پلٹن نویں جاٹ ڈوگرئی پہنچ گئی۔ صبح کی روشنی کے ساتھ انہوں نے گاؤں سے آگے نکل کر چوطرفہ دفائی پوزیشن اختیار کر لی۔ میری کمپنی کے پچھلے حصہ پر وہ ٹارگٹ دیکھ کر فائر کر دیتے تھے۔ دن کے دس بجے ہمارے سامنے بھارتیوں کو ٹینکوں کی مدد پہنچ گئی۔ بھارتی ٹینکوں نے میرے اور کیپٹن صغیر کی کمپنی کے صوبیدار حکیم کی پوزیشنوں کو روند ڈالا۔ لیکن چھوٹے ہتھیاروں کی مدد سے ہم نے بھارتی پیدل دستوں کو روکا ہوا تھا۔ تو اب آہ وزاری کی بجائے میرے دل سے چیخ وپکار نکل گئی۔ ''اے میرے رب کیا کوئی ایسی گولی نہ بنی تھی جو مجھے ٹھنڈا کر دیتی۔ اب سفید رومال ہلا کر کافر کی قید کی ذلت سے دوچار ہونا پڑے گا۔'' تو اسی وقت گول والا کا آخری پیغام ملا، کسی منظم پسپائی کا وقت کل رات سے ختم ہو چکا تھا جب ہمیں گھیرا پڑ گیا تھا۔ میں اور کیپٹن صغیر گھیرا سے نکلنے کی سعی کر رہے ہیں۔ تمہارا بھی کوئی مجاہد بچ گیا ہے تو سب کو گھیرے سے باہر نکل کر بی آر بی پر پہنچنے کی اجازت ہے۔ آگے کیا ہوا؟ پوری کہانی کیلئے کئی صفحات درکار ہیں۔ گول والا زخمی ہو کر متعدد زخمیوں کے ساتھ دشمن کا قیدی بن گیا۔ کیپٹن صغیر متعدد مجاہدوں کے ساتھ شہید ہوا۔ میری اللہ تعالیٰ نے جس طرح رہنمائی کی یا حفاظت کی، ایک ایک معجزہ رفقاء کے سامنے بیان کر چکا ہوں۔ پس کچھ عرصہ کے لئے ''عدم'' میں چلا گیا یا کیا ہوا۔ بعد دوپہر کچھ ''وجود'' میں واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بی آر بی پر کیپٹن صغیر کی کمپنی کے صوبیدار رستم اور تین چار جوان میری پرسان حالی کر رہے ہیں۔ ادھر ڈوگرئی گاؤں کی طرف دیکھا تو گھمسان کی جنگ جاری ہے کہ قیوم شیر نے غلط وقت اور غلط جگہ پر حملہ کرا کے پہلی بلوچ سے کیپٹن آفریدی سمیت متعدد مجاہدوں سے عظیم قربانی کرائی اور کچھ بھی نہ حاصل ہو سکا۔ البتہ ہماری عظیم قربانی کی وجہ سے بھارتی بھی شالامار نہ پہنچ سکے۔

118۔ رات کے بارہ بجے تک 22/23 ستمبر ہم نے بی آر بی پر گزارا کہ یہ فائر بندی کا وقت تھا۔

اور پھر اپنی پلٹن 16۔ پنجاب کا بی ایچلان تلاش کیا۔ جہاں پہنچ کر وضو کیا تو صبح کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد قرآن پاک جو کئی دنوں کے بعد کھولا۔ تو وہاں سیدھی نظر سورۃ الصفت کی اس آیت مبارکہ پر پڑی جسکے الفاظ ہیں ''وفدینہ بذبح عظیم'' غائب سے آواز آئی اٹھ اور اپنے شہداء کے دفن کا بندوبست کر۔ میں صوبیدار میجر محمد اشرف کو لے کر ڈوگرئی گاؤں پہنچا جہاں ہمارے بالمقابل بھارتی 54 برگیڈ کا کمانڈر نرنجن سنگھ موجود تھا۔ جسے کہا کہ وہ ہمارے علاقے سے اپنی لاشیں اٹھالیں اور ہمیں ان کے علاقے سے اپنے شہداء کی لاشیں اٹھانے دو۔ کہنے لگا کہ وہ حیران ہے کہ مقابلہ پوری پلٹن نہیں، صرف دو کمپنیاں کر رہی تھیں۔ پہلے قیدیوں کی وجہ سے ہم سب کمانڈروں کے نام جانتے تھے کرنل گول والا زخمی ہو گیا تھا اور ہماری قید میں ہے۔ کیپٹن صغیر کی لاش وہاں پڑی ہے لیکن حیرانگی کی بات ہے کہ آگے والا کمپنی کمانڈر میجر امیر افضل نہ ہمارا قیدی بنا ہے نہ اس کی لاش نظر آئی۔ میں نے صوبیدار میجر اشرف کو کہا کہ کیا تمہارا کوئی میجر امیر افضل تھا۔ ظاہر ہے اس نے ''نہ'' میں جواب دیا۔ تو میں نے نرنجن سنگھ کو کہا کہ میں تو Grave yard کے محکمہ سے تعلق رکھتا ہوں اور شہداء کو ادب سے دفن کے بندوبست کے لئے اس میدان جنگ میں آیا ہوں۔ ہم نے کوئی ستر کے قریب شہداء کے جسد تلاش کر لئے۔ لیکن 22 کے قریب شہداء کہیں زمین میں دب گئے یا جو کچھ ہوا، فرشتوں نے نظر سے اوجھل کر دیا ہو گا۔ ہمارے سامنے بھارتی، سینکڑوں لاشوں کی ٹانگوں میں رسی باندھ کر انہیں کھینچ کر اپنے علاقے میں لے گئے۔ ہم تو ہر شہید کو ہاتھوں سے اٹھا کر بوسہ دیتے تھے اور ادب کے ساتھ گاڑی میں رکھتے تھے۔ بے شک یہ عظیم قربانی تھی۔ لیکن بھارتی بھی ہمارے ہاتھ یاد رکھیں گے اور گو ہم صرف دو کمپنیاں تھیں لیکن بھارتیوں نے ہمیں ''کریک بٹالین آف پاکستان'' کا نام دیا۔ ان کے میڈیا میں ایسی خبریں شائع ہوئیں اور 29 اپریل 1969ء میں تو بھارتی لوک سبھا میں سناٹا چھا گیا۔ جب فرینک انتھونی نے ستمبر 1965ء کی جنگ میں صرف واہگہ محاذ کے بھارتی نقصان

(Casualties) یعنی مرنے والوں اور زخمیوں کی تعداد کو ملا کر دس ہزار کے قریب بتایا۔ اور بے شک ہمارے علاوہ جنگ کے پہلے دنوں میں باقی پلٹنوں نے بھی بھارتیوں کے بے حد نقصان پہنچایا جس کا ذکر یہ عاجز پیراگراف نمبر 107 میں کر چکا ہے۔

119۔ حیرانگی کی بات ہے کہ ہمارے اوپر والوں یعنی بریگیڈ یا ڈویژن میں سے کسی نے شہداء کے دفن کرانے میں ہماری کوئی مدد نہ کی کہ فوجی قبرستان میں ہم نے شہداء کو ایک شہید گنج میں دفن کیا جو جگہ اب بھی خوشبو سے مہکتی رہتی ہے۔ بلکہ کسی نے پرسان حالی بھی نہ کی تو قصور محاذ سے گیارہویں ڈویژن کا کرنل بی ایم مصطفیٰ (بعد میں میجر جنرل) جو گول والا سے پہلے ہمارا کمانڈنگ افسر رہ چکا تھا۔ وہ ہیلی کاپٹر پر میرے پاس پہنچ گیا۔ جس کو میں نے بتایا کہ تقریباً تین سو کی نفری سے صرف پچاس کے قریب جوان زندہ ہیں اور ہمارے ساتھ بریگیڈیئر قیوم شیر نے کیا کچھ نہ کیا۔ پوری کہانی سن کر وہ سیدھا جنرل سرفراز کے پاس گیا اور جب اس کو سب صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ بھی حیران ہو گیا۔ ادھر مجھے بریگیڈیئر قیوم شیر نے بلا بھیجا۔ میں اس کے ہیڈ کوارٹر پہنچا تو مجھے ''مرعوب'' کرنے کیلئے وہ ہوا میں باتیں کر کے ایکٹنگ کر رہا تھا اور مجھے کہنے لگا کہ خبردار میں حالات کسی کو نہ بتاؤں وہ چھان بین کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ مجھے Brief کرے گا کہ کیا کچھ بتایا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا ''تم کون ہو چھان بین کرنے والے کہ قانوناً ہر دوسرے دن تمہیں ہماری حالت آنکھوں سے دیکھنا تھی۔ تم نے ایک دن ہماری پرسان حالی بھی نہ کی اب لڑائی ختم ہو گئی ہے اور میں اپنی ''کشتیاں جلا چکا ہوں'' اور تمہیں اپنا کمانڈر تسلیم نہیں کرتا اور ڈویژن والوں کو اطلاع دوں گا۔'' میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے بی ایچلان میں پہنچ کر ڈویژن کے جی ون کرنل افتخار بشیر کو اطلاع دی کہ میں قیوم شیر کے ماتحت کام کرنے کو تیار نہیں۔ دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ بریگیڈیئر قیوم شیر کی جیپ میرے ہیڈ کوارٹر کے نزدیک آ کر رکی۔ تو میں نے پستول ہاتھ میں لیا اور دور سے پکارا کہ خبردار بریگیڈیئر قیوم میرے مرکز میں تم داخل نہ ہو، تو وہ وہاں سے ''کھسک'' گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ ہماری پلٹن کے میجر غلام حسن جو مجھ سے سینئر تھے اور مقبول پورہ محاذ پر تھے۔ وہ آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ آ کر میرے ساتھ لپٹ گیا۔ ''کہ امیر افضل تم نے قرون اولیٰ کے مجاہدوں کی طرح اسلام اور پلٹن کے نام کو بلند کر دیا ہے۔ اب مجھے اس پلٹن کی کمانڈ مل گئی ہے۔ سرکاری طور پر کمانڈنگ افسر میں ہوں گا۔ لیکن آپ ہمیشہ اس پلٹن کے روحانی کمانڈنگ افسر رہیں گے۔ اب مہربانی سے اس پلٹن کی نفری پوری کرنے اور منظم کرنے میں میری مدد کرو کہ دشمن ہماری دہلیز پر بیٹھا ہے جنرل سرفراز اپنے سٹاف کے ساتھ ابھی آ رہا ہے۔ وہ آپ لوگوں کی باتیں بھی سنے گا اور معذرت بھی کرے گا کہ ہماری مدد صحیح طور پر نہ ہوئی۔ وہ سینئر افسر ہے آپ مہربانی سے اس کے ساتھ ادب سے پیش آنا۔''

120۔ یہ تو چند دن بعد معلوم ہوا کہ ڈویژن ہیڈ کوارٹر والوں نے میجر غلام حسن کو ہیلی کاپٹر بھیج کر منگوایا تھا اور اس کو بتایا کہ اسے بہادری کے تمغہ کے ساتھ نوازا جا رہا ہے۔ وہ کسی طریقہ سے میجر امیر افضل کو ''کنٹرول'' کرے۔ حالانکہ جہاں میجر غلام حسن تھا۔ وہاں دشمن نے ایک گولی بھی فائر نہ کی تھی۔ راوی دریا کے اس طرف بھارتی ''توتی'' پوسٹ کو خود بخود خالی کر گئے۔ کیپٹن محمد صفدر اپنی کمپنی اور سویلین مجاہدین کے ساتھ وہاں پہنچا، تو بھارتی بارڈر پولیس، دریا سے پار جا چکی تھی۔ بہر حال میں نے میجر غلام حسن کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اب یہ غلام حسن کی عزت کا معاملہ ہے۔ تو میں اس سب المیہ کے بارے ''خاموش'' رہوں گا۔ لیکن میں اپنی کشتیاں جلا چکا ہوں، میری جنگ جاری ہے اور انشاء اللہ کئی ''محاذ'' کھولوں گا۔ (قارئین! کتاب پڑھنے کے بعد کئی محاذوں کی باتیں آپ کے سامنے آئیں گی اور یہ ''آہ وزاری'' بھی ایک قسم کا محاذ ہے کہ عاجزی کے ساتھ رب سبحانہ کے سامنے فریاد کر رہا ہوں)۔ بہر حال میں نے میجر غلام حسن کو مزید کہا کہ اب اس صورت حال میں جو میں نے ''خاموشی'' کا وعدہ کر لیا ہے۔ تو میں جنرل سرفراز کے ساتھ ملاقات نہ کروں گا کہ اس کو دیکھ کر شاید میں ''پھٹ'' پڑوں کہ آخر سرفراز نے کیوں اس طرح آنکھیں

اور کان بند کئے ہوئے تھے۔ اور محاذ کی صورت حال سے ''بے خبر'' تھا، سرفراز لیفٹیننٹ افتخار، صوبیدار رستم اور بچے ہوئے پچاس جوانوں سے مل لیوے۔ بہر حال سرفراز آیا تو اس کے ساتھ قیوم شیر بھی آ گیا اور سٹاف افسروں کا بھی ایک لاؤ لشکر ساتھ تھا۔ میجر غلام حسن نے جنرل سرفراز کو بتایا کہ میجر امیر افضل کی طبیعت ناساز ہے آپ باقی لوگوں کے ساتھ ملاقات کر لیں۔ تو وہاں صوبیدار رستم سمیت سب جوانوں نے اوپر والوں کو کھری کھری باتیں سنائیں۔ لیکن قیوم شیر کو دیکھ کر لیفٹیننٹ افتخار تو ''پھٹ'' پڑا اور پوری کہانی بیان کر کے قیوم شیر کو ''ننگا'' کر دیا، اب سرفراز، تو قیوم شیر کی بہادری کے اعزاز کے لئے سفارش کر چکا تھا۔ جی ایچ کیو کے ساتھ بات کر کے اعزاز کو روکنے کی کوشش کی لیکن لسٹ شائع ہو گئی تھی۔ صرف قیوم شیر کی مزید ترقی روکنے کی بات اوپر والوں نے مان لی۔

121۔ اب میجر غلام حسن (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل اور اب مرحوم) نے مجھے ''کنٹرول'' کرنے کے لئے کیپٹن اور بعد میں جنرل اور گورنر پنجاب محمد صفدر کو میرا ''مددگار'' بنا دیا کہ پلٹن کو نئی تنظیم دیں اور ساتھ ہی گول والا سمیت اور بہادروں کو اعزاز دلوانے کیلئے سفارشات بھی میں نے لکھنی تھیں اور کافی سفارشات منظور ہوئیں۔ لیکن اتنے زیادہ شہداء کی نہ کوئی یادگار بنانے دی اور نہ ان شہداء کے نام پر کسی سڑک کو موسوم ہونے دیا کہ قوم کو معلوم نہ ہو جائے کہ اتنی بڑی قربانی اوپر والوں کی کوتاہی کی وجہ سے تھی۔ بلکہ واہگہ محاذ کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لئے لاہور کے برکی محاذ پر میجر عزیز بھٹی کو نشان حیدر دلوا دیا۔ بھٹی کا دشمن کے ساتھ صرف ایک دن معمولی ٹکراؤ ہوا تھا اور وہ بھی بی آر بی کے پیچھے ہی 11 ستمبر کو جہاز کی گولی لگنے سے بھٹی شہید ہوا۔ اس کے آگے 15 ستمبر تک 12۔ پنجاب کے نائب صوبیدار عالم زیب پاکستان کی ایک میل کی دوڑ کا ریکارڈ ہولڈر بہادری سے لڑتا بی آر بی کے آگے شہید ہوا۔ عزیز بھٹی چونکہ مشہور افسر تھا اور 1949ء میں پی ایم اے سے اعزازی تلوار بھی حاصل کر چکا تھا تو اس کے کرنل ابراہیم قریشی نے بھٹی کے رویہ کو سراہتے اس کے لئے ستارہ جرات کی سفارش کی تھی۔

لیکن ڈویژن سے حکم آیا کہ بھٹی کے لئے نشان حیدر کی سفارش بھیجو۔ اب اس کے لئے تین چشم دید گواہوں کے دستخطوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو بھٹی کے ساتھ جو توپخانہ کا صوبیدار اوپی کا کام کر رہا تھا۔ اس نے بھٹی کی کسی بہادری پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اب کیسے خانہ پری کی یا کس کو جھوٹا گواہ بنایا گیا۔ واللہ اعلم۔ البتہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جنرل سرفراز کی دوسری بیوی جو ایک نرس تھی وہ قادیانی بھی تھی۔ عزیز بھٹی خود قادیانی تھا یا نہیں لیکن اس کے خاندان کے اکثر لوگ قادیانی یا چھپے قادیانی ہیں اور بھٹی کو یہ اعزاز قادیانیوں کی ''ٹریڈ یونین'' نے دلوایا۔ 1949ء میں اعزازی تلوار بھی بھٹی کے ساتھ کیڈٹ ملک شریف کو مل رہی تھی جو آدمی بعد میں کرنل کے طور پر گورنر مغربی پاکستان ملک امیر محمد کالاباغ کا ملٹری سیکرٹری بھی رہا۔ تو 1949ء جنرل اختر ملک کاکول اکیڈمی میں کرنل تھا۔ تو قادیانیوں کی ''ٹریڈ یونین'' نے اختر ملک کی مدد سے اعزازی تلوار عزیز بھٹی کو دلوا دی۔ قارئین! قادیانی یا چھپے قادیانی اس ملک میں کیا کچھ کرتے ہیں۔ یہ عاجز جگہ جگہ جھلکیاں دیتا رہا۔ لیکن اپنی کتابوں میں اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں اور قادیانیوں کی ان شر پسندیوں کو یہ عاجز شرعی عدالت اور سپریم کورٹ میں بھی پیش کر چکا ہے۔ جس کی جھلکی بھی پیراگراف نمبر 147 وغیرہ اور اس سے اگلے پیراگرافس میں آ رہی ہے۔

122۔ ستمبر 1965ء کی جنگ پر یہ عاجز بہت کچھ لکھ چکا ہے کہ لاہور کے محاذ پر برکی کے علاقہ میں بہت معمولی لڑائی ہوئی چند جوان اور دو افسر شہید ہوئے اور وہ بھی بی آر بی کے پیچھے واہگہ محاذ پر ہمارے سو سے اوپر شہداء کے علاوہ باقی مددگار یونٹوں کے کل شہداء کی تعداد بھی سو کے قریب بنتی ہے کہ بی آر بی کے آگے دشمن کے ساتھ دوبدو لڑ کر گیارہ افسران نے شہادت حاصل کی اور اس محاذ پر ایسی اینٹ سے اینٹ بجی کہ درخت بھی اکھڑ گئے اور 22 شہداء کو ہم تلاش ہی نہ کر سکے۔ لیکن اوپر والوں نے عزیز بھٹی کو نشان حیدر دے کر برکی محاذ کو ''مقدس'' بنا دیا کہ کوئی آدمی واہگہ محاذ کی کوئی کھوج نہ کرے۔ سب محاذوں پر ایسی کوتاہیاں بھی ہوئیں اور

کچھ لوگ بڑی بہادری سے لڑے۔ لیکن یہ عاجز اس جنگ پر اختتامی تبصرہ کرنے کے لئے صرف چند جھلکیاں دے گا۔ قصور محاذ کے میجر جنرل نصیر اور اس کے دو بریگیڈیئر بشیر اور لمب اتنے کوتاہ ثابت ہوئے کہ جنگ ختم ہوتے ہی ان کو گھر بھیج دیا گیا۔ یہ عاجز پہلے گزارش کر چکا ہے کہ بکتر بند دستوں کی مدد کے لئے پیدل فوج تو نہ ہونے کے برابر تھی کہ یحییٰ خان کو ''پانچ سواروں'' میں شامل کرنے کے لئے یہ فوج چھمب جوڑیاں کے ''فنل'' میں پھنسا دی گئی تھی۔ اتنی بڑی مہم جو اپنے علاقے کے روہیوال نالہ سے شروع کرنا تھی، اس پر صرف ایک پل تھا۔ جس کے ساتھ میجر دوست محمد کا ٹینک ٹکرا گیا اور میجر صاحب بھی شہید ہو گئے اور پل بھی بند ہو گیا۔ تو بریگیڈیئر بشیر کی نالائقی کہ وہ پل ٹھیک نہ کرا سکا اور اسلام کے عظیم فرزند کرنل صاحبزادے گل فاتح کھیم کرن کو محاذ سے واپس آ کر خود پل ٹھیک کرانا پڑا۔ دوسری پیش قدمی میں وہ مزید بہت کچھ حاصل کرنے کے بعد خود بھی شہید ہو گیا۔ تو مزید پیش قدمی کے لئے بریگیڈیئر لمب کو ذمہ داری دی گئی، جس نے اپنی یونٹوں اور ٹینکوں کو پٹرول سپلائی کرنے کا بھی پورا بندوبست نہ کیا۔ تو اس کے کرنل نذیر نے جب شکایت کی تو طنزاً کہنے لگا: تم مسلمان امن کے زمانے میں جہاد کی بہت باتیں کرتے تھے، اب پٹرول ختم ہے تو پیدل ہی حملہ کو جاری رکھو۔ کرنل نذیر نے اپنے جوانوں سے پیدل ہی پیش قدمی کرائی اور کرنل نذیر خود زخمی ہو کر دشمن کی قید میں چلا گیا۔ اب پٹرول کا تو کرنل نذیر نے پہلے کچھ بندوبست کر لیا تھا۔ لیکن ان رکاوٹوں نے بھارتیوں کو ''موقع'' دے دیا کہ میدان جنگ میں پانی چھوڑ کر انہوں نے میدان جنگ کو دلدل بنا دیا۔ جس کا ذکر اکثر کتابوں میں ملتا ہے کہ یہ کچھ سن کر ایوب خان دل ''چھوڑ'' بیٹھا۔ اگر پیدل فوج وافر ہوتی تو دلدل کے علاقے میں وہ لوگ ہراول کا کام کرتے۔ اور بکتر بند دستے پکی سڑک کو استعمال کر کے دلدل کے بعد پھر ہراول کا کام کھلی فارمیشن میں کر کے دو دن کے اندر امرتسر پہنچ جاتے۔ اس کوتاہی پر ہم پہلے بھی بہت رونا رو چکے ہیں کہ علاج موجود تھا۔ میجر جنرل عبدالحمید برہمی کے گیارہویں ڈویژن کے سامنے

سے دشمن فرار ہو گیا تھا۔ اگر جنرل حمید کوشش کرتا کہ اس کے دستے بازو سے ساری صورت حال دیکھ رہے تھے۔ وہ لوگ دلدل والے علاقوں میں پیدل دستوں سے ایک آدھ میل پیش قدمی کر کے ساری ذمہ داری سنبھالنے کے قابل تھے۔ تو بکتر بند دستے پھر پیش قدمی کر سکتے اور لاہور محاذ کے پیدل دستے بھی مددگار بن سکتے تھے، راقم یہ بیان کر آیا ہے کہ میں 10 ستمبر ہراول دستوں کے ساتھ واہگہ پہنچ گیا تھا۔ دشمن سر پر پاؤں رکھ کر اٹاری کی طرف بھاگ رہا تھا اور جنرل چودھری نے بیاس دریا کے پیچھے تک پسپائی کرنے کے احکام کی تنبیہ کر دی تھی۔ لیکن ہم نے کچھ بھی نہ کیا۔ ایوب، جنرل حمید پر ان دنوں کچھ ''ناراض'' ضرور ہوا۔ لیکن حمید، یحییٰ کے بے حیا ٹولہ کا نمبر ٹو (Two) آدمی تھا۔ جنگ کے بعد الٹا ایوب نے اس کو ترقی دے دی کہ چھپے ہاتوں نے اس بے حیا ٹولہ سے پاکستان کو دولخت کرانا تھا۔ توبہ میرے اللہ۔ تو ہماری جوابی حملے والی کارروائی بھی قصور محاذ کے علاقہ میں بری طرح ناکام ہو گئی۔

123۔ سیالکوٹ محاذ پر غیر پیشہ وارانہ ڈویژن کمانڈر اسمٰعیل اور بکتر بند دستوں کے مشیر بریگیڈیئر آفندی دونوں کو ان کی کم دلی کی وجہ سے جنگ کے شروع دنوں میں ہی ان کے عہدوں سے ہٹانا پڑ گیا۔ لیکن رب سبحانہ نے کئی معجزوں سے اس محاذ پر ہماری عزت رکھ لی ہے۔ پہلے دن یعنی 6 ستمبر کو سیالکوٹ کے صرف جسڑ محاذ پر حملہ ہوا۔ جو معمولی تھا اور پسپا کر دیا گیا۔ لیکن بریگیڈیئر مظفر الدین گھبرا گیا اور کمک کی درخواست کی۔ تو بریگیڈ نمبر 24 جو درمیانی علاقوں کا دفاع کر رہا تھا، ان کو جسڑ بھیج دیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جسڑ کے سامنے دشمن کا صرف ایک بریگیڈ تھا۔ دشمن بھرپور طاقت سے سانبھہ کے علاقے سے چونڈہ پر حملہ کر رہا ہے۔ تو ادھر جسڑ سے 24 بریگیڈ واپس مڑا اور سیالکوٹ سے کرنل نثار کی ٹینک رجمنٹ چونڈہ کی طرف چلی، جن کے پاس پیٹن ٹینک تھے۔ تو بھارتیوں کو اول یہ غلط فہمی ہو گئی کہ پاکستان کا پورا پہلا بکتر بند ڈویژن آ گیا ہے جن کے پاس پیٹن ٹینک تھے۔ پھر دو طرفہ متحرک دستوں نے بھارتیوں میں کھلبلی مچا دی کہ سامنے سے جنرل ابرار کا چھوٹا اور چھٹا بکتر بند ڈویژن بھی مقابلہ کے لئے

پہنچ گیا اور بھارت کی تین ڈویژن فوج اس حملے میں بری طرح ناکام رہی کہ فطرت نے کچھ غیر تمند اور بہادر آدمی بھی سیالکوٹ محاذ پر اکٹھے کر دیئے۔ جن میں میجر جنرل ٹکا خان، میجر جنرل ابرار، پنجاب رجمنٹ کے کرنل بعد میں میجر جنرل جمشید بلوچ رجمنٹ کے کرنل بعد میں بریگیڈیئر شنواری، فرنٹیر فورس کے کرنل صدیق فقیر بکتر بند دستوں کے کرنل بعد میں بریگیڈیئر نثار، توپخانہ کے کرنل اور بعد میں بریگیڈیئر عطا محمد کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ جونیئر افسروں میں بکتر بند دستوں کے میجر عباسی اور بلوچ پلٹن کے میجر نسیم رضوی بکتر بند دستوں کے کیپٹن مسعود اختر جو راجہ حسن اختر کے بیٹے تھے اور کرنل پیر عبداللہ شاہ کے بیٹوں اور متعدد شہداء نے سیالکوٹ کی سرزمین کو اپنے خون سے سینچا۔ میجر بعد میں کرنل شیخ عبدالرؤف جیسے لوگ ہسپتال سے محاذ پر پہنچ گئے کہ ہوائی جہازوں سے ٹارگٹوں پر فائر کرانے والا کوئی افسر نہ مل رہا تھا۔ میجر بعد میں کرنل محمد حسین ملک نے اکیلی کمپنی کے ساتھ بھارت کی ایک پلٹن کو بھگا دیا۔ قصور محاذ سے جنرل نصیر کو ہٹا کر جنرل صاحبزادہ یعقوب کو لایا گیا۔ تو وہاں سے وہ کافی بکتر بند دستوں کے ساتھ سیالکوٹ محاذ پر پہنچ گیا۔ اب ہم نے ہر طرح سے سیالکوٹ محاذ پر برتری حاصل کر لی تھی کہ ہم Interior Lines پر تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ فوجوں کی کمک ہمارے لئے بھارت کی نسبت آسان تھی۔ جونئ پلٹنیں کھڑی کیں وہ بھی محاذ پر پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ اگر صاحبزادہ یعقوب ہمت کرتا تو ہم نہ صرف جموں اور پٹھانکوٹ کے درمیان رابطہ کاٹ سکتے تھے بلکہ بھارتی بکتر بند ڈویژن ہمارے جال میں پھنس چکا تھا۔ اس کو تباہ و برباد کر سکتے تھے اور ہر محاذ پر پیش قدمی کے قابل تھے۔ لیکن صاحبزادہ یعقوب اور سیالکوٹ کے چونڈہ کے علاقہ کا بریگیڈیئر عبدالعلی قادیانی کچھ کرنے کو تیار نہ تھے کہ فائر بندی ہونے والی ہے، اب لڑائی کو کیوں طول دیا جائے۔ ایوب بھی دل چھوڑ چکا تھا اور ہم نے کچھ بھی نہ حاصل کیا اور فائر بندی ہو گئی۔

124۔ بے شک بھارت والے بھی کچھ حاصل تو نہ کر سکے لیکن انہوں نے کھویا بھی کچھ نہ اور وہ

ہمارے سیالکوٹ اور لاہور کے وسیع علاقوں پر بھی قابض تھے۔ ہم نے محدود مقامات کھیم کرن اور چھمب جوڑیاں ضرور فتح کیے۔ لیکن یہ جنگ کسی کی بھی فتح نہیں۔ ایوب خان سمیت ہمارے کچھ جرنلوں نے اپنی شخصیتوں کے گرد جوریت کی بنیادوں پر قلعے تعمیر کیے ہوئے تھے۔ وہ سب پاش پاش ہو گئے۔ ایوب کو تو اس جنگ نے ''ادھ موا'' کر دیا۔ اس نے کہا میری توبہ اب وہ جنگ کا نام بھی نہ لے گا۔ یہ جو ہماری اخباروں میں آئے دن گوہر ایوب کوئی شوشہ چھوڑ کر ایوب کی شخصیت بنانے پر لگا رہتا ہے۔ ایوب بے چارہ بہت ہی اوسط درجہ کا ذہن رکھتا تھا۔ اور علم کے لحاظ سے پڑھا ہوا ''ان پڑھ'' تھا۔ اس لئے جب الطاف گوہر وغیرہ نے فیضی اور ابوالفضل کا کردار اپناتے ایوب کو ماڈرن اسلام کے راستے پر لگایا تو اس نے اسلام کو بھی ''ریفارم'' کرنا شروع کر دیا اور ''اکبر ثانی'' بننے کی کوشش کی۔ توبہ میرے اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے ایوب کو سنہری مواقع عطا فرمائے تھے۔ اس نے ''جھوٹ'' کے بغیر قوم کو کچھ بھی نہ دیا یا دولت کے انبار لگانے کی طرح ڈال گیا اور جب موقع ملا، قوم کو خوب بے قوف بنانے کی کوشش کی کہ قوم بھی ایسی ہے۔ انہیں بتایا گیا ستمبر 65ء کی جنگ ہماری بڑی فتح تھی۔ افسوس! کہ ہم تو دہلی فتح کرنے کے لئے نکلے تھے اور پہلے مرحلہ میں کشمیر کو آزاد کرانا تھا۔ لیکن کیا حاصل کیا، امرتسر تک بھی نہ پہنچ سکے۔ اس لئے تاشقند میں جو کچھ حاصل کر سکتے تھے، وہی کچھ حاصل کیا، لیکن بھٹو جس نے خود تاشقند کا ڈرافٹ تیار کیا تھا اس نے پینترا تبدیل کیا اور کہا کہ ہم جیتی ہوئی ''بازی'' تاشقند کی ''میزوں'' پر ہار گئے۔ ایوب خان اور موسیٰ کیسے کہتے نہیں یہ جنگ ہماری فتح نہیں تھی۔ یہ ہوتے ہیں جھوٹ کے نتائج کہ ایک جھوٹ کے دفاع میں مزید سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ الطاف گوہر نوائے وقت کے ایک مضمون میں لکھتا ہے۔ ایوب کو سخت افسوس ہوا کہ ستمبر 65ء کی جنگ کے بارے اپنی بہادریوں کو ظاہر کرنے اور کوتاہیوں کو چھپانے کے لئے بہت جھوٹ بولے گئے۔ بے چارے ایوب کو یاد نہ رہا کہ اس روایت کا ''بانی'' وہ خود تھا۔ 48-1947ء میں کشمیر میں

داخل بھی نہ ہوا اور ایک اس سلسلہ کی میٹنگ میں شرکت کی وجہ سے خود ہلال جرات کا تمغہ حاصل کر لیا تھا۔

125۔ اب تاشقند کے معاہدہ کے بعد سب ''جھوٹے'' فکر مند تھے کہ اس چھوٹے سے میجر کے اخباروں کے ساتھ بھی تعلقات میں اور حکومت یا جی ایچ کیو کے ایوانوں میں بھی کچھ لوگ اس کی عزت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ رابطے میں ہیں۔ فائر بندی کے فوراً بعد جی ایچ کیو سے مجھے خبر مل گئی تھی کہ میری درخواست منظور کر لی گئی ہے اور میں 16۔ پنجاب میں لاہور ہی میں رہوں گا۔ لیکن فروری 1966ء میں میرے رابطے توڑنے کے لئے دوبارہ مجھے مردان جانے کا حکم مل گیا کہ وہاں ایک نئی پلٹن 35۔ پنجاب کھڑی کر کے کوئٹہ لے جاؤں اور مجھے سپیشل طور پر اس پلٹن کا کرنل بنایا جا رہا ہے۔ یہ جھوٹ تھا لیکن میں نے حکم مانا اور تین ماہ بعد اس پلٹن کے کرنل کا تقرر ہو گیا۔ لیکن اب ISPR والوں نے تقاضا شروع کر دیا کہ انہیں میری ''خدمات'' کی ضرورت ہے اور یہ عاجز حسب توفیق لوگوں کو سچ بھی بتاتا رہا اور آئندہ کے بھیانک حالات کی پیش بینی بھی کرتا رہا کہ ایوب خان ہمیں بھٹو ایک ''سیاسی اولاد'' عطا کر چکا تھا اور یحییٰ خان فوجی جانشین کے طور پر دے چکا تھا۔ متحدہ حزب اختلاف جناب مس فاطمہ جناح کے ''پروں'' کے نیچے ایک بنگالی ''غنڈے'' مجیب الرحمٰن کو پیدا کر چکی تھی۔ شریف سیاستدان نورالامین 1969 میں پیش گوئی کر چکا تھا کہ ملک دولخت ہو رہا ہے۔ لیکن افسوس اس کی ذمہ داری فوج کے سر ڈالی جائے گی اور انہیں قربانی کا بکرا بنایا جائے گا۔ چھپے ہاتھ ستمبر 1965ء میں وہ سب کچھ تو نہ حاصل کر سکے جو چاہتے تھے، لیکن کامیابی کا ایک ''مرحلہ'' طے ہو چکا تھا اور دوسرے پر کام شروع ہو چکا تھا۔ اس عاجز نے سچ و حق پھیلانے کے بارے بہت کچھ کیا، خاص کر فوجی اخبار ہلال کا رنگ ہی تبدیل کر دیا کہ سیرت نبی ﷺ کے نمبروں کا اجرا شروع کیا۔ نظریہ جہاد اور جہاد طرز زندگی پر مضامین لکھے نئے چیف آف دی جنرل سٹاف میجر جنرل گل حسن کو 1969 کے وسط میں لکھ کر مسودہ پیش کیا کہ ہم جہاد کے

تقاضوں کو سمجھیں۔ ورنہ اگر ستمبر 1965ء کی جنگ صرف سترہ دن لڑ سکے تو آنے والی جنگ صرف سات دن لڑ سکیں گے۔ ستمبر 1970ء میں ایوب ہال میں یحییٰ خان اور اس کے حواریوں کو چھ سو افسران کے سامنے تنبیہ کی کہ وہ بادشاہ بابر کی طرح توبہ و ندامت کر کے شراب کی بوتلیں توڑ کر اسلام کو اپنائیں ورنہ یحییٰ خان جس ''فوجی چھاتہ'' کا ذکر کر رہا ہے، وہ پاش پاش ہونے والا ہے اور وہ ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے پر ''صدارت'' کرے گا۔

126۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ تو سیدھی بات ہے کہ اسلامی فلسفہ حیات سے ہم نابلد ہیں اور مومن کی فراست سے عاری ہیں۔ ہم ساری قوم، کچھ لوگ ''جانتے ہوئے'' اور کچھ ''بے جانے'' چھپے ہاتھوں کی گیم کھیل رہے ہیں یا وہ ہمیں تگڑم ناچ نچا رہے ہیں اور چھپے ہاتھوں کے ہمارے ہاں پروردہ لوگوں کے مطابق لائف یا زندگی ''فراڈ'' ہے۔ ''کہ بابر با عیش کوش۔ عالم دوبارہ نیست'' یا کچھ لوگ سرسید کی طرح ''نیچریہ'' ہیں وہ لوگ ''حیات بعد الموت'' کے قائل نہیں۔ مودودی کا اتالیق نیاز فتح پوری بھی ''نیچریہ'' تھا اور انہی اثرات کی وجہ سے مودودی نے عقلی اور معتزلہ گروہ والے اسلام کا پرچار کیا۔ اسلامی فلسفہ حیات ایک فقرہ میں یہ واضح کرتا ہے کہ ''میں روز قیامت اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا؟'' اور محمود غزنوی نے وضاحت کی کہ روز قیامت وہ بت فروش کی بجائے ''بت شکن'' کے نام سے اپنی پہچان کرائے گا یا سلطان ٹیپو نے کہا شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے۔ اسلام غیرتمند لوگوں کا دین ہے۔ لیکن عوام الناس کے بارے کیا کہا جائے کہ اکثریت مطابق سورہ الانعام آیت مبارکہ 117 اور سورہ المائدہ کی آیت مبارکہ 77 کے گمراہ ہیں یا کہہ سکتے ہیں کہ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے کہ اس سلسلہ میں فارسی کہاوت کا انگریزی ترجمہ ٹھیک رہے گا۔ (That they know not That they know not) یعنی اپنی نادانی سے بے خبر ہیں اور کچھ سمجھنے کی کوشش ہی نہ کریں گے۔ لیکن یہ عاجز ایسے لوگوں کی تلاشی میں ہے جو اپنی نادانی اور کم علمی سے آگاہ ہیں۔ ایسے لوگوں کو

سکھلایا جا سکتا ہے یا پڑھے ہوئے ''ان پڑھ'' ہیں کہ سوئے ہوئے ہیں اور ان کو جگایا جا سکتا ہے۔ اب یہ کم علمی اور نادانی کی حد ہے کہ مغربی پاکستان کی اکثریت نے بھٹو جیسے مکار، شعبدہ باز اور مداری کو اپنا نجات دہندہ سمجھ لیا اور اپنا رہنما بنانے کو تیار ہو گئے۔ آج تک کئی لوگ اس کو ایک بہت بڑا سیاستدان اور رہنما تصور کرتے ہیں۔ بنگالیوں نے مجیب الرحمٰن جیسے غنڈے، بکاؤ مال اور بھارت کے پروردہ کو اپنا رہنما بنا لیا۔ حالانکہ ایک صاحب نظر گکھڑ بابا نے تو اگست 1971ء میں کہہ دیا تھا: ''مجیب کیلئے گولی اور بھٹو کے لئے پھانسی'' سقوط مشرقی پاکستان اور 1971ء کی جنگ کی کہانی کئی کتابوں کا مضمون ہے کہ کئی عوامل، زاویئے اور نکتے زیر بحث لانے پڑتے ہیں۔ لیکن حمود الرحمٰن کمیشن کا اول تو دائرہ کار محدود تھا لیکن انہوں نے تو ایک دھیلے کا کام نہ کیا۔ تو یہ عاجز اپنی کتابوں میں کافی رازوں سے پردے اٹھا چکا ہے۔ جس کا اختصار کچھ اس طرح ہے۔

127۔ اول یہ چھپے ہاتھوں کی ضرورت تھی کہ پاکستان کے وجود میں آنے سے جوامت واحدہ کا تصور اور مسلم قومیت کے پہلو عملی شکل اختیار کر رہے تھے ان نظریات کو پاش پاش کیا جائے۔ دوم جو پاکستان بننے کے بعد ہم جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنانے کے لئے پیش رفت کی طرف جا رہے تھے، اس کو مرحلہ در مرحلہ ختم کرنے کا پروگرام تھا۔ تو بیان کیا جا چکا ہے کہ پہلے 1947-48ء کے جہاد کشمیر میں ہمیں بغیر توپوں اور فضائی امداد کے جنگ میں جھونک کر بھارتی ''سورماؤں'' کے سامنے نکو بنایا کہ جہاد کا کیڑا ہمارے دماغوں سے نکالنے کا مرحلہ شروع کیا اور پھر 31 دسمبر 1948ء کو جہاد کو جمود دے دیا گیا۔ ستمبر 65ء میں بھارتی ''سورما'' ہمارے برابر کا ''سورما'' بن گیا اور دسمبر 1971ء اسلامی تاریخ کا سیاہ باب ہے، جب نوے ہزار سپاہیوں نے بھارتیوں کے سامنے ہتھیار ڈالے۔ ہمیں بے غیرت بنانے کا یہ تیسرا مرحلہ تھا۔ سوم یہ عاجز پہلے بیان کر چکا ہے کہ 1962ء میں جب گیا گزرا ایوب بھی اپنے ''حاکموں'' کی یہ خواہش پوری نہ کر سکا کہ مشرقی پاکستان کی زمین، بھارتی فوجوں کو

ذرائع آمدورفت کیلئے استعمال کی اجازت دی جائے تو مغربی لابی والے حیران تھے کہ ان پاکستان والوں میں کچھ جان ہے۔ تو ستمبر 1965ء کی جنگ میں ہمیں جھونک کر ''ادھ موا'' کیا اور دسمبر 1971ء میں مکمل بے جان کہ اب تو اہل مغرب، افغانستان کے خلاف مغربی پاکستان کی زمین بھی استعمال کر رہے ہیں۔ بہر حال اہل مغرب نے عارضی طور پر دونوں پاکستانوں کو جو اتنا عرصہ اکٹھے رہنے دیا یہ ان کی ''ضرورت'' کے مطابق تھا۔ اہل مغرب کا بڑا مقصد بھارت کے ٹکڑے کرنا بھی تھا۔ 1947ء میں مشرقی پاکستان اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکتا تھا، اس زمانے میں بھی اہل مغرب نے سہروردی اور سرت چندر بوس کے ذریعہ متحدہ آزاد بنگال بنانے کی کوشش کی اور قائداعظم نے بھی اس کی ''اجازت'' دے دی تھی۔ لیکن ہندو بپھر گئے اور یہ بیل منڈھے نہ چڑھی، اب چھپے ہاتھوں نے ہمارے ہاں ایسے ایجنٹ چھوڑے ہوئے تھے اور ایسے کام ہو رہے تھے کہ مشرقی پاکستان ہم سے 1952ء یا 1954ء یا 1958ء کسی وقت بھی الگ کیا جا سکتا تھا۔ آگے یہ عاجز اس سلسلہ میں ثبوت پیش کرے گا کہ ان سالوں میں بھی صورت حال الگ ہونے تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن ہم نے دونوں ملکوں کو یا خطوں کو اکٹھا رکھنے کے لئے نہ کچھ سوچا اور نہ کچھ کیا۔ علاوہ ازیں اہل مغرب نے جو ہمیں جلدی علیحدہ نہ کیا تو ڈر یہ تھا کہ ردعمل کے طور پر ہم پکے طور پر اکٹھے نہ ہو جائیں یا کوئی بہتر صورت حال اختیار نہ کر لیں۔ تو تجویز یہ تھی کہ نفرت اتنی زیادہ پیدا کی جائے اور زندگی کے مقاصد اس طرح الگ الگ ہوں کہ کبھی اکٹھا ہونے کے بارے دوبارہ سوچیں تک نہیں۔

128۔ ہم نے بنگالیوں کی ذہنیت کے بارے اگر غیاث الدین بلبن اور جہانگیر بادشاہ کے تاثرات ہی پڑھ لئے ہوتے کہ یہ لوگ صبح ''اور'' اور شام ''اور'' ہوتے ہیں اور حسد و نفرت ان کی ذہنیت میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ واویلا کے لئے کوئی مقصد ان کے سامنے نہیں ہوتا وغیرہ۔ اس سلسلہ میں بادشاہوں نے آب و ہوا کے اثرات، پانی کے سیدھے اور الٹے رخوں وغیرہ، ماحول کے اثرات کی جو عملی مثالیں دی ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور بات

بہت لمبی ہو جائے گی۔ اسلام اور صرف اسلام ہی ہمیں متحد رکھ سکتا تھا، جس کی طرف ہم نے کوئی دھیان نہ دیا اور بنگالیوں کو علیحدگی پسند اور بے مقصد واویلا کرنے والے ہم لوگوں نے بنایا۔ چنانچہ آزادی کے وقت سپاہیوں سے لے کر افسروں تک جو دو لاکھ کے قریب ہمیں فوج ملی، اس میں بنگالیوں کی تعداد سو، ڈیڑھ سو سے زیادہ نہ تھی۔ اب ہم نے بڑی غلطی یہ کی کہ بنگالیوں کی الگ پلٹنیں کھڑی کر دیں۔ توپخانہ اور رسالہ میں تو ان کو بھرتی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ بنگالی اتنے کمزور تھے کہ توپ کا گولہ نہ اٹھا سکتے تھے اور پیدل فوج میں بھی مارٹر کی بیرل یا ترائی پاٹ اٹھانے کے لئے کوئی آدمی نہ ملتا تھا۔ بنگالیوں کی یہ الگ یونٹیں ہی بنگلہ دیش کی تحریک کا ''گڑھ'' بن گئیں اور بنگالیوں نے فوج میں بھی ''مساوات'' کا مطالبہ کر دیا کہ معیار ہو یا نہ ہو آبادی کے لحاظ سے بنگالیوں کو ہر عہدے میں ترقی دی جائے۔ سیاست فوج میں بھی داخل ہو گئی خاص کر سلہٹ کے کرنل عثمانی نے وہ نفرت پھیلائی اور علیحدگی پسند سیاستدانوں کے فوج سے ایسے رابطے بندھائے کہ سب سے پہلے بغاوت ہی ان بنگالی یونٹوں اور ایسٹ پاکستان رائفلز نے کی جن کی نفری سو فیصد بنگالی تھی۔ جن یونٹوں میں بنگالیوں کی نفری 50 فیصد یا اس سے کم تھی وہاں بغاوت تو دور کی بات ہے، فرار بھی چند بنگالی ہوئے۔ پاکستانی افواج کا بڑا اصول یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے فرزند ہیں۔ پنجابی، پٹھان یا بنگالی بعد میں ہیں لیکن جہاں نفری سو فیصد بنگالی تھی، وہ لوگ ''بنگالی'' بن گئے اور فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد ''مکتی باہنی'' کی بھی وہی لوگ تربیت کرتے تھے اور انہی لوگوں نے پاکستان کو دولخت کرایا۔

129۔ تو صرف اسلام ہی ہمیں متحد رکھ سکتا تھا۔ دوسرا اختلاف زبان کا تھا جو قائداعظم کی زندگی میں شروع ہو گیا تھا اور قائداعظم 1948ء میں مشرقی پاکستان گئے تھے اور بنگالیوں کو سمجھایا کہ اردو نے برصغیر ہندو پاکستان میں اسلام کو بڑی بلندی عطا کی ہے اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کی ہے ہمارے اتحاد کے لئے اس اردو کو قومی زبان ہونا چاہیے۔ حالانکہ قائداعظم

خود، اردو زبان نہ پڑھے ہوئے تھے بہر حال یہ سوچ اپنا وقت کھو چکی تھی۔ 1950ء میں کریم آغا خان کا دادا بڑا آغا خان، پاکستان آیا۔ وہ بھی عام طور پر مغربی لابی کا آدمی مانا جاتا تھا، لیکن بڑا پڑھا لکھا اور مدبر آدمی تھا۔ تاریخ اور بین الاقوامی امور پر گہری نظر رکھتا تھا اور یہ ذکر پیراگراف نمبر 82 میں ہو چکا ہے۔ قائد اعظم کی وفات کے بعد کچھ مخلص لوگوں نے لیاقت علی کو رائے دی تھی کہ آغا خان کو پاکستان کا گورنر جنرل بنایا جائے کہ اس کے بین الاقوامی دنیا میں بڑے اثرات ہیں لیکن لیاقت علی ایسی بات مان کر بھلا ''ثانوی'' حیثیت کیوں اختیار کرتا۔ وہ تو قائد اعظم کی وفات کے بعد پاکستان کا ''شہنشاہ'' تھا۔ بہر حال آغا خان 1950 میں جب پاکستان آیا تو لوگوں نے اس کے سامنے پاکستان کی بھیانک تصویر پیش کی کہ ہم مسائل میں گھر گئے ہیں۔ آغا خان ان کا کوئی حل بتائے۔ تو آغا خان نے کہا کہ مسئلے صرف دو ہیں۔ اول اسلام کا نفاذ لیکن کونسا اسلام؟ تو پہلے سو سال کا اسلام جب نہ کوئی گروہ بندی تھی اور نہ فرقہ داری۔ دوسرا مسئلہ زبان کا ہے۔ پاکستان میں کئی علاقائی زبانیں ہیں اور اردو نے گو اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ لیکن مزید یہ زبان کوئی خدمت نہیں کر سکتی ہمیں روحانی اور عقائد کی ضرورت کے لئے عربی کو ہماری زبان بنا دینا چاہیے اور بین الاقوامی اور ہنر کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگریزی کو اپنی زبان بنا دیں۔ اردو ادب یا علاقائی زبانوں کے ادب کو ''میوزموں'' میں رکھ چھوڑیئے۔ پاکستان میں ان زمانوں میں گنگا جمنی لوگوں کا اتنا زور تھا کہ پاکستان کو دنیا کا سب سے بڑا ملک قرار دیتے وہ مکہ و مدینہ کی زبان بھی ''اردو'' کرنا چاہتے تھے۔ اسلام کو وہ زمانے کی ضرورتوں کے تحت ''تراش'' کے ''ڈاڑھی، مچھ منا'' اسلام کے طور پر نافذ کرنا چاہتے تھے۔ جیسا آگے پیراگراف نمبر 138 میں ذکر آ رہا ہے کہ لیاقت علی نے 1949ء کی قرارداد مقاصد کے تحت لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا دیا اور مادر پدر آزاد جمہوریت کو ہمارے ایمان کا حصہ۔ جس سلسلہ میں ان گنگا جمنی لوگوں کو مجید نظامی جیسے دانشوروں کی ''مدد'' حاصل تھی جو آج بھی اللہ تعالیٰ سبحانہ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے

پاکستان کی بجائے قائداعظم اور علامہ اقبال کے پاکستان کے دعویدار ہیں اور ان گنگا جمنی دانشوروں کے مطابق زوال پذیر مغلیہ حکومت اور اودھ کی حکومتوں کو اسلامی ثقافت کے طور پر ہمارے معاشرہ کو اپنانا چاہیے۔ مرزا غالب کی ''نوحہ خوانی'' اور میر تقی میر کی ''ہمچما دیگر نیست والی'' شاعری ہمارا ادبی ورثہ ہونا چاہیے۔ تو ایسے دانشوروں نے آغا خان سے الٹے پلٹے سوال بھی کیئے کہ آغا خان شیعہ تھا۔ تو سوال کیا کہ پہلے سو سالوں میں تو بنوامیہ کا پیریڈ بھی آتا تھا۔ تو آغا خان نے جواب دیا کہ ہاں وہ بھی اسلام کی شوکت کا زمانہ تھا۔ بہر حال کچھ نے ''امامت'' کے مسئلہ کو چھیڑا تو آغا خان نے کہا وہ ذاتی معاملہ ہے۔ ''لاا کـراہ فـی الـدین ''یعنی دین میں زبردستی نہیں، میں تو حکومت کی بات کر رہا تھا کہ ان کو کونسا دین اسلام نافذ کرنا چاہیے وغیرہ۔

130۔ قارئین! یہ سب باتیں اس زمانے کی ''ڈان'' اخبار میں شائع ہوئیں اور لوگوں نے خاص کر حکومت نے کوئی تاثر نہ لیا۔ ہم اسلام نافذ کیا کرتے ہم نے تو آج تک اسلامی فلسفہ حیات کے خاکہ کو سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی، جس سلسلہ میں یہ عاجز پچاس سالوں سے چیخ و پکار کر رہا ہے۔ میرے لحاظ سے آغا خان کی یہ نصیحت جگہ جگہ سنہری الفاظ میں لکھی جاتی اور عربی زبان کو اپنا لیتے تو ہم بھی آج تک ''عرب'' بن چکے ہوتے۔ انگریزی نے تو واپس آنا تھا، دیکھ لیں کہ اب ذریعہ تعلیم یہی انگریزی زبان ہی بن رہی ہے۔ قارئین! مصر، طرابلس، تیونس، الجیریا اور مراکو کے لوگ عرب النسل تو نہ تھے اور نہ ان کی زبان عربی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حکم تھا، جہاں جاؤ وہاں زبان عربی کر دو۔ مغرب کی طرف والے لوگوں نے اس اصول کو اپنایا۔ مشرق میں اہل ایران نے کہا ان کی زبان فارسی میں بڑا ادب ہے اس کو ساتھ ساتھ چلنے دو۔ پھر عمر خیام نے ذہنی عیاشی کے لئے ''رباعیاں'' لکھیں۔ فردوسی نے ''شاہنامہ'' لکھ ڈالا محمود غزنوی نے تو ''شاہنامہ'' نہ لکھوایا تھا۔ وہ تو عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ اس نے تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے طور علم مغازی کو فکری اور عملی اوج عطا کیا، وہ تو عربی کا

دلدادہ تھا۔عرب علوی قبائل کوموجودہ کوہستان نمک میں آباد کرگیا جنھوں نے اس برصغیر میں ''عربی اسلام'' کا مظاہرہ کیا اور اعوان قاری کہلائے۔عربی کے سینکڑوں الفاظ آج ہماری علاقائی اور اردو زبان کا حصہ ہیں۔کاش! ہم عربی کومکمل طور پر اپنی زبان کے طور پر اپنا لیتے۔ ایران میں بھی شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی قسم کے لوگوں نے عربی زبان کی خدمت کی۔لیکن صفوی خاندان کے ایران کا حاکم بن جانے کے بعد اہل تشیع جو صرف ایک گروہ تھا ان کے عقائد کو افسانوی رنگ دے کر شیعہ اور سنی کو دو الگ الگ ''مذاہب'' بنادیا۔تو فارسی زبان، اہل تشیع کی زبان کے طور پر عربی کے بالمقابل آ کر کھڑی ہوگئی اور قوم وملت میں ایک بڑے تفرقہ کا اضافہ ہوگیا۔جس کا کچھ ذکر آگے بھی آرہا ہے۔قارئین! پچھلے تین سوسالوں سے ہم مسلمان جو دنیا میں ذلت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ عاجز اس صورت حال کے اسباب جہاں نظر آئیں اپنی آہ وزاری کے لئے اس کی جھلکی ضرور دے دیتا ہے۔

131۔ بہر حال 1951ء میں جب لیاقت علی کے قتل کے بعد ناظم الدین کو بے وقوف بنا کر اس ملک کے ''بادشاہ گروں'' نے وزیراعظم بنادیا کہ طاقت وزیراعظم کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔تو بنگالی سپاہیوں کا تبصرہ صحیح تھا کہ ''صوبیداری'' سے ''حوالدار میجر'' بن گیا۔اب چھپے ہاتھوں نے ملک کے دوخطوں میں نفرت بڑھانے کے لئے 1952ء کے شروع میں جو ''راشٹرو بھاشا بنگلہ چاہو'' کی تحریک شروع کی تو سب بنگالی اٹھ کر ڈھاکہ پہنچ گئے۔ کچھ بہاری رائفلز نے حالات کو کنٹرول کرنے کے لئے گولی بھی چلادی اور آٹھ دس آدمی مر گئے۔تو حالات سویلین کے کنٹرول سے باہر تھے۔ ڈھاکہ میں کوئی پکی پلٹن نہ تھی۔ ادھر ادھر سے دستے اکٹھے کر کے کوئی چار پانچ سو کی نفری سگنل کور کے کرنل سردار افضل کے تحت ڈھاکہ شہر میں عارضی طور پر متعین کی کہ کومیلہ چھاؤنی سے ہماری پلٹن رات کے اندھیرے میں تین کمپنیوں کے ساتھ بذریعہ ٹرین ڈھاکہ پہنچ گئی اور مجھے ایک کمپنی کی نفری ( تقریباً ایک سینکڑہ ) سے کرنل سردار افضل سے چارج لینا پڑا۔ میں نے پہلے والے فوجیوں کی طرح جھولا، پٹھو اور سر

پر سٹیل ہلمٹ رکھنے والی وردی کی بجائے اپنے جوانوں کو Ceremomal dress، یعنی صرف ایک پیٹی اور رنگدار ٹوپی پہنا کر حالات کنٹرول کرنے کا فیصلہ کیا۔ تمام شہر کی گاڑیوں میں گشت شروع کر دی اور جہاں اجتماع ہوتا ان کو خطاب کرتا۔ میں تم پر فائر کرنے کے لئے نہیں آیا، میں نے یہ سادہ وردی پہنی ہوئی ہے، میری ذمہ داری سرحدوں کی حفاظت ہے، یہ کام مجھے مجبوراً اور خراب حالات کی وجہ سے کرنا پڑ رہا ہے۔ مسلمان، مسلمان پر فائر نہیں کرتا۔ کہاں ہیں فلاں فلاں اخبار نویس جن کے ساتھ مل کر میں نے تحریک پاکستان میں کام کیا ہے، ان کو بلاؤ کہ آ کر میرے ساتھ بات کریں۔ کیا ہم نے پاکستان اس لئے بنایا تھا کہ ایسی افراتفری کریں گے، زبان کے مسئلہ کو سیاسی طور پر حل کریں وغیرہ۔ میرے الفاظ نے جادو والے اثرات کئے کہ چوڑی چھاتی والے اسلام کے سپاہی اپنوں پر فائر نہیں کرتے۔ لوگوں نے اسلام زندہ باد اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا کر ''تتر بتر'' ہونا شروع کر دیا۔ نور الامین وزیر اعلیٰ تھا۔ اور بعد میں بری فوج کا سربراہ محمد موسیٰ میجر جنرل اور ڈویژن کمانڈر تھا۔ انہوں نے جنرل عبدالحمید برہمی کو جو اس زمانے میں بریگیڈیئر تھا اس کو میرے پاس بھیجا کہ کیا معجزہ ہو گیا ہے کہ حالات نارمل ہو گئے ہیں۔ وہ میری باتیں سن کر حیران ہو گیا۔ اس تحریک کے دو بڑے کرتا دھرتا جماعت اسلامی کے پروفیسر غلام اعظم اور مجیب الرحمٰن تھے جس نے بعد میں پاکستان کو دولخت کرایا۔ ان دونوں کو حراست میں لیا گیا تھا اور میری سفارش پر ان کو رہا کر دیا گیا۔ غلام اعظم تو باتیں سن کر خاموش ہو گیا کہ اس کو بتایا گیا کہ اسلامی فوج آ گئی ہے۔ مجیب الرحمٰن نے غنڈہ بازی کی کوشش کی، لیکن لوگ اپنے علاقوں میں واپس جانا شروع ہو گئے تھے۔ قارئین! یہ ہے اسلام کی قوت کہ سورۃ الانفال کی آیت مبارکہ 63 کا یہ عاجز حوالہ دے رہا ہے کہ رب سبحانہ فرماتا ہے کہ دنیا کی تمام دولتوں سے ایسی الفت پیدا نہیں ہو سکتی جو رب سبحانہ نے ہمیں عطا کی ہے ہم غیروں کے کافرانہ سیاسی نظاموں کے تحت جو نفرت کا بیج بو رہے ہیں۔ تو پاکستان 1952ء میں ہی دولخت ہو سکتا تھا۔

132۔ پاکستان ایک سیاسی عمل کی ''پیداوار'' ضرور ہے اور مجید نظامی اسی سیاست کو یہاں لاگو کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ اس سیاسی عمل والی پاکستان کی بانی جماعت سات سالوں کے اندر یعنی 1954ء میں خود ختم ہو گئی تھی۔ یہ سیاسی عمل ہماری ''مجبوری'' تھی کہ نہ ہم یہ ملک ''لہو سے خرید سکے'' نہ ہماری کافرانہ حکومت ہمیں اسلامی طریقہ یعنی نظریہ جہاد کو اپنانے کی اجازت دے رہی تھی۔ یہ ملک فطرت کی ضرورت کے طور پر ہمیں اس وجہ سے عطا ہوا کہ کچھ صاحبان جن کے ایک ہی عمل نے ان کو غازی بھی بنا دیا اور شہید بھی، وہ ناموس رسول ﷺ پر قربان ہو گئے تھے۔ تو فرد واحد کی کوشش سے جس کے نام میں ہمارے آقا ﷺ کا اسم مبارک بھی تھا۔ اور مولائے کائنات کا اسم بھی، تو اس نے ایک دیانتدار وکیل کے طور پر ہمیں یہ ملک حاصل کر دیا۔ غیروں اور باطل طاقتوں کی بھی یہ ''ضرورت'' تھی اور وہ بھی افراتفری کے لئے اپنے ''مہروں'' سے کچھ نہ کچھ کراتے رہتے ہیں۔ تو 1952ء کا نفرت کا جو طوفان کچھ دب گیا تھا تو 1954ء کے کافرانہ انتخابات نے نفرت پھیلانے والوں کو ایک اور موقع فراہم کر دیا۔ فضل الحق جس نے 1941ء میں قائداعظم کے ساتھ بے وفائی کی تھی اور بقول قائداعظم ایک دفعہ سیاسی موت سے دوچار ہو گیا تھا۔ قائد کی وفات کے بعد لیاقت علی نے اس کو اپنے ''گلے'' لگا لیا تھا اور اس کے سیاسی ''پر'' پھر بحال ہونے لگے تھے۔ حسین شہید سہروردی کا تعلق مغربی بنگال سے تھا اور اس کا تعلق ایک علمی مسلمان شرفاء کے گھرانے سے تھا۔ لیاقت علی نے اس کو ''کتے'' کے لفظ سے خطاب کیا۔ تو اس نے اپنی لیڈری کو چمکانے کے لئے عطاء الرحمٰن جیسے علیحدگی پسند اور مجیب الرحمٰن جیسے ''غنڈے'' کو بھی اپنے ''حواری'' بنایا ہوا تھا۔ پرجا پروشیکا کا شکست خوردہ ابو حسین سرکار بھی ''میدان'' میں آ چکا تھا بلکہ نظام اسلام پارٹی کا مولوی فرید احمد بھی، تو ان سب اور متعدد اور سیاسی فصلی بٹیروں نے الگ الگ نظریات کے باوجود ''منفی'' بنیادوں پر ایک ''یونائیٹڈ فرنٹ'' بنایا کہ انتخابات میں پاکستان کی ''خالق'' جماعت مسلم لیگ جو شریف سیاستدان نورالامین کی سربراہی میں کام کر رہی تھی ان

کوشکست دی جائے۔ کامیابی کی صورت میں حکومت کون بنائے گا، یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ مغربی پاکستان کے سنجیدہ طبقہ کے مطابق یہ سب کچھ دونوں خطوں میں نفرت کا بیج بونے کی ایک سعی تھی۔

133۔ جب انتخابات کے نتائج سامنے آئے کہ نورالامین خود ایک طالب علم لیڈر سے شکست کھا گیا اور مسلم لیگ کا نام، مشرقی پاکستان سے مٹ رہا تھا۔ تو یہ عاجز اخبار نویسوں کے ساتھ شاہ فیصل آف عراق کے مارچ 1954ء کے پاکستان کے دورے پر کراچی، کوئٹہ اور پشاور کے سفر میں تھا جو ذکر پیراگراف نمبر 79 اور 80 میں ہو چکا ہے۔ ہم پشاور پہنچے تو جس ہوٹل میں ہمیں ٹھہرایا گیا متحدہ ہندو پاکستان کا سابق فوجی سربراہ فیلڈ مارشل اکنلیک بھی ادھر ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ میرے ساتھ ISPR کا میجر بعد میں کرنل مسعود احمد بھی تھا۔ تو میں نے چونکہ اکنلیک کے سٹاف کے طور اس کے ساتھ نوکری کی ہوئی تھی۔ تو اکنلیک سے روایتی علیک سلیک ہوئی۔ تو میرے چہرے پر کچھ ''مایوسی'' دیکھ کر وہ کہنے لگا کہ مشرقی پاکستان کے انتخابات کے نتائج نے تمہیں ''پژمردہ'' کیا ہوا ہے کہ تم سخت مسلم لیگی تھے۔ لیکن جو کچھ ہو رہا ہے وہ تمہاری مرکزی حکومت کی ''مرضی'' کے مطابق ہو رہا ہے اور وہ دل سے خوش ہیں کہ نئے آنے والوں کو ''تھوڑے'' پر ہی ''ٹرخا'' دیں گے۔ ہمیں اکنلیک کا تجزیہ ''اپیل'' کر گیا کہ حکومت کا وزیر گورمانی جو ہمارے ساتھ تھا، وہ ہشاش بشاش تھا۔ ہم حیران بھی ہوئے کہ ایک غیر ملکی ہمارے ملک کے معاملات سے اتنا ''باخبر'' تھا۔ ہم راولپنڈی پہنچے تو ایوب خان بھی ہماری طرح ''مایوس'' تھا۔ تو ہم نے اس کو اکنلیک کے تجزیہ سے آگاہ کیا اور گورمانی کے ہشاش بشاش ہونے کا ذکر کیا تو ایوب بھی ہماری طرح سے پوری طرح تذبذب سے تو باہر نہ نکلا۔ البتہ جب مہمان آ گئے اور ایوب کی گورمانی سے بات ہوئی تو گورمانی نے ایوب کو بھی ہشاش بشاش کر دیا۔ قارئین! یہ سب بڑی گہری باتیں ہیں۔ جو ہمیں دیر کے بعد سمجھ آتی ہیں۔ تھوڑا عرصہ بعد مغربی پاکستان میں، سکندر مرزا اور گورمانی نے ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ مل کر

مسلم لیگ کو Republican پارٹی بنا دیا۔ یہ چھپے ہاتھوں کی ''ضرورت'' تھی تو اکنلیک زیادہ ''باخبر'' تھا کہ دونوں خطوں سے پاکستان کی ''خالق'' جماعت کوختم کر دیا جائے، وہ کوئی سیاسی اسلامی ادارہ نہ بن جائے اور دونوں خطوں میں وحدت کو پکا نہ کر دے۔اب مسلم لیگ کو ''سلطانی پارٹی'' کے طور پر ضرورت کے وقت ''جنم'' دیا جاتا ہے، جیسے ایوب نے کنونشن لیگ کو 1962ء میں جنم دیا اور جو اس میں فٹ نہ ہوئے انہوں نے کونسل لیگ بنا لی۔ ضیاء الحق نے 1985ء میں جونیجو لیگ کو جنم دیا، جو اس میں فٹ نہ ہوئے وہ چٹھہ لیگ بن گئے اور پرویز مشرف نے 2002 میں ق۔ کتا لیگ کو جنم دیا اور جو اس میں فٹ نہ ہوئے وہ نواز لیگ بن گئے۔ اے مجید نظامی! یہ ہے تمہاری کافرانہ سیاست کہ آج تک کوئی باعزت سیاسی ادارہ بھی کسی اصول کے تحت وجود میں نہ آیا۔ کافرانہ ملکوں میں کافرانہ سیاست چل سکتی ہے، چلو برائے نام ہی سہی لیکن اسلامی مملکتوں میں یہ کافرانہ سیاست کبھی نہیں چل سکتی۔

134۔ 1954ء کے بعد کیا ہوا۔ اس سلسلہ میں یہ عاجز پہلے ہی اشارہ کر چکا ہے کہ چھپے ہاتھوں کی ضرورت تھی کہ سیاستدانوں کو ٹشو پیپر بنا کر باری باری اس طرح پھینکا جائے کہ ان کا نام ہی مٹ جائے۔ سکندر مرزا نے مسلم لیگ کے تین لیڈروں سہروردی چندریگر، اور فیروز خان کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا۔ اگر چھپے ہاتھ چاہتے تو مشرقی پاکستان کو ہم سے 1954ء میں الگ کرا دیتے تو یہ بالکل آسان تھا، لیکن ابھی ''وقت'' نہ آیا تھا۔ پھر 1958ء میں قوم نے دیکھا کہ مشرقی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کس طرح ''مچھلی بازار'' بن گئی کہ ڈپٹی سپیکر کو بھی اسمبلی کے اندر قتل کر دیا۔ لیکن اس زمانے میں ایوب خان کو لایا جا رہا تھا، تو ہمیں الگ الگ نہ کیا گیا اور ایوب کے ساتھ اہل مغرب کی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن جب 1962ء میں ایوب نے اہل مغرب کو ''مایوس'' کیا، تو پھر مشرقی پاکستان کو الگ کرنے کا فیصلہ ضرور کیا۔ لیکن یہ علیحدگی اس بے عزتی اور بے غیرتی سے کرانا تھی تو اس پر اتنا وقت لگ گیا۔ ہم اگر اکٹھے نہ رہ سکتے تھے تو دونوں خطوں میں اگر کوئی شریفانہ قسم کے سیاسی ادارے بننے دیئے جاتے تو

شریفانہ طور پر بھی الگ ہو سکتے تھے۔ قارئین! یہ بہت وسیع مضمون ہے اور تمام تر بیانات ایک کتاب میں بھی ختم نہ ہوں گے۔ لیکن قارئین اپنے ملک کی پچھلے پچاس سالوں کی سیاسی پارٹیوں کا مطالعہ کریں۔ زیادہ پارٹیاں تو علاقائی اور خطوں والی ہیں جو ملک کو ختم یا مزید ٹکڑوں میں بانٹنا چاہتی ہیں۔ کچھ مذہبی پارٹیاں جو عقائد کے الگ ہونے کی وجہ سے ہیں۔ جیسے دیوبندیوں کی جمعیت العلماء اسلام جو کئی حصوں میں بٹتی رہتی ہے۔ یہی حالت بریلویوں کے جمعیت العلماء پاکستان کی ہے۔ اور پھر مودودی ایک ایسا گروہ تشکیل کر گیا ہے۔ جن کے عقائد معتزلہ سے بھی بدتر ہیں علاوہ ازیں بھٹو نے عوام اور غریبوں کو ایسا بے وقوف بنایا کہ ان لوگوں کا ایمان ہے ''پیٹ نہ پیاں روٹیاں سبھی گلاں کھوٹیاں۔'' حیرانگی کی بات ہے کہ اصغر خان جیسا آدمی بھی ایک پارٹی کا بانی ہے۔ اب عمران خان نے شخصیت اور کرکٹ کے ''چھکوں'' کے زور سے ایک پارٹی بنالی ہے۔ یعنی جو بھانت بھانت کی بولیاں ہمارے ملک کی سیاسی پارٹیاں بول رہی ہیں۔ قرآن پاک میں تو سورہ الذاریت میں ایسے خراصوں کے قتل کا حکم ہے توبہ میرے اللہ۔

135۔ تو مشرقی پاکستان کے الگ ہونے کی سینکڑوں وجوہات ہیں جو لمبے عرصے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس عاجز نے 5۔ اکتوبر 1970ء کو یحییٰ خان کو حسب وعدہ جو مسودہ لکھ کر دیا وہ آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ جس میں یحییٰ خان کو بتا دیا تھا کہ یہ انتخابات ملک کو دولخت کر دیں گے۔ لیکن حیرانگی کی بات ہے کہ دسمبر 1970ء کے انتخابات کے بعد یحییٰ خان کو خراج تحسین پیش کیا گیا کہ تاریخ میں اس نے اپنے لئے مقام بنا لیا ہے کہ صاف و شفاف انتخابات کرائے۔ اس عاجز نے دانشوروں کو اسی زمانے میں بتا دیا تھا کہ فطرت نے اہل پنجاب سے بھٹو کو ووٹ دلا کر فی الحال مغربی پاکستان کی وحدت کو کچھ بچا لیا ہے اور انتخابات ہرگز صاف شفاف نہ تھے۔ مشرقی پاکستان سے کوئی مجیب کو ووٹ نہ دیتا تو مکتی باہنی والے اس کی ایسی تیسی کر دیتے اور انتخابات کے بعد مجیب مشرقی پاکستان کا بے تاج بادشاہ بن چکا تھا۔ بھٹو کو ہم

لاکھ برا کہیں لیکن اس کے یہ الفاظ ''تم ادھر اور ہم ادھر'' ایک حقیقت تھے۔ اصولی طور پر پاکستان دسمبر 1970ء میں دولخت ہو گیا تھا اور پاکستان کی ''خالق جماعت'' مسلم لیگ کا نام دونوں خطوں میں مٹ چکا تھا اور پاکستان ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے جو کارروائی کی، وہ غلط اور بے مقصد تھی یا سب کچھ چھپے ہاتھ کرا رہے تھے۔ مغربی پاکستان میں بھی، مشرقی پاکستان کو ''لات مارنے'' والا ایک گروہ پیدا ہو چکا تھا کہ بنگالیوں کی ''چاں چاں'' سے خلاصی حاصل کریں۔ یحییٰ خان کا چھوٹا بھائی آغا محمد علی جو مغربی پاکستان میں انسپکٹر جنرل پولیس تھا۔ لاہور میں بنگلہ دیش کے جھنڈے بنا کر وہ ڈھاکہ بھیج رہا تھا۔ 15۔ مارچ 1971ء کا فوجی ایکشن ایک غلط اور لاحاصل مشق تھی۔ لیکن اگر بنگال کو نوآبادی بنا کر اس پر چند روز اور حکومت کرنے کا ارادہ تھا بھی تو جو دو ڈویژن فوج بعد بھیجی وہ پہلے بھیج دیتے تو بنگالی یونٹیں بغاوت نہ کرتیں۔ لیکن قوم نے یحییٰ خان کو خراج تحسین پیش کیا کہ اس نے ملک کو بچا لیا، کتنے دن کیلئے؟ ''نو ماہ کیلئے'' توبہ میرے اللہ۔

136۔ قارئین! میری کتابیں تمام صورت حال اور تحقیقات سے بھری پڑی ہیں۔ میں نے جو ستمبر 1970 میں یحییٰ خان اور اس کے حواریوں کو کھری کھری سنائی تھیں تو مجھے تو فروری 1971ء سے فوج سے ریٹائر کر دیا تھا۔ لیکن مارچ 1971ء میں پھر واپس بلا لیا گیا کہ میں کراچی جا کر غیر ملکی اخبار نویسوں کو کچھ ''نتھ'' ڈالوں۔ لیکن جون، جولائی 1971ء میں یہ عاجز 19 سال بعد دوبارہ مشرقی پاکستان چلا گیا کہ اپنی آنکھ سے دیکھوں کہ کیا صورت حال ہے۔ وہ ڈھاکہ شہر جس کو 1952ء میں اس عاجز نے ایک کمپنی سے کنٹرول کر لیا تھا، وہاں اب ایک بریگیڈ فوج بھی حالات کنٹرول کرنے کے قابل نہ تھی۔ بنگالی جو ان زمانوں میں ننگے پاؤں اور ایک بنیان اور دھوتی میں گزارا کرتے تھے۔ ان کی خوشحالی، ذرائع آمد و رفت، ترقی، مکانات اور کارخانے دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ یہ 24 سال اس خطہ کی تاریخ کا سنہری دور تھا۔ لیکن پنجابی کی کہاوت کہ ''بھوکے رجن نہ اور جھلے خوش نہ ہوں'' کہ بھوکے

دولت کو اور پاگل خوشی کو مشکل سے سنبھال سکتے ہیں یا برداشت کر سکتے ہیں۔ یہی حالات بنگالیوں کے ناشکری کے تھے۔ بہر حال اس عاجز نے پورے دو ماہ مشرقی پاکستان کے چپہ چپہ کو بذریعہ ہوائی جہاز، سٹیمر، ریلوے، جیپ اور پیدل ہو کر بھی دیکھا اور اگست 1971ء میں ڈھاکہ سے واپس آتے جنرل نیازی کو بہت سمجھایا کہ حالات اس کی "سمجھ" اور کنٹرول سے باہر ہیں۔ خدارا عزت بچانے کے بارے کچھ سوچو مغربی پاکستان آ کر یہی چیز جنرل گل حسن کو سمجھائی۔ اب دونوں اپنے دفاع پر بے مقصد کتابیں بھی لکھ چکے ہیں۔ میری بات کو انہوں نے کوئی وقعت نہ دی۔ دسمبر 1971ء میں بھی مغربی پاکستان میں بہت کچھ کر سکتے تھے اور مشرقی پاکستان میں بھارت کو "الجھانے" کی جنگ لڑتے۔ آخری وقت برہما یا چین کی طرف نکل کر کچھ بچ بھی سکتے اور خراب صورت حال کا بھی حل تھا کہ جنرل نیازی سلطان ٹیپو بن جاتا۔ اس کو تو امام حسین رضی اللہ عنہ کی طرح چراغ بجھانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ افسوس جو کچھ ہوا یہ اسلام کی تاریخ کا تاریک ترین واقعہ ہے۔ نیازی جب قید سے رہا ہو کر واپس آیا تو برادرم کرنل محمد اسلم عباسی اور اس عاجز نے آپس میں مشورہ کیا کہ نیازی ہمارا بہت پرانا دوست تھا۔ اس کو ملنے جائیں یا نہ جائیں۔ تو بات ادھر ختم ہو گئی "کہ نیازی کو مل کر اس کے ساتھ بات کونسی یا کیا کریں گے۔" تو ہمارے گلے بھر گئے تو پاس بیٹھے کرنل شیر محمد کی چیخ نکل گئی اور ہم تینوں مل کر اس دن بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر اتنے روئے کہ وہ لمحہ یاد آ جاتا ہے تو اب بھی پھوٹ پڑتا ہوں۔ یہ گزارش تو بہت پہلے کر چکا ہوں کہ یحییٰ خان اور اس کے بے غیرت اور بے حیا ٹولہ کو ہم پر براجمان اسی لئے کیا گیا تھا۔ کہ "شرم تم کو مگر نہیں آتی"۔ میرا قلم مزید کچھ نہیں لکھ سکتا اور اس Chapter یا باب کو یہاں ختم کرتا ہوں۔

## تیسرا حصہ

# کوتاہیوں کے نتائج اور عبرتناک انجاموں پر فطرت کی تنبیہ

137۔ یہ عاجز تمام واقعات اور صورت حال کے جائزے پیش کرتے وقت ہر واقعہ یا کارروائی سے جو نتائج نکلتے ہیں ان کو ذہن میں رکھ کر فیصلہ کرتا ہے کہ فلاں عمل یا کارروائی کتنی صحیح تھی۔ حیران ہوں کہ ہمارے ملک کا ہر سربراہ اور اکثر صوبوں کے وزرائے اعلیٰ جن عبرتناک انجاموں سے دوچار ہوئے اس سلسلہ میں میرے سوا کسی دانشور نے آج تک نہ کوئی تحقیق کی ہے اور نہ کبھی کوئی جائزہ پیش کیا ہے۔ کہ ان المیوں کا بنیادی سبب کیا ہے۔ حالانکہ بات بڑی سیدھی ہے کہ ہم لوگوں نے کافرانہ اور باطل نظامات کو اپنایا ہوا ہے جہاں لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت میں شرکت دے دی جاتی ہے۔ یہ ملک عطیہ رب ذوالجلال اور رسول باکمال ﷺ ہے۔ اب جو لوگ رب سبحانہ کی بجائے لوگوں کی رائے اور فیصلوں کا نفاذ کرتے ہیں۔ تو رب سبحانہ کو ضرور غیرت آتی ہے اور وہ ان لوگوں کو عبرتناک انجاموں سے دوچار کر دیتے ہیں۔ جس سلسلہ میں یہ عاجز بہت کچھ لکھ چکا ہے اور کچھ جھلکیاں آگے آنے والے پیراگرافس وغیرہ میں آرہی ہیں۔ اس کا لمبا چوڑا پس منظر ہے کہ اسلام کے چشمے تو اٹھارویں صدی سے خشک ہونے شروع ہو گئے جس کی کچھ تفصیل چوتھے حصہ میں آرہی ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدیاں مسلمانوں کی کم علمیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے ذلت سے دوچار کئے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک اور المیہ یہ ہے کہ جب دنیاوی علوم میں ترقی ہوئی تو بھانت بھانت کے نظریات، یعنی جمہوریت، انقلاب، آزادی فکر اور سوشلزم وغیرہ کو ماڈرن دنیا کی ضرورت کے طور پر اوج ملنا شروع ہو گیا۔ تو مسلمانوں نے اپنی کم علمی سے یہ مان لیا کہ یہ سب چیزیں اسلام میں بھی ہیں۔ توبہ میرے اللہ۔ اسلام اسلام ہے اس کو تو کسی اسم صفت کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ ہر زمانے کیلئے ہے" زمانہ ایک حیات ایک

کائنات بھی ایک، دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم'' لیکن نثر میں علامہ اقبال نے (Retconslsuction of Religious Thought) جوایک کتاب لکھ ڈالی، تو شاید ان کا مقصد اسلام کو زمانے کے تناظر میں پیش کرنا تھا۔ لیکن یار لوگوں نے یا تو اسلامی نظریات کو ''تراش'' کر باطل نظریات بنا دیا یا باطل نظریات پر اسلام کے لیبل لگا کر ''باطل'' کو ''حق'' بنا دیا۔

138۔ اب 1948ء کے کشمیر کے عملی جہاد کے کچھ عملی نتائج ظاہر ہوئے کہ لوگوں نے شریعت کے نفاذ کی بات کرنا شروع کر دی تو لیاقت علی نے فوج میں زبانی طور پر کرنل کے عہدوں تک ''چھپے ہاتھوں'' کی ہدایات کے تحت احکام پہنچائے کہ کوئی فوجی پاکستان میں شریعت کے نفاذ کی بات نہ کرے گا۔ اس پر سخت ردعمل ہوا۔ خاص کر کوہاٹ چھاؤنی میں دو کرنیلوں سلطان علی شاہ اور شیر محمد نے سخت پروٹیسٹ کیا تو بات پھیل گئی۔ راقم ISPR میں واپس آ گیا تھا اور صاف ظاہر ہو گیا کہ فوج میں ایک ''مذہبی گروہ'' اپنے آپ وجود میں آ گیا ہے۔ ہر جگہ پروٹیسٹ ہوا تو پھر چھپے ہاتھوں کے ''فکری ادارہ'' نے لیاقت علی سے اس ملک کے لوگوں اور اسلام کے ساتھ ایک بہت بڑا ''فراڈ'' کرایا۔ جس کو اب تک قوم نہیں سمجھی کہ 1949ء میں لیاقت علی نے جو قومی اسمبلی میں قرارداد مقاصد پیش کی اس میں لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ کی ''حاکمیت'' میں شرکت دے دی۔ بجائے یہ کہنے کے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے قرآن پاک اور سنت نبوی کے احکام کی پیروی یا تابعداری کریں گے۔ وہاں کہا کہ لوگوں کے چنیدہ نمائندے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو چلائیں گے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ شبیر احمد عثمانی سمیت جن لوگوں نے علماء کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا اور خود ''مولینا'' بن کر اللہ تعالیٰ کے شریک بنے ہوئے تھے۔ ان سب نے اس قرارداد کے اسلامی ہونے پر ''انگوٹھا'' لگا دیا۔ قارئین! یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ صرف برصغیر ہندو پاکستان کے ''ملاں'' نے مولینا کا خطاب اپنایا ہوا ہے اور میں کبھی کسی آدمی کے نام کے ساتھ یہ الفاظ استعمال نہیں کرتا۔ دوسرا المیہ آگے چوتھے

حصہ میں اور کھل کر بیان ہوگا۔ اس عاجز نے اپنی 88 سال عمر میں اسلامی علوم پر عبور رکھنے والے صاحبان کو بہت تلاش کیا۔ لیکن میں اپنی کتاب ''پاکستان'' میں بھی یہ رونا رو چکا ہوں کہ میں بڑا ''مایوس'' ہوا۔ آگے مودودی کی مثال بھی آ رہی ہے کہ کتنا ''کم علم'' تھا۔ لیکن لوگوں نے اس کو ''مفکر اسلام'' بنا دیا کہ اندھوں میں کانا سردار تھا۔ اب اس لیاقت علی کی ''قرارداد مقاصد'' کے سلسلہ میں جسٹس منیر جو چھپا ہوا قادیانی یا کم از کم بے دین آدمی ضرور تھا۔ اس نے ایک نجی مجلس میں کہا تھا کہ ہمارا ''مولوی'' اتنا کم علم ہے کہ اس قرارداد مقاصد پر بغلیں بجاتا پھرتا ہے اور اس کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ ''حاکمیت'' یا اللہ تعالیٰ کی ہو سکتی ہے یا ''لوگوں'' کی۔ یہ دونوں کا ''ساجھ کھاتہ'' نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے نظام پکے اور ایک اصول پر ہیں اور لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے رہتے ہیں۔ کبھی کچھ اور کبھی کچھ اور۔

139۔ اس قرارداد کے عملی نتائج یہ ہیں کہ 1956ء میں چودھری محمد علی نے اس قرارداد کے تحت ایک کافرانہ آئین بنایا اور اس کی پہلی Casualty یا ہدف چودھری محمد علی خود تھا کہ وزارت عظمٰی سے ہاتھ دھونے پڑے۔ 1958ء میں ایوب خان نے اس آئین کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ 1962ء میں ایوب خان نے اس قرارداد کے تحت ایک اور کافرانہ آئین بنایا اور 1969ء میں خود اس آئین کی خلاف ورزی کر کے حکومت یحیٰی خان کے سپرد کر دی۔ جس نے حکومت سنبھالتے ہی اس آئین کو ختم کر دیا۔ 1973ء میں ذوالفقار بھٹو نے اس قرارداد کے تحت جو آئین بنایا تو اس آئین کا سب سے بڑا ''اسیر'' یا قیدی ملک کا صدر فضل الٰہی تھا۔ جو خود صدر ہاؤس کی دیواروں پر اپنی ''رہائی'' کے لئے ''مجھ کو آزاد کریں'' کے الفاظ لکھتا دیکھا گیا اور بھٹو کے ایک اور ''پروردہ'' ضیاء الحق نے اس قانون کی پہلے ''دھجیاں'' اڑائیں۔ پھر اسی آئین کو بحال کر کے بھٹو کو پھانسی چڑھا دیا، ساتھ ہی حکم دیا کہ اس قرارداد مقاصد کو 1973ء کے آئین کا ''سرخیل'' بنا کر اس کو اس آئین کا ''دیباچہ'' تسلیم کر لیا جائے۔ اس

وقت تو آگے سے کوئی نہ ...لا۔ ضیاء الحق کی ہلاکت کے بعد ایک شرارتی ذہن والے چیف جسٹس افضل ظلہ نے جسٹس نسیم حسن شاہ کے ماتحت ایک کمیشن تشکیل دیا کہ ضیاء الحق کی اس کارروائی کے 1973ء کے آئین پر ''اثرات'' واضح کئے جائیں۔ کمیشن نے رپورٹ دی کہ اس عمل کے بعد 1973ء کے آئین کی آدھی سے زیادہ ''شقوں'' میں ترمیم کی ضرورت ہے یا ان ''شقوں'' کو نئی شکل دینا ہوگی۔ جسٹس ظلہ نے کہا ''رہنے دو، یہ قرارداد 1973ء کے آئین کے لئے اسلام کا ''تڑکا'' یا ''مسالہ'' کا کام کرتی ہے، توبہ میرے اللہ۔ ہم اس طرح اسلام کے ساتھ ''فراڈ'' کرتے ہیں۔ تو قارئین اس ملک کا ساٹھ سالوں سے نہ کوئی آئین ہے، نہ قانون، یہ ملک اللہ تعالیٰ کی قدرت سے چل رہا ہے۔ ورنہ اس کافرانہ قانون کے تحت اسی جسٹس افضل ظلہ نے کورٹ میں اعلان کیا تھا کہ ان ججوں کے احکام میں رب کی سفارش بھی نہ سنی جائے گی۔ (توبہ میرے اللہ)۔ ایسی توہین آمیز باتوں سے ہم پر پتھر برس سکتے تھے۔

140۔ ہمارے جج نظریہ ضرورت کے طور پر جو فیصلہ کرنا چاہیں یا جو فیصلہ کریں، وہی آئین اور قانون ہے۔ جسٹس منیر نے 55-1954ء میں تمیز الدین کا مقدمہ خارج کرتے وقت، آزادی ہندو پاکستان کے قانون کی دھجیاں اڑا دیں کہ وہ سارا قانون ہی غلط تھا ہاں پاکستان چونکہ ''وجود'' میں آچکا ہے تو یہ ایک ''حقیقت'' ہے۔ تو اس کو نظریہ ضرورت کے تحت چلایا جائے۔ یہ عاجز وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ میں قادیانیوں کے سلسلہ میں پیش ہو چکا ہے جس کی جھلکی آگے آرہی ہے۔ میں نے وہاں کوئی لگی لپٹی نہ رکھی اور جج ایک دوسرے کا منہ ''تکتے'' خاموش ہو گئے۔ اس قانون کے تحت ملک کا سب سے بڑا وکیل شریف الدین پیرزادہ ہے۔ اکثر حکومتوں کا قانونی مشیر یہی صاحب ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں اس گئے گزرے آئین اور قانون کو وہ ایسے الفاظ میں ڈھال دیتا ہے، جو حکومت کی ''ضرورت'' ہوتی ہے۔ ویسے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اچھا وکیل وہ ہوتا ہے۔ جو ہر سچ کو جھوٹ ثابت کردے

اور ہر جھوٹ کو سچ ثابت کر دے۔ یہاں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اچھا وکیل نہ مل سکے تو ''جج کر لو'' یعنی وکیل کے جھنجھٹ میں پڑنے کی بجائے جج سے ''رابطہ'' باندھ لو۔ یہ ہیں ہماری انصاف کی عدالتیں، اور یہ کافرانہ رومن قانون، لیکن اس قانون کے تحت ہم نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا ''شریک''، تسلیم کر لیا ہے تو لوگوں کے ''نمائندہ'' کے طور پر جو ہمارا حاکم بنتا ہے یا ویسے اس کافرانہ اور باطل آئین کو چلاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بھی عبرتناک انجام سے دوچار کر دیتا ہے۔

141۔ ملک کا پہلا وزیر اعظم لیاقت علی اپنے پروردوں اور حواریوں کی سازش سے گولی کا شکار ہوا۔ دوسرے وزیر اعظم ناظم الدین کو اس کے اپنے چنیدہ حواریوں نے ''برخاست'' کر دیا۔ تیسرے کٹھ پتلی وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کو پہلے تگڑم ناچ نچایا اور آخر میں ''برخاست'' کر دیا۔ تو ان تینوں کارروائیوں کے ''کرتا دھرتا'' ملک کے گورنر جنرل غلام محمد کو ''گھسیٹ'' کر گورنر جنرل ہاؤس سے باہر نکالا۔ یہ ہے 1955ء تک یعنی پاکستان کے پہلے آٹھ سالوں کی تاریخ۔ چوتھا وزیر اعظم ایک سول بیوروکریٹ چودھری محمد علی کو بنایا گیا جس سے 1956ء کا کافرانہ آئین بنوا کر اس خود کو اس آئین کے تحت مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ تھا اور پاکستان کا کرتا دھرتا میر جعفر کا فرزند سکندر مرزا بن گیا۔ جس نے پاکستان کی خالق جماعت کے تین سرکردہ لیڈروں، حسین شہید سہروردی، اسمٰعیل ابراہیم چندریگر اور فیروز خان کو دو سال کے عرصہ میں باری باری وزیر اعظم کی کرسی پر بھی بٹھایا اور پھر ٹشو پیپر کے طور پر استعمال کرتے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ آخر 1958 میں خود بھی قید ہو کر پہلے کوئٹہ لے جایا گیا اور پھر لندن میں جلاوطنی کی زندگی گزاری۔ موت کے بعد لاش کو آ کر ایران میں دفن کیا۔ پھر وقت آیا کہ لاش کو قبر سے نکال کر باہر پھینک دیا گیا۔ توبہ میرے اللہ۔

142۔ ملک کے اگلے سربراہ ایوب خان کے حشر سے قوم ''باخبر'' ہے۔ کہ ''ایوب کتا ہائے ہائے'' کے نعرے ایسے زبان زد عام ہوئے کہ اس کے اپنے پوتے بھی یہ نعرے لگا رہے تھے تو اس

کے اپنے ہی ایک پروردہ یحییٰ خان نے ذلت کے ساتھ اس کو صدر ہاؤس سے نکال دیا۔
بالآخر بے غیرت ٹولہ کا یہ سربراہ یحییٰ خان نہ صرف خود ذلت کا ایک نشان ہے بلکہ پوری قوم کو ایسی ذلت سے دوچار کیا کہ اسلامی تاریخ کے سیاہ ترین دن سقوط ڈھاکہ کا ذمہ دار بن گیا اور باقی زندگی ضلالت اور قید میں گزاری۔ اس سے اگلا سربراہ ذوالفقار بھٹو پھانسی چڑھ گیا اور بعد میں آنے والے ضیاء الحق کے پرخچے ہوا میں اڑ گئے۔ ان کے بعد آنے والے تین صدر غلام اسحٰق، فاروق لغاری اور رفیق تارڑ بھی بے عزتی کے ساتھ صدر ہاؤس سے رخصت کیے گئے۔ دونوں وزرائے اعظم، نواز شریف اور بے نظیر کئی سالوں کی جلاوطنی کے بعد انہی دنوں ملک واپس پہنچے ہیں۔ بے نظیر تو عبرتناک انجام سے دوچار ہو چکی ہے۔ نواز کے ساتھ مزید کیا ہوتا ہے اور پرویز مشرف کس عبرتناک انجام سے دوچار ہوتا ہے۔ مجھے تو حالات بڑے بھیانک نظر آ رہے ہیں۔ لیکن کوئی نہیں سوچتا کہ کبھی کسی اور ملک میں بھی اتنے کم عرصے میں اس کے سربراہ ایسے حشروں سے دوچار ہوئے ہیں؟

143۔ لطف کی بات ہے کہ صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور اکثر وزیر بھی عبرتناک انجاموں سے دوچار ہوتے رہے۔ جو بیانات کئی صفحات میں ختم نہیں ہوتے۔ سندھ کے پہلے وزیر اعلیٰ محمد ایوب کھوڑو کو سال بھر کے اندر ڈسمس کر دیا گیا۔ اس کے بعد آنے والے پیر الٰہی بخش، غلام علی تالپور، پیرزادہ عبدالستار اور قاضی فضل اللہ اسی حشر سے دوچار ہوئے پھر صوبے ختم ہو گئے۔ پنجاب کے پہلے اور شریف وزیر اعلیٰ خان آف ممدوٹ کو لیاقت علی نے ذاتی عناد کی وجہ سے برخاست کرایا۔ دوسرا امتاز دولتانہ 1951ء میں جھرلو انتخابات سے اپنے مرضی کے لوگوں کا چناؤ کرا کے وزیر اعلیٰ تو بن گیا۔ لیکن 1953ء میں جب اینٹی قادیانی تحریک کے نتائج کے طور پر بے عزتی سے اسے نکالا گیا تو اس کے ایک ''پروردہ'' نے بھی اس کا ساتھ نہ دیا۔ فیروز خان نون کو وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا اور دولتانہ کے وزیر فیروز خان کے وزیر بن گئے۔ ایک سال بعد فیروز خان کو بھی ''نون غنہ'' بنا دیا گیا۔ جس کی جگہ چند ماہ عبدالحمید دستی نے پوری کی اور پھر

''ون یونٹ'' وجود میں آ گئی۔ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خانصاحب کو پاکستان بنتے دوسرے ہی دن ڈسمس کرنا پڑا کہ اس نے پاکستان کے جھنڈے کو سلامی دینے سے انکار کر دیا۔ نئے وزیر اعلیٰ خان قیوم نے آٹھ سال صوبہ سرحد کو خوب چلایا، کافی اچھے کام بھی کئے خاص کر پاکستان دشمن غفار خان کے خاندان کو خوب ''نتھ'' ڈالی اور صوبہ سرحد کا ''مرد آہن'' کہلاتا تھا۔ 1955ء میں بہانے سے اس کو مرکزی حکومت میں لے لیا گیا تو اس کے ''پروردوں'' میں سے ایک ''گھپاچو'' نہ مل سکا جس کے سر پر وزیر اعلیٰ کا ''تاج'' رکھا جاتا۔ پہلے یہ تاج اس کے پرائیویٹ سیکرٹری غلام اسحٰق (بعد میں ملک کے صدر) کے سر پر رکھنا چاہا۔ اس نے انکار کیا تو انسپکٹر جنرل پولیس سردار رشید کو وزیر اعلیٰ بنا دیا۔ چند ماہ بعد یہ قیوم خان جب اپنے صوبے سرحد میں آیا تو اس کی ''سواگت'' کالی جھنڈیوں سے کی اور وہ ایک طرح سے سیاسی موت سے دوچار ہو گیا۔ چند دن بعد سردار رشید کو بھی برخاست کرنا پڑا کہ صوبے ختم ہو رہے تھے۔ بلوچستان، تو صوبہ ہی نہ تھا اور بنگال کے شریف وزیر اعلیٰ نورالامین ایک طالب علم سے شکست کھا گیا تھا۔ توبہ میرے اللہ۔

144۔ 1970ء میں یحییٰ خان نے صوبے بحال کئے۔ اس سے پہلے مغربی پاکستان میں تین آدمی ڈاکٹر خان صاحب، سردار رشید اور مظفر علی قزلباش وزیر اعلیٰ بنے اور تینوں کو باری باری ڈسمس کیا گیا تھا۔ 1958ء میں مارشل لاء لگ گیا تھا جو دسمبر 1971ء میں ختم ہوا۔ میں ہر صوبہ سے جو نام مجھے یاد ہیں لکھوں گا کہ ہر وزیر اعلیٰ کی وقت سے پہلے چھٹی کرا دی یا کسی عبرتناک انجام سے دوچار کیا گیا۔ پنجاب سے معراج خالد، مصطفیٰ کھر، حنیف رامے، صادق قریشی، غلام حیدر وائیں، نکئی اور شہباز شریف کا ذکر کروں گا۔ سندھ سے ممتاز بھٹو، غلام مصطفیٰ جتوئی، جام صادق، غوث علی شاہ اور پچھلے دنوں ایک عبداللہ شاہ کا نام اخباروں میں قارئین نے پڑھا ہو گا کہ ملک سے بھاگ گیا تھا اور اب نڈھال حالت میں ملک پہنچا اور مر گیا۔ صوبہ سرحد سے حیات شیر پاؤ، نصر اللہ خٹک، ارباب جہانگیر، صابر شاہ، مہتاب عباسی، آفتاب شیر پاؤ نے

بھی عزت کے ساتھ کرسی نہ چھوڑی۔ بلوچستان سے عطااللہ مینگل اس کا بیٹا اختر مینگل، اکبر بگٹی، جام غلام قادر، تاج جمالی، متعدد لوگ عبرتناک صورت حال سے دوچار ہوئے اوران سب سیاستدانوں کی بدعنوانیوں کی کہانیاں کئی کتابوں میں ختم نہیں ہوتیں۔ اول تو یہ کافرانہ نظاموں کو اپنانے کی وجہ سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مار پڑ رہی ہے۔ دوم کہ وزیر صرف وہ لوگ بنتے ہیں جو بددیانت اور بدکار ہوں اور اگر پہلے ایسے نہ ہوں تو ان کافرانہ نظاموں میں صرف بددیانت اور بدکار لوگ چل سکتے ہیں تو ساری کی ساری حکومتوں اور حکومتی اداروں یا کچہریوں پر بددیانت اور بدکار لوگ چھائے ہوتے ہیں۔ تو اب معاشرہ کیسے ٹھیک ہو۔ توبہ میرے اللہ۔ یہ عاجز آہ وزاری نہ کرے تو کیا کرے۔

145۔ یہ عاجز اپنی اس بری حالت کی زیادہ ذمہ داری قادیانیوں، چھپے قادیانیوں، بے دین لوگوں اور ابن الوقت لوگوں پر ڈال رہا ہے کہ انگریز ان کو ہم پر ''مسلط'' کر گئے۔ یہ سب ایک تھالی کے چٹے بٹے ہیں، اندرونی طور پر ان سب لوگوں کے رابطے ہوتے ہیں اور یہ ایک ''ٹریڈ یونین'' کے طور پر پاکستان کو چلا رہے ہیں۔ جب تک قادیانی مسئلہ حل نہیں ہوتا ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ غلام کذاب کو پیدا کرنا ایک ''تاریخی حادثہ'' تھا جو ہماری غلامی کی وجہ سے پروان چڑھ گیا۔ ورنہ آج اگر کوئی ایسا آدمی سامنے آئے تو اس کو ہماری عدالتیں اسی وقت پھانسی چڑھا دیں گی۔ اس لئے اب جو آدمی اس غلام کذاب کی پیروی کرے، وہ بھی پھانسی کا حقدار ہے۔ انصاف تو یہ تھا جس دن پاکستان بنا اس دن تمام قادیانیوں کو بتا دیا جاتا کہ وہ لوگ توبہ کریں یا یہ ملک چھوڑ دیں ورنہ ان کو مرتد کی سزا ملے گی یا کم از کم وہ ''چور اور ڈاکو'' ہیں کہ اسلام پر ''ڈاکے'' مارتے رہتے ہیں۔ یعنی اپنی مرضی کے اسلام کا پرچار کرتے ہیں۔ وہ فرد کے طور پر ہر تھانہ میں دس نمبر بدمعاش کی طرح اپنا نام ریکارڈ کرائیں۔ وہ کسی جگہ ''اجتماع'' نہیں کر سکتے خواہ وہ اس جگہ کا نام مسجد کی بجائے کوئی عبادت خانہ رکھیں اور نہ ان کا کوئی مرکز ہو سکتا ہے وغیرہ، جہاں مل کر وہ لوگ ہم مسلمانوں پر ''ڈاکے'' مارنے کی تجویزیں بنائیں۔

لیکن کیا ہوا؟ 1947ء ہی میں قادیان سے جھوٹے نبی کے مرکز کو فوج کی حفاظت میں لاہور پہنچا دیا گیا اور قائداعظم کی وفات کے چار دن بعد موجودہ ربوہ کی زمین لیاقت علی کے حکم پر پنجاب کے وزیر مال ممتاز دولتانہ نے کوڑیوں کے بھاؤں قادیانیوں کو بیچ دی کہ وہ پنجاب کے مرکز میں جھوٹے نبی کا ''مرکز'' بھی بنائیں۔ 1953ء میں جو قادیانیوں کے خلاف تحریک شروع ہوئی اس کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ''چھپے ہاتھوں'' نے کرایا اور کچھ لوگوں کو ''استعمال'' کیا گیا۔ کچھ نے ''جانتے'' ہوئے اور کچھ نے ''نہ جانتے'' اس تحریک میں وہ عمل کیا یا ایسے کردار سرانجام دیئے جو چھپے ہاتھوں کی ''ضرورت'' تھے۔ قادیانیوں کے خلاف مسودہ مودودی نے تحریر کیا یا اس سے تحریر کرایا گیا کہ پاکستان کی تحریک کی مخالف اور جہاد کشمیر 48-1947ء میں اوٹ پٹانگ فتویٰ دے کر ہم مسلمانوں کو تین گروہوں میں بانٹ کر ہم پاکستانیوں کے لئے کشمیر کے جہاد میں شمولیت کو حرام قرار دے دیا۔ یہ سورۃ الانعام آیت مبارکہ 159 اور سورۃ النساء آیت مبارکہ 75 کی خلاف ورزی تھی۔ تو مودودی کی ''ساکھ'' بہت گر گئی تھی، جس کو بحال کرانے کے لئے اس نے یہ عمل کیا۔ لیکن بات اس سے بھی بڑی ہے کہ مودودی کی جماعت نے اس اینٹی قادیانی تحریک میں کوئی عملی حصہ نہ لیا اور دوسروں کو قربانی کا بکرا بنوایا۔

146۔ بات یہاں بھی ختم نہیں ہوتی کہ مارشل لاء کی ایک عدالت نے مودودی کو ''پھانسی'' کی سزا سنائی لیکن یہ ''ڈرامہ'' تھا یہ سزا بعد میں ''معاف'' کر دی۔ جسٹس منیر جو چھپا قادیانی تھا، اس کی انکوائری کمیٹی نے نہ صرف مودودی کو ''مفکر اسلام'' بنا دیا بلکہ یہ اعلان بھی کر دیا کہ اس ملک میں واحد شخصیت مودودی کی ہے جو اسلام کو سمجھتا ہے۔ تو اس کے بعد مودودی نے اپنی تحریروں اور خاص کر تفہیم القرآن میں، حق و باطل میں فرق نہ کرتے ایک طرف بقول حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام کو پاش پاش کر دیا تو دوسری طرف بے ادبیوں کی حدیں ''پھلانگ'' گیا اور اسلامی فلسفہ حیات کو تضاد کا شکار بنا دیا۔ جس کی کچھ تفصیل آگے پیراگراف 172

میں آ رہی ہے۔ تحریک میں سب سے زیادہ قربانی عبدالستار نیازی کے تحت بریلوی مکتب فکر نے غیر منظم طریقے سے دی۔ غلام کذاب کے پوتے کرنل داؤد نے جو نہتے مسلمانوں کو ان دنوں شہید کرایا کہ جہاد کشمیر میں ایک فرقان بٹالین بنا کر متعدد قادیانیوں کو سپہ گری کی تربیت دی گئی تھی اور یہ ہتھیار قادیانیوں نے اپنے پاس رکھے ہوئے تھے۔ انہی لوگوں کو سرکاری جیپوں میں بیٹھا کر کرنل داؤد ہر اجتماع کو گولیوں سے چھلنی کرا دیتا رہا۔ اس سلسلہ میں قارئین رائے احمد کمال کی کتاب پڑھیں، اتنے نہتے لوگ شہید کئے اور لوگ ڈر گئے کہ بیس سال یعنی 1973ء تک کسی کو قادیانیوں کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔ بلکہ جی ایچ کیو سے جا کر میجر جنرل حیاء الدین قادیانی نے کرنل خوشی محمد کو حکم دیا کہ مسجد وزیر خان کے اجتماع کو گولیوں سے بھون ڈالا جائے۔ لیکن یہ حکم نہ مانا گیا کہ کچھ مسلمان فوجی افسروں کو ان تمام اعمال میں قادیانی سازش کی کچھ بو آ گئی تھی۔ علاوہ ازیں کہا جاتا ہے کہ اس تحریک کو سیاسی یا حکومتی مدد ممتاز دولتانہ نے دی یا اس سے ''دلوائی'' گئی کہ وہ ناظم الدین کی چھٹی کرا کے خود وزیر اعظم بننا چاہتا تھا۔ یہ سیاسی چال الٹی پڑی اور دولتانہ اپنا ''پڑہ'' کرا بیٹھا کہ وزارت اعلیٰ سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ ناظم الدین کو بھی البتہ برخاست کیا گیا اور گورمانی اور لاہوری قادیانی عزیز برادران کی مدد سے ایک ''لاہوری غندہ'' غلام محمد ملک کا سربراہ بن گیا۔ ساتھ ہی فوج نے مارشل لاء لگانے کا ''تجربہ'' کر لیا کہ بعد میں انہوں نے ایوب کے تحت سارے ملک میں مارشل لاء لگانا تھا اور درمیانی عرصہ میں سیاستدانوں کو تگڑم ناچ نچایا جا رہا تھا۔ ظفر اللہ قادیانی کا کوئی کچھ نہ کر سکا اور جب تک اس نے چاہا وہ ہمارا وزیر خارجہ رہا کہ چھپے ہاتھوں نے اس کو ان ''خدمات'' کی وجہ سے بعد میں بین الاقوامی عدالت کا جج بنوا دیا۔ قارئین! خود فیصلہ کریں کہ فائدہ کس نے اٹھایا، عظیم قربانی کس نے دی جو رائیگاں گئی۔ کون کس کا ''آدمی'' ہے! اور کس نے اس کھیل میں کہاں کے اشارے سے ''حصہ'' لیا۔

147۔ بہرحال بیس سال یعنی 1973ء تک کسی نے قادیانیوں کے خلاف ''چوں'' بھی نہ کی۔ اور وہ

لوگ ہمارے حکومتی اداروں پر چھائے رہے۔ظفر اللہ کے جانے کے بعد لاہوری قادیانی فاروقی ایوب خان کا مشیر خصوصی تھا۔غلام کذاب کے پوتے ایم ایم احمد سمیت، قادیانی ہی ہمارے اصلی ''کرتا دھرتا'' ہوتے ہیں۔ مارچ 1971ء میں جب ڈھاکہ جا کر یحییٰ خان مشرقی پاکستان کو آخری لات ''مار'' رہا تھا تو اس کا بڑا مشیر یہی غلام کذاب کا پوتا تھا۔ 1973ء میں قادیانیوں نے خود ''شرارت'' کر کے اپنے خلاف تحریک چلوائی کہ دیکھیں کتنے لوگ ان کے ''خلاف'' ہیں یا حادثۃً یہ تحریک چل پڑی۔ یہ تحریک بڑی کامیاب رہی لیکن اپنے کافرانہ آئین میں ترمیم کرتے۔ ہم لوگ جیتی ہوئی ''بازی'' عملی طور پر ''ہار'' گئے۔ ہم نے قادیانیوں کو ایک ''اقلیت'' تسلیم کر کے ایک گروپ بنا دیا ہے کہ وہ اس کافرانہ رومن قانون کے تحت اب ایک گروپ کے تحت ایک طرف ''بنیادی حقوق'' مانگتے ہیں اور دوسری طرف ''قانونی تحفظ'' مانگتے ہیں کہ ہم ان کی شرپسندیوں یعنی ہم پر ڈاکہ مارنے کے اعمال میں ''رکاوٹ'' نہ بنیں۔توبہ میرے اللہ۔تو اس عاجز نے قادیانیوں کے خلاف 1990 میں شرعی عدالت میں ایک مقدمہ دائر کیا اور اپنی ''درخواست اور تحقیق'' کو ایک انوکھی شکل دی کہ قادیانیوں کو گروہ یا اقلیت تسلیم کرنا بہت بڑی غلطی تھی۔ قادیانیوں کا کوئی مذہب نہیں، وہ تو کہتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور ان کا مذہب دین اسلام ہے۔اب ہم اگر یہ بات تسلیم کر لیں تو پھر ہم کہاں گئے یا ہم کون ہیں؟ تو عدالت کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ قادیانی کیا ہیں؟ میری تحقیق یہ ہے کہ قادیانی ڈاکو اور حملہ آور ہیں اور ہم پر حملہ کر کے وہ ہم سے اسلام چھین کر خود اس کے ''مالک'' بننا چاہتے ہیں۔تو عدالت ہمیں ان ڈاکوؤں کی ''شرپسندی'' سے بچائے۔اس سلسلہ میں یہ عاجز کچھ عملی سفارشات پیش کرے گا۔لیکن یہ بھی باور کر لیا جائے کہ قادیانیوں نے ایک جھوٹے اور کذاب کو اللہ تعالیٰ کا پیغمبر بنایا ہوا ہے۔جس کا کوئی پکا عقیدہ نہ تھا۔کبھی مجدد بنتا تھا، کبھی نبی اور کبھی اپنے آپ کو حضرت مریم علیہا السلام قرار دیا کہ اس کو حیض بھی آیا اور جب پاک ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ''رجولیت'' کی۔تو وہ مسیح موعود بن گیا۔(توبہ

میرے اللہ)۔ ہمارے ان نکتوں کی پہلی دو پیشیوں میں بڑی پذیرائی ہوئی اور ہمارے اخباروں نے ہمیں خوب خراجِ تحسین پیش کیا۔تو غیر ملکی ذرائع سے ایک خبر اخباروں میں آئی کہ پاکستان کے مسلمان قادیانی اقلیت کا ''ناطقہ'' بند کرنے والے ہیں۔تو مجھے شک پڑا کہ یہ خبر قادیانیوں کے ''آقاؤں'' نے دلائی ہے۔ بےنظیر ان دنوں حکومت پر براجمان تھی تو اس نے شرعی عدالت کے چیف جسٹس کو ملاقات کیلئے بلایا۔ مجھے شک پڑا کہ ''دال'' میں کچھ کالا ضرور ہے اور بےنظیر نے چیف جسٹس کو کوئی ''ہدایات'' ضرور دیں۔ میری تیسری پیشی 17 اپریل 1990 کو تھی جہاں میں نے قادیانی فتنہ کے حل کے لئے عملی تجاویز پیش کرنا تھیں۔ لیکن 9/10 اپریل 1990ء آدھی رات کو مجھے جگا کر 10 اپریل کو عدالت میں حاضر ہونے کو حکم ملا اور مجھے چیف جسٹس نے بتایا کہ اس مقدمہ کی باتوں کو اخباروں میں اتنا زیادہ اچھال دیا گیا ہے کہ حکومت کے لئے اب یہ ایک بہت بڑا ''مسئلہ'' بن گیا ہے اور شرعی عدالت تو ان باتوں یا ایسے نکتوں کو سننے کی مجاز نہیں جو اٹھائے گئے ہیں۔ ایسے نئے معاملات اٹھانے سے قادیانی مسئلہ جو 1973ء میں ''حل'' کر لیا گیا تھا۔تم (یعنی درخواست گزار) اس مسئلہ کو اور مشکل اور گھمبیر بنانے کی کوشش کر رہے ہو، اس لئے تمہاری درخواست رد کی جاتی ہے۔اس عاجز نے گزارش کی کہ عدالت مہربانی سے میری رہنمائی کرے کہ میں اپنے حقوق پر قادیانیوں کی اس ''ڈاکہ زنی'' کا معاملہ کہاں لے جاؤں؟ تو چیف جسٹس نے کہا ''کہ یہ ان کا کام نہیں'' تو میں نے گزارش کی وہ یہ معاملہ سپریم کورٹ کے شرعی بنچ کو 'ریفر' کر دیں۔تو چیف جسٹس نے کہا وہ اس کے بھی ''مجاز'' نہیں۔تو اس عاجز نے گزارش کی میری بات کو ''توہین عدالت'' کے زمرہ میں نہ لیا جائے۔ میری نیت دیکھی جائے اور یہ ''احتجاج'' ریکارڈ کیا جائے کہ اس کافرانہ قانون کی ''زبان اور طرز'' پر یہ شرعی عدالت بنانا اسلام کے ساتھ بہت بڑا ''مذاق'' ہے۔تو سارے ماحول پر ''سناٹا'' چھا گیا کہ مجھے کچھ کہنے یا جواب دینے کی بجائے چیف جسٹس نے اگلے مقدمہ کے درخواست گزاروں کو بلا لیا۔ (توبہ

میرے اللہ)

148۔ قارئین! یہ عاجز بعد میں بھی سیاسی پارٹیوں کے مقدمہ کے سلسلہ میں شرعی عدالت حاضر ہوتا رہا اور شرعی عدالت کے پہلے چیف جسٹس سے بھی ایک ''جھڑپ'' ہوئی تھی۔ جس نے ایک میٹنگ میں رومن قانون کو قرآن کا ''ماخوذ'' قرار دے دیا تھا تو میں نے اعلان کیا کہ یہ کلمہ کفر ہے کہ تم اس جھوٹے قانون کو ایسے قرار دے رہے ہو۔ یہاں صرف یہ اعلان کر دوں گا کہ اس کافرانہ آئین اور قانون کے تحت یہ شرعی عدالت بنانا، اسلام کے ساتھ بہت بڑا ''فراڈ'' ہے۔ بہر حال قادیانیوں کے مقدمہ کی طرف واپس آتے عرض کروں گا۔ رب سبحانہ کے راز بھی نرالے ہیں، اس کی ذات پاک نے جلد اس عاجز کو سپریم کورٹ میں پیش ہونے کی سعادت عطا فرما دی۔ جہاں اس عاجز نے اس سازش کے بخیے ادھیڑ دیئے کہ میرے ساتھ شرعی عدالت کے ''رویئے'' سے قادیانیوں کی حوصلہ افزائی ہوئی کہ وہ اپنے ''حقوق'' کا مقدمہ سپریم کورٹ میں لے گئے۔ اس عاجز نے 75 صفحات پر مشتمل قادیانیوں کی شرپسندی کا مسودہ تیار کر کے سپریم کورٹ میں پیش کر دیا کہ اس مقدمہ میں مجھے بھی ایک ''فریق'' تسلیم کیا جائے۔ جو درخواست منظور ہوگئی۔ سپریم کورٹ نے پانچ ججوں کا ایک بنچ تشکیل دیا جس کا سربراہ شفیع الرحمٰن تھا جس کی ''ہمدردیاں'' قادیانیوں کے ساتھ تھیں۔ قادیانی وکیلوں نے تقریباً ڈیڑھ دن اپنے حقوق کی جرح پر لگائے اور جب یہ جرح ختم ہوئی تو میں جواب دینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ تو شفیع الرحمٰن نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں میجر امیر افضل اسلام کا طالب علم ہوں اور آپ کا کورٹ مجھے اس مقدمہ میں فریق تسلیم کر چکا ہے اور اس سلسلہ کا خط اس کو دکھایا۔ تو بڑی بحث و مباحثہ کے بعد مجھے اپنا نکتہ ونگاہ پیش کرنے کی اجازت ملی۔ اس عاجز نے پیرا نمبر 147 میں بیان شدہ نکات جب وضاحت سے دہرائے تو ماحول پر ''سناٹا'' چھا گیا۔ جب میں اس نکتے پر پہنچا اور اس عاجز نے ثابت کر دیا ہے کہ قادیانی چور اور ڈاکو ہیں۔ چوروں اور ڈاکوؤں کے کوئی حقوق نہیں ہوتے وہ کیا ''حقوق''

مانگتے ہیں۔تو شفیع الرحمٰن بول پڑا کہ نہیں چوروں اور ڈاکوؤں کے بھی حقوق ہوتے ہیں۔تو میں نے پوچھا ''کیا حقوق ہوتے ہیں'' تو شفیع الرحمٰن نے کہا'' کہ میں عدالت سے سوال نہیں کرسکتا۔'' تو میں نے کہا کہ جناب یہ سوال نہیں ہے بلکہ ایک طرز بیان ہے کہ ہم چوروں اور ڈاکوؤں کو ایسے حقوق نہیں دے سکتے کہ وہ کسی جگہ اکٹھے ہوکر ہم پر ڈاکے مارنے کی تجویزیں بنائیں۔قادیانی خواہ کسی جگہ کو عبادت گاہ کا نام دیں یا مرکز جیسے ربوہ ہے۔وہ وہاں پر ہم مسلمانوں کے لئے کوئی بھلائی تو نہیں سوچتے بلکہ اپنی ''ٹریڈیونین'' کی کارروائیوں کو پروان چڑھانے کے بارے سوچتے ہیں۔تو میرے لحاظ سے ہر قادیانی مرتد ہونے کے علاوہ دس نمبر کا بدمعاش بھی ہے۔جیسے دس نمبر بدمعاش کو کنٹرول کرنے کے لئے تھانے میں حاضر ہونا پڑتا ہے۔قادیانیوں کو بھی ''کنٹرول'' کیا جائے اور اس سلسلہ میں اس عاجز نے کچھ سفارشات دینا شروع کیں تو شفیع الرحمٰن نے مجھے ہر لفظ کے بعد ٹوکنا شروع کردیا۔تو میں نے کہا کہ جناب جس طرح عدالت کے کچھ ''آداب'' ہوتے ہیں اسی طرح ہر مدعی اور سائل کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں کہ اس کو ٹوکا تب جاتا ہے جب وہ فقرہ مکمل کرے۔تو شفیع الرحمٰن کا چہرہ دیکھنے والا تھا کہ لمبی چوڑی بحث سے باقی چار جج صاحبان بہت متاثر معلوم ہوتے تھے اور بعد میں یہ صحیح ثابت بھی ہوگیا۔

149۔ شفیع الرحمٰن نے اپنے فیصلہ سے ثابت کردیا کہ وہ ہر قیمت پر قادیانیوں کی مدد کے لئے سب کچھ کررہا تھا۔اس نے لکھا کہ اس مقدمہ میں مذہبی سکالروں کو بلاکر ہمارے رائج قانون کے ''تقدس'' کو بہت مجروح کردیا گیا ہے کہ وہ لوگ جو چاہتے تھے کہتے جاتے تھے۔قادیانی بے چارے بڑے ''مظلوم'' ہیں کہ ان کے خلاف پاکستان پینل کوڈ میں بڑے سخت قوانین بنائے گئے ہیں۔ان کو عام آزاد شہریوں والے حقوق ملنے چاہئیں کہ وہ اپنے عقائد اور مذہب پر آزادی سے عمل کرسکیں وغیرہ۔باقی چار ججوں نے اس فیصلہ کے ساتھ اتفاق نہ کیا اور عبدالقادر چودھری کے تحت اکثریت کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ شفیع الرحمٰن کے فیصلہ کے ساتھ اتفاق

نہیں کرتے۔ پاکستان پینل کوڈ میں قادیانیوں کے خلاف جو قوانین بنائے گئے ہیں وہ صحیح ہیں اور مذہبی سکالروں نے اس مقدمہ میں بڑی محنت سے جو نکتے پیش کئے ہیں، انہوں نے قادیانی فتنہ کی خوب وضاحت کی ہے۔ لیکن ہم وہ سب سفارشات نہیں مان سکتے کہ موجودہ مقدمہ صرف قادیانیوں کے حقوق کے ''پہلو'' تک محدود ہے وغیرہ۔ بہر حال کئی دن کی یہ کارروائی ایک کتاب کا مضمون ہے شفیع الرحمٰن کو فطرت کی طرف سے بھی اپنے اکلوتے لڑکے کے سلسلہ میں بھی ایک عبرتناک حادثہ سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک اور بڑی حیرانگی کی بات ہے کہ قادیانیوں کا بڑا وکیل جی ابراہیم، ایک وقفہ کے دوران جب ہمارے بینچوں پر آ کر بیٹھا تو میں نے اعوذ باللہ پڑھتے اور کاذبوں پر لعنت بھیجتے منہ پیچھے کی طرف کر دیا۔ تو میرے ساتھ بیٹھے ایڈووکیٹ جنرل عزیز منشی نے مجھے کہا کہ جی ابراہیم تو قادیانی نہیں۔ تو میں نے اور زیادہ زور سے نعوذ باللہ پڑھتے کہا کہ پھر تو یہ مردود قادیانیوں سے بھی بدتر ہے۔ یہ سن کر اس کا چہرہ سورۃ القیامہ کے الفاظ ''باسرہ'' کی طرح ہو گیا اور اتنا ''مرعوب'' ہوا کہ قادیانیوں کے مقدمہ میں جب میں اس کی طرف نظر کرتا تھا تو وہ تھتھانے لگتا تھا۔ یہ مردود چند دن سندھ کا گورنر بھی رہ چکا تھا اور بعد میں معراج خالد کی حکومت کا وزیر، لیکن چند دنوں کے بعد بے عزتی سے اس کو برخاست کر دیا گیا تھا۔ اس مقدمہ کے دوران میری جرح میں کچھ وقفہ ملا تو بار کونسل کا ایک عہدیدار وکیل اپنا تعارف کرا کے میرے پاس آ کر بڑے ادب سے ''مشورہ'' دینے لگا کہ میری تحقیق بہت اونچے پایہ کی ہے۔ میں ان پہلوؤں کو وہاں لے جاؤں جہاں کچھ اثرات ہوں۔ یہ ''مقام'' یعنی سپریم کورٹ ایسی باتوں سے اثرات لینے کا ''مجاز'' نہیں وغیرہ۔ تو میں نے کہا کہ کلمہ حق ادا کرنے کے لئے اپنے آپ کو ''مقامات'' تک ''محدود'' نہیں کیا جاتا، وہ ہر جگہ ادا ہو سکتا ہے۔ اس آدمی کا چہرہ بھی ''باسرہ'' ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ کچھ جسٹس شفیع الرحمٰن کے اشارہ پر کر رہا تھا۔ تو میں نے اس سے ایک سوال پوچھ لیا کہ تم مجھے کلمہ حق ادا نہ کرنے کا جو مشورہ دے رہے ہو تو روز قیامت رب سبحانہ کو کیا جواب دو گے! یہ سن کر وہ گھبرا

کر اٹھ کھڑا ہوا۔ توبہ میرے اللہ! یہ ہیں ہماری عدالتیں، جج اور وکیل، لیکن بیچ عبدالقدیر چودھری جیسے نیک لوگ بھی ہیں۔ تو وقت گزر رہا ہے۔

150۔ قارئین! صورت حال ایسی کیوں ہے۔ اول تو یہ خطہ یعنی برصغیر ہندو پاکستان مردم خیز نہیں۔ تاریخ عالم میں جن لوگوں نے اچھے یا برے اعمال سے شہرت حاصل کی کہ عظیم حکمران تھے، عظیم فاتح تھے، موجد تھے یا ریفارمر تھے۔ ایسے دنیا کے پہلے تین چار سو آدمیوں میں اس خطہ کے کسی ایک آدھ آدمی کو شامل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک عوام کا تعلق وہ بھی دنیا کے کسی خطہ میں اتنے ''نادان'' یا ''کم علم'' یا پسے ہوئے یا انسانیت کی حدوں سے گرے ہوئے لوگ اس نسبت سے کہیں اور نہ پیدا ہوئے ہوں گے۔ جو بڑے بنے پھرتے ہیں، وہ بھی اوسط درجہ سے کچھ نیچے ہوتے ہیں۔ یعنی ایسے رہنما اور دانشور بھی کوئیں کی ''مینڈکیاں'' ہوتے ہیں کہ انہیں اپنی ناک سے آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ میں نے کچھ قرآن پاک کے حفاظ وکیلوں یا اسلام کی کچھ شدوبدر رکھنے والے وکیلوں کے ساتھ رابطہ باندھا تو اور زیادہ مایوس ہوا کہ بجائے ان کی اسلامی بصیرت سے انہیں یہ کافرانہ رومن قانون ایک جھوٹ کا پلندہ نظر آتا، اس کافرانہ رومن قانون نے ان کی اسلامی بصیرت کو ہی ختم کر دیا۔ ان میں صرف ایک مولوی تنزیل الرحمٰن کا ذکر کروں گا، جو اسلامی نظریاتی کونسل کا صدر بھی رہا اور شرعی عدالت کا چیف جسٹس بھی۔ اس کے دونوں عہدوں کے دوران اس کے ساتھ لمبی ملاقاتیں کیں۔ وہ بے چارہ کافرانہ رومن قانون کے طریقہ شہادت کو ''اسلامی'' بنانے پر اپنا وقت ضائع کرتا رہتا تھا۔ اس عاجز نے اس کے سامنے دلائل اور مثالوں سے ثابت کیا کہ وہ سور پر تکبیر پڑھ کر اس کا گلا کاٹ کر اس کو ''حلال'' کرنے کی لاحاصل مشق میں مشغول ہے۔ تو کہنے لگا اس نے اتنے سال محنت کی ہے یہ محنت ''رائیگاں'' نہ جانی چاہیے۔ تو میں نے کہا کہ اس محنت کے سامنے کوئی مدعا ہے نہ مقصد ہے۔ یہ بھی الفاظ کی تبدیلی کی ایک ''جگلری'' ہے جو کام پیرزادہ شریف الدین اکثر کرتا رہتا ہے۔ تو مولوی صاحب ''لاجواب'' ہو گئے۔ قارئین! بات

وکیلوں تک محدود نہیں، ہر پیشہ کیلئے ہے اور اصلی چیز ''مومن کی فراست'' ہے۔ جس سے ہماری ساری قوم عاری ہے۔ دو وکیلوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ فراست عطا کر دی۔ ایک علامہ اقبال تھا، جس نے حضور پاک ﷺ کے اس قول کو اپنایا کہ جس نے پہچانا اپنے نفس کو اس نے پہچانا اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کو، تو وہ ملک پاکستان کا ''فکری بانی'' بن گیا۔ دوسرا محمد علی جناح تھا، جس نے علامہ اقبال کے اس قول میں حضور پاک ﷺ کے فرمان سے یہ اضافہ کیا ''کہ اپنے دشمن کو بھی پہچانو'' تو وہ پاکستان کا ''عملی بانی'' بن گیا میری یہ تمام آہ وزاری، ان دو قولوں کے گرد گھومتی ہے کہ ان دو قولوں کو اپنا کر مومن کی فراست کے حامل بن جاؤ۔

151۔ یہ مومن کی فراست اس خطہ میں اللہ تعالیٰ نے اورنگزیب عالمگیر کو بھی عطا کر دی تھی کہ اسلام کے نام پر اس کو اپنا باپ اور بھائی بھی ''قربان'' کرنے پڑے۔ ورنہ اکبر مردود نے ابوالفضل اور فیضی کی مدد سے اس خطہ میں جو اسلام کا ''حلیہ'' بگاڑنے کا عمل شروع کیا تھا۔ تو اگر اورنگزیب نہ آتا تو ہمارا اسلام بھی ''رام رام'' والا ہوتا۔ اور ہم بھی ہندو قوم کا ایک حصہ بن کر آج ''بھارت ماتا'' اور ''بندے ماترم'' کے گیت گا رہے ہوتے۔ اورنگزیب نے تعلیم کو بھی بامقصد اور قرآن پاک کے تابع کرنے کی کوشش کی۔ انہی دنوں میں ملک چین میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ جس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔ جس میں دنیا کے کچھ مشہور لوگوں کے سو خطوط شائع ہوئے ہیں۔ پہلا خط سکندر یونانی کی طرف سے ایران کے شہنشاہ دارا کی طرف ہے۔ دوسرے خط میں شہنشاہ دارا کا جواب ہے جو اس نے سکندر کو دیا۔ اور ہنری ہشتم وغیرہ متعدد لوگوں کے بڑے ہی دلچسپ خطوط ہیں۔ ایک خط شہنشاہ اورنگزیب کی طرف سے اپنے پرانے اتالیق کو ہے کہ پڑھائی میں زیادہ زور صرف ونحو اور ادب پر دیا جاتا رہا نہ ہنر کی کوئی بات سکھلائی نہ جہاد کے تقاضے پڑھائے۔ نہ قلعوں کو سر کرنے کی Techanique بتائی نہ علوم کو قرآن پاک کے اصولوں کے تحت کرنے پر کوئی تعلیم دی وغیرہ۔ اب اورنگزیب تعلیمی اداروں کو ان لائنوں پر ڈھال رہے ہیں۔ بہر حال یہ عاجز اس

مضمون پر آگے چوتھے حصہ میں کچھ اور واضح کرے گا۔ لیکن اورنگزیب نے دانشوری کا لبادہ اوڑھنے والوں کی خوب گت نبائی اور ان کو بتایا کہ وہ لوگ ہرگز حقیقت کی کھوج نہیں لگاتے۔ اور ہمیں خطاب دے کر وہ کچھ بنا دیتے ہیں جو ہم نہیں ہوتے اور وضاحت کی کہ میرا دادا کو تم لوگوں نے ''جہانگیر'' بنا دیا۔ میرے باپ کو ''شاہجہان'' اور مجھے ''عالمگیر'' اور قابو ہم سے مرہٹے اور سکھ جیسے چھوٹے لوگ بھی نہیں ہوتے۔ لیکن اس سلسلہ میں اورنگزیب کو کامیابی نہ ہوئی کہ اس کے جانشین ان خوشامدی دانشوروں کے دام وفریب سے نہ نکل سکے۔ مرزا غالب، شہنشاہ ظفر کی عمر درازی کے لئے کہتا ہے۔ ''تم جیؤ ہزار برس اور ہر برس کے دن ہوں بیس ہزار۔'' توبہ میرے اللہ ان دانشوروں کی مبالغہ آرائیوں نے حکمرانوں کو اندھا کر دیا۔ پاکستان بننے کے بعد ہمارے ہاں بھی کچھ گنگا، جمنی لوگ آ گئے جو ہمیں مردہ مغل تہذیب اور اودھ کی ثقافت اور تہذیب اپنانے کی میٹھی لوری دیتے رہے کہ پاکستان دنیا کا پانچواں بڑا ملک اور سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ ہمارے یہ دانشور ہمیں لے ڈوبے۔ جوش ملیح آبادی جیسے ملحد اور پاکستان کی مخالفت کرنے والے کو بھی پاکستان میں ایک معزز مہمان کے طور پر بلا لیا گیا۔ اور اب اس کی برسیاں منائی جا رہی ہیں۔ فیض اور چراغ حسن حسرت جیسے بے دین، دوسری جنگ میں انگریزوں کے گیت گاتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد بے دین صحافت کے سربراہ بن گئے۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ صحافت ''دکانداری'' بن گئی۔ جنگ کے خلیل الرحمٰن کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ کہتا تھا: دکاندار ہوں، سؤر اور حرام بھی بیچتا ہوں اور حلال بھی۔ تو کچھ ''اسلام پسندے'' یا دائیں بازو کا لبادہ اوڑھنے والے قوم کے ''رہنما'' بن گئے۔ ان میں یہ عاجز صرف اخبار نوائے وقت کے مجید نظامی اور اردو ڈائجسٹ کے الطاف حسن قریشی کا ذکر کرے گا۔ لیکن یہ دونوں اور ان کے باقی ساتھی از خود مومن کی فراست سے عاری ہیں۔ تو یہ لوگ حق و باطل میں فرق نہیں کر سکتے تو بقول حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے لوگ، اسلام کو پاش پاش کرتے رہتے ہیں۔

152۔ یہ عاجز جو کچھ اب تک لکھ چکا ہے یا ایسے کلماتِ حق سے کتابوں کی کتابیں بھر چکا ہے۔ یہ سچ و حق اب بھی قوم تک پوری طرح نہیں پہنچا کہ ہمارے صحافی یہ سچ وحق شائع کرنے کو تیار نہیں۔ وہ قوم کو بھول بھلیوں میں رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ فضول اور ذہنی عیاشی والی باتیں لکھ کر قوم کو بیوقوف بناتے رہیں کہ ان کی اخباروں کی خوب بکری ہو۔ قوم انسانی زندگی کے مقاصد سے آگاہ ہوگئی اور حزب اللہ بن گئی تو یہ ذہنی عیاشی والے ان کے اخبار کون پڑھے گا۔ قوم کو اس طرح ''نادان'' رکھنے کی سب ذمہ داری اخبار نویسوں پر آتی ہے کہ انہوں نے قوم کو ''بھینسیں'' اور ''بھیڑیں'' بنا دیا ہے۔ اس کی زیادہ ذمہ داری مجید نظامی پر آتی ہے۔ جس کے نام کو یہ عاجز استعمال کر رہا ہے۔ 1995ء میں رب سبحانہ نے ایک صورت پیدا کر دی کہ مجید نظامی کو عملی طور پر واضح کیا جائے کہ وہ کس طرح قوم کو ''بھینسیں'' بنا رہا ہے۔ چنانچہ 1995ء میں ہی مصطفٰی صادق کے ایک اخبار کے سلسلہ میں مجید نظامی سمیت ایسے ''دانشوروں'' کا ایک اجتماع ہوا۔ جس میں اس زمانے کا ملک کا صدر فاروق لغاری بھی مدعو تھا۔ مجید نظامی کو جب خطاب کیلئے بلایا گیا تو اس نے ایک فقرہ اجتماع میں مدعو ہونے کے سلسلہ میں شکریہ کے طور پر ادا کیا اور پھر کہا۔ ''کہ وہ اس اجتماع میں خاک تقریر کرے کہ یہ تقریر بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہوگی۔'' تو اس عاجز نے اسی دن فاروق لغاری کو کاپی دیتے مجید نظامی کو خط لکھا۔ جس میں کہا ''کہ اے مجید نظامی اس اجتماع میں یہ سچ اور کلمہ حق کہنے پر آپ کو لاکھ لاکھ مبارکیں کہ تمہاری ''فراست'' کام کر گئی کہ اجتماع میں فاروق لغاری سمیت تمام لوگ جنہوں نے دانشوری کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا وہ تمہیں ''بھینسوں'' کی طرح نظر آئے۔ اگر تمہارے پاس ''مومن کی فراست'' ہوتی تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ ملک کی سب سے ''بڑی بھینس'' مجید نظامی تم ''خود'' ہو۔ بلکہ ملک کے اکثر ان برائے نام دانشوروں کو ''بھینسیں'' بنانے کی ذمہ داری مجید نظامی اور اخبار نوائے وقت پر ہے۔ یہ عاجز 1979ء سے اس سلسلہ میں مجید نظامی کو سینکڑوں خطوط لکھ چکا ہے اور یہ بھی لکھ چکا ہے کہ

پاکستان میں صحیح قسم کا اسلام بونافذ نہیں ہو رہا، اس کی ذمہ داری بھی مجید نظامی پر آتی ہے۔

قارئین! ان چند الفاظ میں بہت زیادہ گہرائی ہے۔ میرے پچھلے بیانات کے تناظر میں قارئین ان حروف میں غوطہ زن ہوں تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ ہماری ''کم علمی''، ''نادانی'' اور مومن کی فراست کے حامل نہ ہونے کی ساری ذمہ داری ان اخباروں اور صحافیوں اور خاص کر مجید نظامی پر ڈالی جاسکتی ہے۔

## ﴿ چوتھا حصہ ﴾

## دانش نورانی اور روحانی پہلو

153۔ مومن کی فراست کے لئے علامہ اقبال نے ''دانش نورانی'' کے الفاظ استعمال کئے اور عام ''فراست'' کیلئے ''دانش برہانی'' کے الفاظ استعمال کئے، جو مجید نظامی سمیت شیطان کو بھی میسر ہے اور باطل نے بھی فراست کے حامل بے حساب لوگ پیدا کئے۔ جو آج کل ہم پر غالب ہیں اور اندر اور باہر دونوں اطراف سے ہمیں مار دے رہے ہیں۔ ہم نہ صرف مومن کی فراست سے عاری ہیں بلکہ صرف مسلمان ہیں اور مومن ہرگز نہیں۔ ورنہ سورۃ الروم آیت مبارکہ 47 کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مومنین کی مدد کا وعدہ فرمایا ہے اور سورۃ النساء آیت مبارکہ 141 کے مطابق کافرین، مومنین پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتے۔ بات یہاں ختم نہیں ہوتی بلکہ ہم تو ''مسلمان'' بھی نہیں، شیعہ ہیں، سنی ہیں، دیوبندی ہیں، بریلوی ہیں، اہلحدیث ہیں وغیرہ یا عرب ہیں، ترک ہیں، ایرانی ہیں، افغانی ہیں، پاکستانی ہیں وغیرہ یا پنجابی ہیں، سندھی ہیں، مہاجر ہیں، پختون ہیں، بلوچی ہیں وغیرہ۔ تو میری آہ وزاری یہ ہے کہ آیئے اول اور آخر مسلمان بنیں گروہ بندیوں اور فرقہ داریوں سے توبہ کریں، پھر ظاہر و باطن کو ایک کر کے مومن بنیں۔ تو رب سبحانہ خود بخود ہمیں مومن کی فراست عطا کر دے گا۔ ہاں اس کے بھی درجات ہیں اور جیسے ہی تقویٰ میں اضافہ ہوتا رہے گا تو درجات بلند ہوتے رہیں گے۔

ایمان کا ایک ایسا درجہ ہے جہاں پہنچنے کے بعد مومن کے سامنے تمام نورانی اور برہانی علوم آ کر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے کہ آؤ ہم سے استفادہ کرو۔ انسان کی بصارت اور بصیرت میں ایسی یک رنگی پیدا ہو جاتی ہے کہ دل کا نور آنکھ کا بھی نور بن جاتا ہے۔ انسان ہر چیز یا ہر معاملہ کا مشاہدہ صرف آنکھوں یا کانوں سے نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو انسان کے اندر سورۃ السجدہ، سورۃ الحجر اور سورہ ص کے مطابق جو اپنی روح پھونکی ہوئی ہے وہ انسانی نفس پر غالب ہو کر انسان کو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو انسانی نفوس کے لئے سورہ شمس آیت مبارکہ ۸ میں فجور اور تقویٰ دونوں کی نشاندہی فرمائی ہے تو روحِ نفس کو فجور کی طرف نہیں جانے دیتی اور انسان صرف تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ انسانی شخصیت کی پیچیدگیوں پر جناب ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن بعد کے دانشوار ''خاموش'' ہیں تو اس عاجز کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی کہ اپنی تفسیر القرآن اور تحریروں میں بہت کچھ لکھا اور یہاں صرف جھلکی دے رہا ہوں۔ ہمارے ہاں کے دانشوروں اور علماء کا لبادہ اوڑھنے والوں میں سے اکثر اس معاملہ میں نابلد ہیں۔ تو مودودی سمیت یہ سب حق و باطل میں فرق نہیں کر سکتے تو بقول حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ لوگ بھی اسلام کو پاش پاش کر رہے ہیں۔

154۔ مومن کی فراست کی اس مختصر وضاحت کے بعد ہم یہ اضافہ کریں گے کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کہ ڈر مومن کی فراست سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے'' اب تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا۔ باطل والوں اور گنہگاروں کے لئے یہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی تنبیہ تھی کہ وہ جو شر پسندیاں کر رہے ہیں یا گمراہی کی طرف مائل ہیں۔ مومن کو ان سب باتوں کی آگاہی ہے اور مسلمانوں کے لئے خوشخبری تھی کہ مومن بن جاؤ تو ایسے مقامات حاصل کر لو گے کہ باطن کی باتیں بھی تمہیں نظر آنے لگیں گی اور اللہ تعالیٰ کے نور سے مشاہدے کرو گے۔ اب اللہ تعالیٰ سورۃ المائدہ کی آیت مبارکہ 15 میں فرماتا ہے کہ آئے تمہارے پاس نور اور

کتاب۔ یعنی رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور ذکر للعالمین یعنی قرآن پاک۔ یعنی مومن ہر چیز صاحب القرآن صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پاک کی وساطت سے دیکھتا ہے جس کو ہم سادہ زبان میں اس طرح بیان کریں گے کہ اس کا ہر عمل قرآن پاک کے اصولوں اور سنت النبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہے اور اس کی اپنی تو کوئی رائے نہیں ہوتی۔ پھر یہ اختلاف کہاں سے آ گئے؟ الگ الگ مسلکوں کا ذکر کیوں کیا جاتا ہے؟ الگ مکاتب فکر کیوں ہیں؟ (توبہ میرے اللہ) اس سلسلہ میں مزید گزارشات آگے آ رہی ہیں۔ اب ذرا ''اللہ تعالیٰ کے نور'' کی کچھ وضاحت ہو جائے۔ مسند عبدالرزاق میں دو صحابہ کرام جناب جابر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اور جناب سائب رضی اللہ عنہ بن یزید کے تخلیق کائنات کے بارے طویل بیانات یا قدسی احادیث ہیں۔ جس کا اختصار کچھ اس طرح ہے کہ کچھ نہیں تھا۔ نہ کوئی زمان نہ کوئی مکان تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات پاک تھی جو ایک چھپا ہوا یا باطنی خزانہ تھا یا طاقت تھی۔ لیکن نہ کچھ ظاہر تھا اور نہ کوئی مشاہدہ کرنے والا یا پہچاننے یا معرفت کرنے والا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک نے ارادہ فرمایا کہ میں پہچانا جاؤں۔ تو اپنی محبت کے اظہار کا عمل فرمایا۔ تو اس اظہار نے ایک مجسم نور کی شکل اختیار فرمائی اور قارئین، اسی کو ہم اب اللہ تعالیٰ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کے اسم مبارک سے جانتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خالق کی محبت کا اظہار ہیں۔

155۔ قارئین! مضمون بہت وسیع ہے۔ اللہ تعالیٰ از خود حسن ازل ہے یعنی آپ کے جمال کی ادنیٰ سی جھلک کو عظیم پیغمبر نہ برداشت کر سکے اور بے ہوش ہو کر گر گئے (سورۃ الاعراف آیت مبارکہ 143) تو سورۃ الکہف اور سورہ لقمان میں بیان شدہ اللہ تعالیٰ کی شان کے بیانات کے تحت یہاں عاجزی کرتے اللہ تعالیٰ کے جمال کے ساتھ جلال کی صفت کو جوڑتے عرض کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی اس محبت کے اظہار کے نور یا اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے نور میں بھی بے شمار جمال اور جلال نظر آیا۔ تو رب سبحانہ نے ایک آئینہ کی تخلیق فرمائی اور یہ آئینہ اس نور کے سامنے رکھا اور فرمایا ''اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنا جمال وجلال اس آئینہ میں دیکھ'' تو

اللہ تعالیٰ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے جب آئینہ دیکھا۔ تو حیا سے پسینہ پسینہ ہو گئے کہ اپنے خالق کے سامنے یہ عاجزی کا بھی اظہار تھا اور بشریٰ لبادہ میں معراج کے وقت دوبارہ اپنی اس عاجزی کو دہرایا تھا۔ حدیث مبارکہ میں ہے ''کہ عاجزی میرے لئے بوجہ اعزاز ہے۔'' تخلیق کائنات کا یہ پہلا مرحلہ تھا کہ رب سبحانہ نے اس کے بعد تمام تر تخلیق اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینے سے کی۔ یہ بہت وسیع مضمون ہے کہ پہلے قلم یا کمپیوٹر کی قسم کی کوئی چیز پیدا کی اور زمان ومکاں کو پیدا کر کے قلمبند کر دیا یا کمپیوٹر میں ڈال دیا۔ یاد رکھنے والی بات صرف یہ ہے کہ زمان ومکاں بھی چونکہ اللہ تعالیٰ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے تشکیل فرمائے تو یہ بھی ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہیں۔ معراج کے وقت حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت اور مادی جسم کو بھی اس نور کی طاقت کی وجہ سے زمان ومکاں پر حاوی کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۃ النجم کی آیت مبارکہ 17 کے مطابق دیدار الٰہی کے وقت نہ بصارت سے غلطی ہوئی نہ آنکھ جھپکی لیکن ایک اولوالعزم پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام تو معمولی تجلی بھی برداشت نہ کر سکے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی سدرۃ المنتہیٰ سے آگے وہاں نہیں جا سکتے جہاں لازمان ولامکاں رب عرش پر استویٰ ہے۔ وہاں تک صرف مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسائی ہے۔ افسوس مودودی اور اس جیسے خود ساختہ کم علم علماء پر کہ وہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر وناظر نہیں مانتے جو بڑی معمولی بات ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو زمان ومکاں پر بھی حاوی ہیں اور یہ کم علم علماء تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ''شاہد'' کے بھی منکر ہیں جو ذکر آگے آرہا ہے۔

156۔ تخلیق کائنات کے بے شمار مرحلات ہیں۔ لیکن ہم سورۃ الاعراف کو آیت مبارکہ 172 اور متعلقہ آیات کی مدد سے یہ جانتے ہیں کہ زمان ومکاں پر حاوی الاول والآخر رب نے تمام انسانی نفوس کو اپنے اجداد کی پشتوں سے نکال کر اپنے سامنے حاضر کیا اور انہیں کوئی ''وجود'' عطا فرمایا اور ان سے اپنی پہچان کرائی، جو بڑا ہی وسیع مضمون ہے۔ لیکن اس زمانے کے ہمارے مفسرین سمجھ ہی نہ سکے اور اس عاجز نے اسی مرحلہ سے اسلامی فلسفہ حیات کی بنیاد

شروع کی کہ اس کائنات کی تخلیق کا مقصد ''انسان'' ہے اور انسان کی تخلیق کا مقصد ''معرفت الٰہی'' ہے۔ انسانیت کی سب سے بڑی خدمت اس کو دوزخ کی آگ سے بچانا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ازل سے ابد تک سفر میں یہ دُنیا ایک پڑاؤ یا مسافر خانہ ہے۔ جہاں انسان مادی بدن کے ساتھ امتحان کیلئے وارد ہوتا ہے اور امتحان کے پرچے دینے کے بعد وفات کے ذریعہ کچھ عرصہ برزخ میں قیام کرتا ہے (سورۃ المومنون) اور پھر قیامت کے بعد انصاف کے دن حساب کتاب کے لئے حاضر ہونا ہے۔ اس لئے سورۃ البقرہ کی آیت مبارکہ 208 کے مطابق اس کو پوری طرح اسلام میں داخل ہو کر سورۃ المائدہ آیت مبارکہ 56 اور سورۃ المجادلہ آیت مبارکہ 22 کے مطابق حزب اللہ کے طور پر دنیا میں زندگی گزارنا چاہیے اور کسی تفرقہ کا شکار نہیں ہونا چاہیے اور نہ باطل نظریات کی پیروی کی جائے۔ سورہ آل عمران کی آیت مبارکہ 19 کے مطابق اللہ تعالیٰ کے دین کی مکمل طور پر پیروی کی جائے۔ اس سلسلہ میں یہ عاجز اپنی کتابوں میں کئی ابواب لکھ چکا ہے اور ایک خلاصہ لکھ کر مجید نظامی کو بھی بھیجا۔ جس نے اس کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ بہر حال اس مختصر کتاب میں یہ عاجز صرف چند پہلوؤں کی جھلکیاں دے گا کہ کون لوگ امت کے درمیان تفرقہ کے ذمہ دار ہیں اور کن لوگوں نے اپنی کم علمیوں کی وجہ سے یا ضد کی وجہ سے یا کسی سازش کی کڑی ہونے کی وجہ سے ہمیں گمراہی سے دوچار کیا۔ سورۃ الانعام کی آیت مبارکہ 159 میں فرمان الٰہی ہے ''اے میرے حبیب ﷺ جن لوگوں نے دین میں الگ الگ راہیں نکالیں اور کئی گروہ ہو گئے آپ ﷺ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔'' یہ عاجز پچاس سالوں سے یہی شور مچا رہا ہے کہ اے میرے مسلمان بھائیو! آؤ مل کر گروہ بندی اور فرقہ داری سے توبہ کریں اور اول و آخر مسلمان بن جائیں۔ یہ عاجز حضور پاک ﷺ کی سیرت پر کتاب ''جلال و جمال'' کے علاوہ خلفاء راشدین کے زمانے پر بھی چار جلدیں لکھ چکا ہے۔ جہاں ثابت کیا کہ خلفاء راشدین میں تو کوئی اختلاف نہ تھا۔ اس گروہ بندی کی ذمہ داری تو بنو امیہ والوں پر آتی ہے جن کی

خلافت کی چاہت امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں تفرقہ کا باعث بنی۔

157۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اصحابہ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ کوئی اختلاف نہ تھا۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں جب باغی قبائل مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے۔ تو باغیوں کو جس دستے نے مار بھگایا اس کی کمانڈ حضرت علی رضی اللہ عنہ کر رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب دو دفعہ ملک شام گئے تو خلافت کی نیابت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سونپ گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اکثر مقدمات کے قاضی ہوتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹوں کے نام اصحابہ ثلاثہ رضی اللہ عنہ کے ناموں پر ابوبکر، عمر اور عثمان رکھے اور بیٹے کا نام پیاری چیز پر رکھا جاتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت بنوامیہ اور امیر معاویہ کی ''ضرورت'' تھی۔ اور اس کے لئے انہوں نے ہر اوچھا ہتھیار اور طریقہ استعمال کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کا خاص ''ہدف'' تھے کہ ان کے خلاف ہر قسم کے الزام انہوں نے تیار کئے۔ پیراگراف نمبر 39 میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اصولی فیصلہ کہ اسلام کو احکام الٰہی اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تک محدود رکھا جائے۔ پہلے خلفاء کے اعمال اور روایات کو اسلام کا حصہ نہ بنایا جائے اس کے بنوامیہ والوں نے الٹے معنی نکالے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پہلے دو خلفاء راشدین کے ساتھ اختلاف تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت جس کے بنوامیہ والے خود ذمہ دار تھے اس کا سارا ''بوجھ'' انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ڈال دیا۔ مروان نے سازش اور غلط بیانی کرا کے عظیم صحابہ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کرایا۔ تینوں صاحبان نے اپنی اس اجتہادی غلطی کو تسلیم کیا۔ لیکن اصل سازش یہ تھی کہ امیر معاویہ کے لئے راہ نکالی جا رہی تھی اور اس نے بھی ایسا ''خروج'' کیا۔ جس کے لئے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو باغی شہید کریں گے۔ امیر معاویہ کی بغاوت پر مہر لگا دیتی ہے۔ امیر معاویہ نے جناب محمد رضی اللہ عنہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زندہ گدھے کی کھال میں سلوا دیا اور اس امت کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا۔ اپنے فاسق اور فاجر بیٹے یزید کو امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم

کا حاکم بنا گیا، اور نتیجتاً سانحہ کربلا ہوا۔ توبہ میرے اللہ۔ تو کچھ لوگ ''جذباتی'' ہو گئے تو انہوں نے ایک گروہ بنالیا جو ''شیعان علی رضی اللہ عنہ'' کہلاتے تھے۔ امیر معاویہ نے ان میں اپنے ایجنٹ بھیج دیئے۔ جنہوں نے خوب پروپیگنڈا کیا کہ امیر معاویہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہرگز انصاف نہ کیا تھا۔ جب سادہ لوگ ان ایجنٹوں کے ''گرویدہ'' ہو گئے تو انہوں نے مزید شوشہ چھوڑا کہ اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ انصاف نہ کیا تھا۔ تو ان سادہ لوگوں نے اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو اٹھا کر امیر معاویہ کے ساتھ لا کھڑا کیا۔ تو اس طرح مسلمانوں کے اندر شیعہ گروہ ''وجود'' میں آ گیا۔ ادھر امیر معاویہ نے امام حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح والے سال کو (سنۃ الجماعت) قرار دے کر جو ایک مصلحتی گروہ تیار کیا، جو ہر حکومت کا ساتھ دیتے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ اہل سنت و جماعت بن گئے تو اسلام میں ایک اور گروہ پیدا ہو گیا۔

158۔ جہاں تک امامت کے فلسفہ کا تعلق ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بلکہ امام باقر رضی اللہ عنہ کے زمانے تک کسی نے ایسی امامت کا پرچار نہ کیا۔ صرف کچھ لوگوں نے امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی جانشینی کی بجائے اسمٰعیل کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جانشین قرار دے دیا۔ کچھ لوگوں نے امام باقر رضی اللہ عنہ کی جگہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو جناب زین العابدین رضی اللہ عنہ کا جانشین قرار دیا۔ کوئی ہشت امامیہ بن گئے اور حاضر امام کے قائل ہیں۔ کچھ اثنا عشریہ (بارہ اماموں) والے بن گئے اور اس کے بعد ''امام غائب'' کے قائل ہیں۔ یہ تمام تر ''جانشینیوں'' کے جھگڑے تھے کہ اہل تشیع از خود بے حساب گروہوں میں بٹ گئے اور امام کون ہے اور کیسا ہو گا یا کیا سورہ بنی اسرائیل کی آیت مبارکہ 71 کے مطابق روز قیامت جو ہر گروہ اپنے امام کی سربراہی میں بعثت کرے گا۔ اہل تشیع اپنے ان اماموں کے تحت بعثت کریں گے یا اماموں کے امام حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سربراہی میں بعثت کریں گے اہل تشیع کے الگ الگ جوابات ہیں۔ اہل سنت میں البتہ اکثر لوگ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کے تحت ہونے کو اپنا عقیدہ سمجھتے ہیں۔ یہی اس عاجز کا

ایمان ہے۔ جہاں تک فقہی گروہ بندی کا تعلق ہے یہ کچھ میری سمجھ سے باہر ہے کہ جن اماموں کے ساتھ کچھ لوگ اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں ان اماموں کی وفات کے سو سال بعد یہ گروہ بندی ''وجود'' میں آئی۔ خلیفہ منصور عباسی کے زمانے میں جو فقہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے مدون کی۔ اس کا نام انہوں نے اپنے استاد امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے ''فقہ حنفیہ'' رکھ لیا کہ ابو حنفیہ آپ کی کنیت تھی۔ عباسیوں کے زمانے میں عجمی لوگ زیادہ حکومت کے کرتا دھرتا تھے اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ بھی عجمی تھے تو اسلامی دنیا میں سو سال تک یہی فقہ حنفیہ چلتی رہی۔ جب عباسی سلطنت کچھ کمزور ہوئی تو کسی عرب تعصب والے نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جو عرب النسل تھے انہوں نے جو مختصر فقہ لکھی تھی، ان کے نام سے ''مالکی'' فقہ کا اجرا کیا لیکن یہ بہت نامکمل فقہ تھی۔ تو ان کے شاگرد امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جو عرب النسل تھے، ان کے فتاویٰ سے ''شافعی فقہ'' کا اجرا کیا۔ لیکن بات پھر بھی نہ بنی کہ یہ فقہ بھی نامکمل تھی۔ تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد امام حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے بھی شاگرد تھے ان کے کام سے ''حنبلی فقہ'' کا اجرا کیا۔ ''فقہ جعفریہ'' کے تو الفاظ بھی عام نہ تھے زیادہ تر یہ الفاظ پاکستان بننے کے بعد سننے میں آئے۔ امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ، جن کے نام سے یہ فقہ منسوب کی جاتی ہے وہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے استاد تھے اور ان کے پوتے امام رضا رحمۃ اللہ علیہ کے بارے تاریخی ثبوت موجود ہیں کہ وہ فقہ حنفی کے پیروکار تھے۔

159۔ قارئین! آپ حیران نہ ہونا، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کچھ دن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی کی اور ''مدون'' صرف ''فقہ حنفیہ'' ہی ہوئی۔ کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں نے کچھ معاملات میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہاد سے بھی اختلاف کیا ہے اور ایسا کچھ اپنے استاد کی اجازت سے کیا۔ یہ اختلافات اتنے معمولی ہیں، جتنے کسی مقدمہ میں دو جج الگ الگ ''آرا'' کا اظہار کریں۔ بھلا استادوں اور شاگردوں میں ایسے اختلافات کیسے ہو سکتے ہیں، جو ہمارے عقائد پر اثر انداز ہوں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی فقہی گروہ بندی کے بغیر

کام چلتا رہا۔ لیکن یہ عاجز اپنے آپ کو ''غیر مقلد'' نہ قرار دے گا۔ میں سب اماموں کا غلام ہوں اوران سب کے جائزوں کو پڑھ کر مجھ پر اسلام کی وسعت بہتر طور پر عیاں ہوتی ہے۔ نہ میں مودودی کی طرح ایسے بے ادبانہ الفاظ استعمال کروں گا کہ وہ کسی ''حنفیت'' یا ''شافعیت'' کا پابند نہیں ہوسکتا۔ (توبہ میرے اللہ) یعنی مودودی از خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بڑا امام تھا۔ یہ عاجز اسلامی شعائر حنفیہ فقہ کے مطابق ادا کرتا ہے، لیکن باقی اماموں کا بھی غلام ہے اوران کے فتاویٰ بھی میری روح کی غذا ہیں۔ آؤمل کر یہ فقہی گروہ بندی بھی ختم کریں اور اول وآخر مسلمان اور مومن بن جائیں۔ تو اصل بات تو یہ ہے کہ بنوامیہ۔ نے حکومت پر براجمان رہنے کے لئے کئی بناوٹی احادیث ''گھڑیں'' کچھ کے الفاظ یا مفہوم تبدیل کیے۔ ابن الوقت لوگوں یا مطلب پرستوں نے بھی احادیث گھڑ کر اپنے مطلب نکالے، کچھ قصہ گوؤں نے احادیث مبارکہ میں افسانوی رنگ پیدا کیا اور کئی لوگوں نے ''مبالغوں'' کے بیانات کو اپنا ''پیشہ'' بنالیا۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ یا دیگر اماموں نے لاکھوں احادیث کو رد کردیا اور اپنی کتابوں کا ''حصہ'' نہ بنایا۔ لیکن یہ چھان وبین بھی مکمل نہ تھی۔ مسلم وبخاری دونوں میں کئی احادیث مبارکہ ہیں جو قرآن پاک کے بیانات سے مطابقت نہیں رکھتیں اوران کو صحیح نہیں کہا جاسکتا۔ یہ عاجز اس سلسلہ میں اپنی تفسیر میں کئی مثالیں دے چکا ہے اور ایک چھوٹی سی کتاب بھی لکھ چکا ہے۔ مثلاً یہ حدیث کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ماں کی قبر پر حاضری کی اجازت مل گئی لیکن بخشش مانگنے کی اجازت نہ ملی۔ (توبہ میرے اللہ) قرآن پاک کی سورہ ابراہیم کی آیت مبارکہ 41 میں ہم سب ہرروز اپنے ماں وباپ کی بخشش مانگتے تھے۔ علاوہ ازیں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ماں باپ واجداد دین ابراہیمی علیہ السلام کے پیروکار تھے۔ بتوں کی پرستش نہ کرتے تھے۔ ان کو دوسرے لوگوں کے زمرہ میں کیوں ڈالا جائے۔ اس سلسلہ میں امیر معاویہ نے جوشوشہ چھوڑا کہ وہ خلافت کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کا باپ ابوسفیان مسلمان ہوگیا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد حضرت

ابو طالب رضی اللہ عنہ مسلمان نہ تھے۔ ایسے شوشوں نے امت کو تفرقوں سے دوچار کر دیا۔ آؤ ان فضول باتوں سے توبہ کریں۔

160۔ احادیث مبارکہ اور تاریخ کے معاملات بڑے وسیع جائزوں کو دعوت دے رہے ہیں۔ جس سلسلہ میں اس عاجز نے قرآن پاک کی اپنی تفسیر میں بہت کچھ لکھا۔ جس کے چند فقرے یہاں بھی دہرائے جا رہے ہیں۔ اسلام کی پہلی صدی میں تقریباً چالیس کتابیں لکھی گئیں اور وہ سب مغازی کہلاتی تھیں۔ جہاد مسلمانوں کے لئے طرز زندگی ہے، مسلمان کی زندگی میں اس کو جہاد کے تقاضوں سے گزرنا پڑتا ہے اور ان پہلوؤں کو ترجیح ہے۔ ایک آدھ کتاب کو چھوڑ کر یہ سب کتابیں ناپید ہیں۔ لیکن ان کے حوالے امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کی مغازیوں یا سیرت کی کتابوں سے مل جاتے ہین۔ ان میں سے خاص کر امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ یا محمد بن صالح کی کتابوں یا موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ یا مسند عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ یا مغازی ابن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ میں بہت حوالے ہیں۔ بہر حال دوسری اور تیسری صدی ہجری کے بعد جب ہم نے فکری طور پر ''امن پسندی'' کو کچھ زیادہ ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنانا شروع کر دیا۔ تو ہجرت سے تقریباً دو سو سال بعد لکھی ہوئی درمیانہ درجہ کی چھ کتابیں، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور ابوداؤد، ہمارے درسوں کے سلیبس کے طور پر ''صحاح ستہ'' بن گئیں۔ ان سے بہتر کتابیں یعنی موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ یا مسند امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ یا معازی ابن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ یا مسند عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ یا محمد بن صالح رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگرد واقدی رحمۃ اللہ علیہ کی مغازی یا واقدی کے شاگرد کے طبقات ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ، نہ صرف ثانوی حیثیت حاصل کر گئیں۔ بلکہ ''صحاح ستہ'' کی کتابوں کو جو تقدس دیا گیا۔ ان اہم کتابوں کی حیثیت صحاح ستہ کی کتابوں کے عشر عشیر بھی نہ رہی۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے استاد امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بھی استاد تھے۔ لیکن احادیث مبارکہ زیادہ نہیں تو درس والوں نے اس کی ''اہمیت'' بھی ختم کر دی۔ یہی المیہ مسند عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہوا کہ وہ بھی کچھ عرصہ امام

شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد رہے۔ لیکن احادیث تھوڑی تھیں۔ مشکل اور پیچیدہ مضامین جن کا تعلق تخلیق کائنات سے تھا۔ وہ عام ''مولویوں'' کو سمجھ نہ آئیں۔ جناب امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر تھے لیکن انہوں نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت بہتر اسلام کی خدمت کی اور بڑی قربانی دی۔ لیکن چونکہ ان کا مسند حجم میں بخاری اور مسلم سے چار گنا تھا۔ تو ''مولوی'' اتنی بڑی کتاب میں ''غوطہ زن'' نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن مورخین ابن اسحٰق وغیرہ کی مغازیوں کو تو ہرگز وہ مقام نہ دیا گیا، جو ان کا حق تھا۔ انہوں نے ''چلتا پھرتا'' اسلام لکھا، ان کے بیانات میں غلطیوں کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے، یہ جاری و رواں یعنی Continuoty والے بیانات تھے۔ تو ہمارے مفتی اور فقیہہ صرف صحاح ستہ تک ''محدود'' ہو گئے اور انہوں نے اسلام کو بھی دین یا مذہب کے طور پر ''محدود'' کر دیا یا مسجدوں اور درسوں میں ''محبوس'' کر دیا اور دنیا، بے دین لوگوں کے حوالے کر دی۔ آج دنیاوی تعلیمی ادارے الگ ہیں اور دینی درسگاہیں الگ طور پر ''محدود اسلامی'' شعائر کو اپنا اوڑھنا، بچھونا بنائے ہوئے ہیں۔

161۔ ایک اور بڑا المیہ ان احادیث مبارکہ میں ''تحریفوں'' کا تھا۔ مفہوم تبدیل کر دیا یا چونکہ احادیث کا تاریخی پہلو ساتھ نہ تھا تو بعض بیانات مہمل یا ادھورے تھے۔ حتیٰ کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو بھی صرف دینی علوم تک محدود کر دیا اور غلط بیانیوں سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے مسلم میں ایسی احادیث ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیاوی علوم پر عبور نہ رکھتے تھے۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کے اثرات ہونے والی بات کو بھی صحیح تسلیم کر لیا کہ نبوت کے معاملات پر اثرات نہ ہوئے۔ لیکن روزمرہ کے بشری کاموں پر جادو کے اثرات ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر برتری دے دی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھایا کہ ان کی امت پچاس نمازیں نہ پڑھ سکے گی۔ (توبہ میرے اللہ)۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ایسا حکم دے دیا، جس پر عمل نہ ہو سکے گا کہ ہر پندرہ منٹ بعد اذان ہو رہی ہوگی۔ کھانا کب کھائیں گے اپنا

کام و کاج کب کریں گے۔ اور ایسی مبالغہ والی احادیث صحاح ستہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ہماری یہی کم علمیاں، ہمیں لے ڈوبیں کہ کم علم ''مولویوں'' کی باتوں پر یقین کرتے رہے، جو مومن کی فراست سے عاری تھے اور تفرقوں کا شکار ہو گئے۔ لیکن اس زمانے میں تو ہمارے پاس سارے ذرائع موجود ہیں کہ چھان بین کر کے ان تفرقوں کو دور کر کے اول بھی مسلمان اور آخر بھی مسلمان بن جائیں اور یہی آہ وزاری یہ عاجز چالیس سالوں سے کر رہا ہے۔ لیکن ''مولوی'' لکیر کا فقیر بنا ہوا ہے۔

162۔ ایسا ہی تفرقہ خلفاء راشدین کے زمانے میں آزادفکر خارجیوں نے ڈالا، جو مجید نظامی کی طرح فراست کے حامل تو تھے، لیکن مومن کی فراست کے حامل نہ تھے۔ خیر عبداللہ بن سبا کی سازش کے بھی اثرات تھے کہ یہ آزادفکر لوگ کہنے لگے، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور احکام ہمارے پاس آ گئے ہیں اور ہم ان پر عمل کریں گے۔ ہم کسی کو اپنا امیر نہیں مانتے۔ شاید Stateless State کے نظریہ کا دنیا میں یہ پہلا پرچار تھا۔ حضور پاک ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس فتنہ سے آگاہ کر گئے تھے۔ کہ گو اس نظریہ میں کچھ ''اپیل'' تھی لیکن زیادہ اثرات نہ ہوئے کہ گروہ بنتے وقت ان کو کسی کو امیر بنانا پڑتا تھا، اب امیر بنانے کے بعد اس کا حکم نہ مانتے تھے۔ بہر حال یہ لوگ مکمل طور پر ختم نہ ہوئے کہ چند سال بعد جناب حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے دو آزادفکر شاگردوں واصل اور عطار نے اس تحریک کو فکری طور پر اور بڑھایا اور دانش برہانی کو سب کچھ سمجھ کر ہر معاملہ کو ''عقل'' کے تابع کرتے تھے۔ یہی لوگ بعد میں معتزلہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ یعنی امت کے علماء نے ان کو ''گر جانے والوں'' کا نام دیا اور خارجیوں کے لئے پہلے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ اسلام سے اس طرح ''خارج'' ہوئے۔ جس طرح تیر کمان سے الگ ہو جاتا ہے۔ ان آزادفکر لوگوں نے امت کو بہت زیادہ تفرقوں سے دوچار کیا۔ گو گروہ کے طور پر یہ لوگ بھرپور طور پر کبھی زیادہ طاقت سے سامنے نہ آئے۔ لیکن فکری طور پر ان معتزلہ گروہوں نے ہماری وحدت کو بہت نقصان پہنچایا۔ گو ظاہراً یہ گروہ ختم ہو گئے ہیں لیکن

ہمارے ہاں جو سر سید یا مودودی کے استاد نیاز فتح پوری جیسے لوگ جو ''نیچریہ'' نظریات کے پیروکار بن گئے۔ ان پر انہی معتزلہ کی سوچوں کے اثرات ہیں اور مودودی از خود کی اکثر تحریریں معتزلہ کی سوچوں کے متشابہ ہیں۔ ان معتزلہ نے ''قضا وقدر'' کے معاملات پر بہت بحث کی اور خود اس سلسلہ میں کئی گروہوں میں بٹ گئے۔ کچھ کو ''قدریہ'' کہا جاتا ہے کہ سب اعمال اور اس کے نتائج آدمی کی اپنی کوشش سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی منشا کو بھول گئے تو ایک اور گروہ آگے آیا کہ نہیں سب کچھ اللہ تعالیٰ کرتا ہے، انسان کا کوئی اختیار نہیں، وہ ''معصوم'' ہے۔ ان کو ''جہنیہ'' کہتے تھے اور میں ان کو ''جبریہ'' کہتا ہوں۔ انہیں نے سب اچھائی اور برائی اللہ تعالیٰ پر ڈال دی۔ (توبہ میرے اللہ) دونوں گروہوں نے سورۃ النساء کی آیت مبارکہ 79 کی طرف دھیان نہ دیا کہ سب اچھائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور برائی کے ہم ذمہ دار ہوتے ہیں اور نہ حضور پاک ﷺ کی اس سلسلہ میں بڑی وضاحتی حدیث مبارکہ کی طرف دھیان دیا کہ اے مسلمانوں! ''مواقع تقدیر'' میں اپنے لئے بہتر راستہ کو اپناؤ۔ یہ سب کچھ بیان کرنے میں میرے سامنے مقصد یہ ہے کہ ہر سوال کا جواب قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں موجود ہے۔ ہمارے تمام تر اختلافات ہماری کم علمیوں کی وجہ سے ہیں۔

163۔ معتزلہ اور ان کے بے مقصد بحث ومباحثہ اور گروہوں کی وضاحت بہت لمبی ہے اور ان میں سینکڑوں گروہ بن گئے۔ جس میں یہ عاجز صرف ایک ''باطنیہ'' گروہ کا ذکر کرے گا کہ وہ لوگ ہر پہلو کا ایک ''باطن'' بھی پیش کرتے تھے اور اس طرح اپنی مرضی کو باطنی ضرورت قرار دے کر وہ اسلام کی شرعی حدود کو پاش پاش کر دیتے تھے۔ اہل تشیع میں حسن بن صباح کا گروہ بھی ایسے ہی کچھ عقائد کا قائل تھا۔ ان لوگوں نے بھی اسلام کا بڑا نقصان کیا کہ حقائق کو افسانے بناتے رہے بے شک ہر ظاہر کا ایک ''باطن'' بھی ہے۔ ایمان از خود ایک باطنی عمل ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان بالغیب لاتے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں دانش نورانی کے ذریعہ سے اپنے

نفس کو پہچانا جاتا ہے کہ ہم کتنے عاجز ہیں اور ہمارا خالق کوئی عظیم ہستی ہے۔ جو یہ سب کارخانہ قدرت کو چلا رہا ہے۔ تو بات پھر بھی مومن کی فراست کی ضرورت پر آ کر ختم ہوتی ہے۔ بہر حال معتزلہ کی بڑی سازش البتہ قرآن پاک کو ''مخلوق'' قرار دینے میں تھی۔ اور اس میں مقصد یہ تھا کہ چونکہ سورۃ القصص کی آیت مبارکہ 88 کے مطابق سب کچھ ہلاک ہو جائے گا۔ تو قرآن پاک بھی ختم ہو جائے گا اور یہ بھی پہلی آسمانی کتابوں کی طرح ابدی نہیں۔ اس سے آگے مطلب یہ تھا کہ چونکہ قرآن پاک یعنی ذکر للعالمین ابدی نہیں تو ہمارے آقا رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابدی نہیں۔ (توبہ میرے اللہ)۔ بہر حال خدا بھلا کرے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بن حنبل کا کہ خلیفہ مامون اور معتصم کی سزاؤں کی پرواہ نہ کرتے انہوں نے اس سازش کو پروان نہ چڑھنے دیا۔ قارئین اسلام کے خلاف دو بہت بڑی سازشوں میں سے یہ ایک سازش بہت بڑی ہے کہ ''وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا، روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بدن سے نکال دو۔'' قارئین! یہ عاجز اس سازش پر بہت کچھ لکھ چکا ہے کہ غیروں کی اس سازش پر آگے میں بہت کچھ لکھ رہا ہوں کہ ہمارے ہاں مودودی کی قسم کے بے ادب لوگ بھی اس سازش کی ''کڑی'' بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بودے بشری پیمانوں سے ''ناپتے تولتے'' رہتے ہیں۔ بہر حال معتزلہ اور اس وقت کے حاکموں کو جناب احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے جب اپنی دانش نورانی سے لاجواب کر دیا کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا امر ہے اس کو ''مخلوق'' یا ''غیر مخلوق'' جیسے پیمانوں سے تولنے سے گریز کیا جائے تو معتزلہ کہنے لگے کہ اگر قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی کلام ہے۔ تو کیا اللہ تعالیٰ کی زبان ہے؟ اور اگر زبان ہے تو شکل کیسی ہے۔ تو آگے سے کچھ لوگوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کی شکل وصورت، انسان کی طرح ہے کہ قرآن پاک میں جو اللہ تعالیٰ نے انسانی اعضا کو اپنے ساتھ وابستہ کیا۔ تو جواب دینے والوں نے اپنی سوچ کو ان حوالوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن قارئین یہ فضول بحثیں تھیں اور لاحاصل مشقیں اور وقت کا ضیاع تھا۔ اب تو زبان کے علاوہ

اور جگہوں سے آوازیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو کسی شکل وصورت میں ''محدود'' کرنا بڑی غلطی تھی یا غلطی ہو گئی۔ وہ ''لامحدود'' رہتے اپنے آپ کو ''محدود'' بھی کر سکتا ہے۔ اور اپنے کمال میں مثیل اور بدیل اور شبیہ اور نظیر اور حد اور قد اور حصر اور شمار اور جوڑ اور فرد اور مواصلت، مفاصلت اور مماثلت اور مشاکلت اور مجانست اور ملاسمت وغیرہ سے پاک ہے۔ لیکن عقلی گھوڑے دوڑانے والے اپنی ''افلاطونیوں'' سے باز نہیں آتے۔ انہوں نے رخ دوسری طرف پھیرا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے صرف مفہوم واضح کیا اور قرآن پاک کے الفاظ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بنائے؟ (توبہ میرے اللہ) ہم تو اپنی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ چونکہ سورۃ الحجر کی آیت مبارکہ 9 کے مطابق اللہ تعالیٰ خود قرآن پاک کا نگہبان ہے اور اس میں ایک حرف کا اضافہ یا کمی نہیں ہو سکتی (سورہ الکہف 27 اور سورۃ حم السجدہ 42) کہ اللہ تعالیٰ نے حرف بھی گن کر قرآن پاک کو تشکیل فرمایا۔ اور ایسے حقائق عاجزی کرنے والوں پر وارد ہوتے ہیں کہ وہ دانش نورانی کے حامل ہو جاتے ہیں۔

164۔ بہر حال غیروں کی سازشوں سے یا اپنی شیطانی آزاد قسم کی فکروں کی وجہ سے تفرقہ کا عمل جاری رہا اور باطل بیرونی اور اندرونی دونوں مقامات سے حق کا مقابلہ کرتا رہا یا حق پر حملہ آور ہوتا رہا۔ اور ہمارے اندر سے تفرقہ والوں نے جب ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کیا تو ایک طرف صلیبیوں نے یلغار کر کے کچھ عرصہ کے لئے ارض پاک پر بھی قبضہ کر لیا۔ وہاں نورالدین زنگی، صلاح الدین ایوبی، بیبرس اور کالوں جیسے مجاہدوں نے اسلام اور مسلمانوں کی عزت کو بحال کر دیا۔ تو مزید تفرقہ سے سقوط بغداد جیسے عبرتناک انجام سے بھی ہم دوچار ہوئے۔ لیکن پھر بھی سنبھل گئے کہ مغرب میں ترکوں نے اور مشرق میں مغلوں نے اسلام کے جھنڈے بلند رکھے۔ لیکن سترھویں صدی عیسویں سے ہمارے علماء لمبی تان کر سو گئے۔ درس نظامیہ بارھویں صدی سے شروع ہو چکا تھا۔ جو ایک اچھا عمل تھا۔ لیکن جو سلیبس پہلے مقرر کیا تھا۔ آج تک وہی چل رہا ہے۔ حالانکہ زمانے کی ترقیوں اور نئی دریافتوں کی وجہ سے اس پر

کم از کم ہر سال نظر ثانی ضروری تھی۔ ادھر فقراء کی تعداد میں کمی ہونی شروع ہوگئی کہ بغیر محنت کے "جانشینی" یا "سجادہ نشینی" والا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ پیری فقیری ایک "پیشہ" بن گیا۔ تو اسلامی علوم کے چشمے اٹھارویں صدی سے "خشک" ہونے شروع ہو گئے۔ غیروں اور خاص کر انگریزوں اور باقی یورپین طاقتوں نے ہمارے اندر سے روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم نکالنے کے علاوہ، ایک اور سازش شروع کر دی کہ "تعلیم اس کو چاہیے ترک جہاد کی، دنیا کو جس کے پنجہ خونیں سے ہو خطر" اور ادھر باطل کے فال وفر سے یورپ "زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر" انگریزوں نے اپنے ایجنٹ ہمارے معاشرہ میں "گھسیڑ" دیئے۔ کہیں لارڈ ہمفرے ابن الوہاب کی "برین واشنگ" کر رہا تھا۔ تو کہیں "مستشرقین" ہمارے اندر گھس کر اور میٹھی چھری بن کر ہمارے باطن کو لہولہان کر رہے تھے۔ سر تھامس رو کے جانشین اس برصغیر میں شاہ ولی اللہ کے گھرانے میں "گھسے" ہوئے تھے کہ ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز سے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دلوائی جارہی تھی اور ان کے پوتے اسمٰعیل دہلوی کو تو ممبئی کے راستے کی بجائے کلکتہ (کولکتہ) والے راستے ایک لگژری جہاز کے ذریعہ سے حج کرایا۔ وہاں نجد میں اس کی ابن الوہاب کے جانشینوں سے ملاقات کرائی برصغیر واپس پہنچ کر اس سے ابن الوہاب کے نظریات کی "کاربن کاپی" کو اردو میں ڈھال کر جو کچھ بے ادبی کی باتیں لکھوائیں اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو ٹھیس پہنچائی گئی ہمارا قلم وہ الفاظ نہیں دہرا سکتا۔ حتیٰ کہ اسی اسمٰعیل سے فتویٰ دلایا گیا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد حرام ہے۔ البتہ سکھوں کے خلاف محدود جہاد کیا جا سکتا ہے جو ذکر پہلے کیا جا چکا ہے کہ ہمارے اندر سے اپنے ایجنٹوں سے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کروائے۔

165۔ پھر اس برصغیر میں سر سید اور غلام کذاب جیسے لوگ پیدا کیے گئے جنہوں نے نہ صرف اسمٰعیل دہلوی کے انگریزوں کے خلاف جہاد حرام ہونے کے فتوے پر اپنا انگوٹھا لگا دیا۔ بلکہ 1857ء کی جنگ آزادی کے شرکاء کے خلاف بھی فتوے جاری کیے کہ وہ امن پسند حکومت کے

''غدار'' تھے۔ یہ عاجز سپریم کورٹ میں 1993 میں قادیانی کے مقدمہ کی پیشگی کے دوران یہ بھی ثابت کرتا رہا کہ سرسید اور غلام کذاب دونوں کو کسی ایک جگہ سے ایک جیسی ہدایات ملتی تھیں۔ اور ان کی تحریروں سے متعدد ''مماثلتی'' بیانات کے حوالے پیش کئے تھے تو ماحول پر سناٹا چھا گیا تھا۔ اور اخباروں نے بھی ان بیانات کو پذیرائی دی کہ سرسید نیچری عقائد رکھتا تھا۔ اس نے اسلام کا غلام کذاب کی نسبت زیادہ نقصان کیا۔ اور اس کے ''پیروکار'' ہمارے اندر گھسے ہوئے ہیں۔ اور ہم اس کے نام پر علمی اداروں کے نام رکھ دیتے ہیں۔ اس زنگ آلود علم یعنی لارڈ میکالے کی طرز تعلیم سے تو ''بے علمی'' اچھی تھی کہ علامہ اقبال نے افغانوں کے بارے کہا تھا'' کہ تیری بے علمی نے تیری لاج رکھ لی، پڑھے لکھے بیچ رہے ہیں ایمان'' تو غیروں یا چھپے ہاتھوں کی سازش کے اثرات یا کون کون اس سازش کی ''کڑیاں'' ہیں۔ بہت ساری کتابوں کا مضمون ہے۔ کمال ترکی کا ذکر پہلے کر چکے ہیں۔ رضا شاہ پہلوی کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ اور عرب دنیا میں لارنس نے ''اودھم'' مچائے رکھا۔ شریف حسین مکی کی ترکوں کے خلاف بغاوت یا اس کی اولاد کا اہل مغرب کا ''پروردہ'' ہونا بہت بڑے مضامین ہیں۔ کہ عرب ازم بھی اہل مغرب کی ضرورت ہے۔ اس لئے خواہ مصر کا جمال عبدالنصر ہو یا تیونس کا لبرل حبیب بارقوبہ یا یاسر عرفات یا مائیکل افلاک کی ''بعث'' پارٹی یہ سب باطل اور اسلام دشمن طاقتوں کی پیداوار ہیں۔ اس کا ثبوت ان لوگوں کے اعمال کے ''نتائج'' ہیں کہ تمام مسلمان حکومتیں بقول حسین شہید سہروردی مرحوم صفر بٹا صفر ہیں۔ قارئین انیسویں صدی اسلام کے لئے ذلت کی صدی تھی اور اسلام کے چشمے ایسے خشک ہوئے کہ پوری اسلامی دنیا میں جمال الدین افغانی کے بغیر اس صدی میں ایک آدمی نظر نہیں آتا۔ جو اسلام کے امت واحدہ ہونے کے تصور کو سمجھتا تھا۔

166۔ اسلام کی تعلیم دینے والا کوئی درس تو اس پورے برصغیر میں نظر نہیں آتا تھا۔ کہ انیسویں صدی کے آخر میں پیر مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے بزرگوں نے ان کو اسلامی تعلیم دلانی چاہی تو اپنے گاؤں

سے ڈیڑھ سو میل دور وادی سون سکیسر کے گاؤں انگہ میں ایک فرد سلطان محمود صاحب نظر آئے۔ اسلامی درس تو وہاں کی اعوان قاری میں بھی ختم ہو گئے تھے، جن کو محمود غزنوی نے وہاں پر ایک فوجی ضرورت اور اسلامی علوم پھیلانے کے لئے آباد کیا تھا۔ یہ اعوان قاری آگے اس زمانے کے ضلع جہلم کے ٹلہ جوگیاں تک اور سارے اٹک میں پھیل گئے تھے اور ان کے جتھے آگے ضلع ہزارہ اور موجودہ آزاد کشمیر تک چلے گئے۔ بلکہ کچھ لوگ ضلع سیالکوٹ اور ضلع جالندھر تک پھیل گئے۔ اور اورنگزیب عالمگیر کے زمانے تک ان لوگوں کے قرآنی علوم کے ساتھ وابستگی کی یہ حالت تھی کہ جب بادشاہ تلہ گنگ کے جنوب میں ایک گاؤں کھچیاں کے قریب سے گزرا تو پانی بھرنے والی عورتوں کو پانی بھر کر واپس اکٹھا گھر جاتے قرآن پاک کی قرات کرتے سنا۔ اور ہر گاؤں میں بے شمار لوگ حافظِ قرآن ہوتے تھے کہ اورنگزیب کچھ حفاظ کو اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔ بہر حال اورنگزیب نے تمام تر تعلیم کو قرآن پاک کے علوم کے تابع کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن حالات تبدیل ہو چکے تھے اورنگزیب کا زیادہ وقت بھی بغاوتیں فرو کرنے اور دکن کی مہمات کی نظر ہو گیا۔ اور اس کے جانشین نکمے ثابت ہوئے کہ اگلے ڈیڑھ سو سال کی چار پانچ پشتوں میں ایک بھی مردِ مجاہد نظر نہ آیا کہ کوئی محمد شاہ رنگیلہ تھا تو کوئی اس شعر کا مفہوم بن گیا۔ ''بادشاہیِ شاہ عالم، از دلی تا پالم'' کہ غیروں کے ایجنٹ حکومت کے ادارے اور معاشرے میں گھسے ہوئے تھے۔ پورے کا پورا برصغیر ہندو پاکستان سو سال کے لئے انگریزوں کی غلامی میں چلا گیا لیکن بات اسلامی علمی اداروں کی ہو رہی تھی، وہ تو ختم تھے۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں دیو بند اور ندوہ کے علمی ادارے سامنے آئے۔ جنہوں نے درس نظامی کے پرانے سلیبس کے سلسلہ میں مکھی پر مکھی مارنا شروع کر دی۔ جہاد صرف عملی طور پر ختم نہ ہوا بالکل علمی اور فکری لحاظ سے بھی ختم ہو گیا کہ دیو بند والوں کا ہیرو اسمٰعیل دہلوی تھا جس نے جہاد کو صرف سکھوں کے خلاف قتال تک محدود کر دیا۔ حالانکہ قتال، جہاد کا ایک معمولی حصہ یا جہاد بالسیف کا ایک طریقہ ہے خود نظریہ جہاد

اور اس کے تقاضے بڑے وسیع مضامین ہیں کہ جہاد طرز زندگی ہے۔ ندوہ کے علامہ شبلی نے جہاد کو اپنی سیرۃ النبی ﷺ کی کتاب میں بظاہر ایک ''ظالمانہ'' عمل قرار دے دیا۔ ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی ﷺ پر سات یا آٹھ کتابیں لکھیں۔ لیکن نظریہ جہاد کی وضاحت کو صرف چار صفحات میں ''ٹرخا'' دیا۔ اور مودودی کی کتاب ''جہاد فی الاسلام'' اسلام کے ساتھ ایک بہت بڑا ''مذاق'' ہے کہ ''مصلحانہ'' اور ''مدافعانہ'' دفاع جیسی بے جان اصطلاحیں استعمال کر کے تلوار کے ساتھ نفرت پیدا کی۔

167۔ اب مودودی کا ذکر آ گیا ہے تو بہتر ہے اس کی علمیت کا بھانڈا جو یہ عاجز چند کتابوں کے ذریعہ سے چوراہے میں پھوڑ چکا ہے اس کی کچھ جھلکیاں ادھر ہی دے دی جائیں۔ اول 1948ء میں مودودی نے 48-1947ء کے جہاد کشمیر کے سلسلہ میں پاکستان کے مسلمانوں کو تین گروہوں، یعنی قبائلی، کشمیری اور پاکستانی میں بانٹ کر سورہ الانعام کی آیت مبارکہ 159 کو رد کر دیا، یا اس کی خلاف ورزی کی۔ پھر جہاد اللہ تعالیٰ کے راستے میں لڑا جاتا ہے۔ خطے یا قبیلہ کے لئے لڑنے والے کو جنگ احد کے موقع پر حضور پاک ﷺ نے جہنمی قرار دیا۔ لیکن مودودی کشمیری مسلمانوں کے جہاد کو اس لئے جائز قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے خطہ کے لئے لڑ رہے تھے۔ اور ہم باقی پاکستانیوں کو کشمیر میں جا کر قتال کرنے کو ناجائز یا حرام قرار دے دیتا ہے کہ کشمیر ہماری حدود سے باہر ہے۔ تو اس طرح سورۃ النساء کی آیت مبارکہ 75 میں مظلوموں کی مدد کے لئے جانے کو غلط یا ناجائز قرار دے دیتا ہے اور قبائلی مجاہدین کے جہاد کو اسلام شعائر کی پابندی کے ساتھ محدود کر دیتا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ جنگ احد کے حضرت اسیرم رحمۃ اللہ علیہ جن کو ہمارے آقا ﷺ نے شہید قرار دیا۔ انہوں نے جنگ سے پہلے ایک نماز بھی نہ پڑھی تھی اور اس وقت اسلام لائے تھے۔ مودودی کا ایک ساتھی امین اصلاحی اپنی تحریروں میں تسلیم کرتا ہے کہ مودودی قرآن پاک کے الفاظ کو بھی اپنی مرضی کے معنوں میں ڈھال لیتا تھا۔ یہ عاجز مودودی کے عالمانہ تکبر کہ وہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

وغیرہ سے بھی بڑا ''امام'' ہے کا ذکر پہلے کر چکا ہے۔ اور جگہ جگہ اس کی ''بے ادبیوں'' اور گستاخانہ تحریوں کا ذکر کر چکا ہے۔ لیکن مجبور ہو کر یہ عاجز مودودی کی تفہیم پر دو سو صفحات کی ایک کتاب بھی لکھ چکا ہے۔ کہ مودودی کس طرح اپنی تحریروں میں غلط بیانیاں کرتا ہے یا تحریری بددیانتی سے بھی گریز نہیں کرتا۔ یہ عاجز اس سلسلہ میں اپنی کتاب کے بیانات سے چند جھلکیاں اس طرح دے گا۔ جنگ بدر کو رب سبحانہ سورۃ الانفال کی آیت مبارکہ 41 کے مطابق ''یوم الفرقان'' یعنی ''فیصلہ والا دن'' قرار دیتے ہیں اور سورۃ الانفال کی آیت مبارکہ 7 رب سبحانہ چاہتا تھا۔ ''کہ کافروں کی جڑ کٹ جائے۔'' لیکن مودودی اس جنگ کو ''بھڑوں کے چھتے میں پتھر مارنے'' کے مترادف قرار دیتا ہے اور یہ نہ سوچا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سپہ سالار تھے اور عظیم صحابہ رضی اللہ عنہم اہل لشکر تھے۔ تو مودودی اللہ تعالیٰ پاک ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نعوذ باللہ ''نادانوں'' کے زمرہ میں ڈال دیتا ہے۔ کہ انہوں نے ''نادانوں'' کی طرح قریش کفار کو ''مچھیرا'' دیا اور یہ جنگ و جدل شروع ہو گئی ورنہ اسلام امن سے پھیل جاتا۔ (توبہ میرے اللہ)۔ مودودی کی اس گستاخی کی وجہ سے ہم پر پتھر برس سکتے تھے۔ لیکن وہ تو غیروں کی سازش کو پروان چڑھا رہا تھا۔ کہ جہاد کے ساتھ نفرت پیدا کی اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو ٹھیس پہنچائی۔

168۔ سورۃ آل عمران کی آیات مبارکہ 125 تا 128 میں رب سبحانہ مسلمانوں کو جنگ احد کے لئے پانچ ہزار فرشتوں کی مدد کی خوشخبری دینے کے علاوہ، اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح کی خوشخبری اور دشمن کے ایک حصہ کو کاٹ دینے کا مژدہ بھی سناتے ہیں۔ اور پھر ایسے ہی ہوا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کا اس دن بھی محدود تعاقب کیا اور دوسرے دن حمیر الاسد تک تعاقب کیا۔ سورہ آل عمران کی آیت مبارکہ 165 کے مطابق دشمن کا مسلمانوں سے دگنا نقصان ہوا۔ تو تب ہی وہ بھاگ کھڑے ہوئے مودودی اس کو مسلمانوں کی شکست قرار دیتا ہے۔ اور یہ تاثر دیتا ہے کہ فرشتوں کی امداد والی بات صرف ''گپ شپ'' ہے۔ (توبہ میرے

اللہ)۔ کیا دشمن نے مدینہ منورہ پر قبضہ کر لیا تھا اور مسلمان بھاگ گئے تھے؟ جواب ندارد۔ اور مودودی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر یہ الزام بھی لگاتا ہے کہ وہ عبداللہ بن ابی کے ذریعہ سے ابوسفیان سے معافی مانگ رہے تھے۔ (توبہ میرے اللہ)۔ یہ بات کسی اور مورخ نے نہیں لکھی۔ جنگ کو یہ رنگ دے کر مودودی عذاب الٰہی کو دعوت دے رہا ہوتا ہے۔ لیکن اصلی بات یہ ہے کہ وہ غیروں کی سازش کو پروان چڑھانے کے لئے جہاد سے نفرت پیدا کر رہا ہوتا ہے۔ اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو ٹھیس پہچانے کے لئے ان کو شکست خوردہ قرار دیتا ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت مبارکہ 154 اور سورہ آل عمران کی آیت مبارکہ 169 میں تفصیل ہے کہ شہیدوں کو مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو رزق عطا کرتا ہے۔ مودودی ان بیانات کی وضاحت ان الفاظ سے کرتا ہے۔ ''موت کا لفظ انسان کے ذہن پر ایک ہمت شکن اثر کرتا ہے۔ اس لئے منع کیا گیا کہ شہداء کو مردہ کہا جائے'' اور آگے کوئی وضاحت نہیں کرتا کہ حیات بعدازالموت کے تحت موت کے بعد مومن کس بہتر حالت میں ہوتے ہیں۔ مودودی یہ لکھ کر ازخود موت سے کراہت پیدا کر رہا ہے۔ اور تاریخ سے شاید نابلد ہے کہ مسلمان جہاں جاتے تھے وہاں اعلان کرتے تھے کہ اے لوگو ہم موت کے ساتھ اتنی محبت کرتے ہیں۔ جتنی تم لوگ زندگی سے کرتے ہو اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ موت مومن کو تحفہ کے طور پر پیش کی جاتی ہے اور علامہ اقبال ''برلب تبسم آید'' کا مژدہ سناتے ہیں۔ لیکن مودودی مسلمانوں کو موت سے ڈرا رہا ہے۔ سورۃ النساء کی آیت مبارکہ 41 اور سورۃ النحل کی آیت مبارکہ 89 میں بیانات ہیں کہ روز قیامت ہر پیغمبر اپنی امت پر گواہ کے طور پر پیش ہوگا۔ اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم ان گواہوں پر گواہ ہوں گے۔ اور مفہوم کے علاوہ اس بیان کا تعلق زمان و مکاں کے ساتھ ہے کہ زمان و مکاں چونکہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہیں اور یہ پہلو ہم آگے پیرا نمبر 169 میں خوب واضح کر رہے ہیں۔ لیکن مودودی چونکہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر نہیں مانتا۔ تو یہاں آ کر ان دونوں آیات مبارکہ کے بددیانتی سے معنی اور مفہوم بھی تبدیل کر

دیتا ہے کہ حضور پاک ﷺ صرف اپنی امت پر گواہ کے طور پر پیش ہوں گے۔ (توبہ میرے اللہ) حضور پاک ﷺ کے زمان و مکاں پر حاوی ہونے کا وسیع مضمون قرآن پاک میں کئی طریقوں سے دہرایا گیا ہے کہ اول سورہ بنی اسرائیل اور سورۃ النجم میں معراج کے ذکر سے۔ لیکن خاص کر سورۃ الاحزاب آیت مبارکہ 45 اور سورۃ الفتح کی آیت مبارک 8 میں حضور پاک ﷺ کے صفاتی اسم ''شاہد'' کا جو ذکر کیا گیا ہے یا سورۃ البروج کی آیت مبارکہ 3 میں رب سبحانہ نے اپنے حبیب ﷺ کے ''شاہد اور مشہود'' ہونے کی جو قسم اٹھائی ہے۔ تو مودودی کو بہت ''تکلیف'' ہوئی ہے اور وہ لکھتا ہے کہ کچھ لوگ اس غلط فہمی میں ہیں کہ ہمارے اعمال کے بارے ہمارے پیغمبر سے بھی گواہی لی جائے گی یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ تو نہ دیکھ رہے تھے کہ ہم کیا کر رہے ہوتے ہیں۔ کم علم مودودی کو یاد نہ رہا کہ ہمارے آقا ﷺ مدینہ منورہ میں بیٹھے جنگ موتہ کی لڑائی کا مشاہدہ فرما رہے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بتا رہے تھے کہ اب جناب زید رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے ہیں۔ مودودی کی ساری تفسیر میں تخلیق کائنات کے سلسلہ میں زمان و مکاں کے اہم مضمون پر وہ بالکل ''خاموش'' ہے اور ان متعلقہ آیات مبارکہ کی بڑی بھونڈی تفسیر لکھی کہ ہمارے پیغمبر اپنے زمانے یا زندگی میں ''شاہد'' تھے۔ کہ مودودی کے سامنے مقصد حضور پاک ﷺ کی شان کو کم کرنا ہے۔

169۔ حضور پاک ﷺ کے زمان و مکاں پر حاوی ہونے اور روحانی اور نور کے طور پر ہر وقت ہر جگہ موجود ہونے کو رب سبحانہ کئی تناظر میں کئی مقامات پر بیان فرماتا ہے۔ سورہ آل عمران کی آیت مبارکہ 44 میں ذکر ہے کہ اے میرے حبیب ﷺ جب حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت کے سلسلہ میں قرعے ڈالے جا رہے تھے آپ ﷺ کیا وہاں پر موجود نہ تھے؟ یا سورۃ القصص کی آیت مبارکہ 44 میں فرمایا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا کی جا رہی تھی تو کیا آپ ﷺ کوہ طور کے کنارے پر موجود نہ تھے؟ یہ آیات مبارکہ سورۃ النساء آیت مبارکہ 41 اور سورۃ النحل کی آیت مبارکہ 89 کی عملی وضاحتیں ہیں۔ لیکن مودودی ان آیات مبارکہ

کے ''منفی''، معنی کرتا ہے کہ حضور پاک ﷺ وہاں ''موجود'' نہ تھے۔ اگر یہ بات تھی تو اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کی یاد دہانی کیوں کرا رہے تھے۔ توبہ میرے اللہ۔ قرآن پاک کی تفسیر وہ لکھے جس کے سامنے پورا قرآن کھلا رہے۔ اور ایک قسم کے مضامین کے حوالوں سے رابطے باندھے جائیں۔ مودودی اور اکثر مفسرین ایسے رابطے ہرگز نہیں باندھتے یا مودودی اپنے نوٹوں کا حوالہ دیتا ہے۔ لیکن باقی باتوں پر کسی جگہ کچھ کہا اور دوسری جگہ کچھ اور کہہ دیا۔ بہر حال حضور پاک ﷺ کے زمان و مکاں پر حاوی ہونے کے متشابہ بیانات سورۃ الحجر آیت مبارکہ 88 اور سورۃ الشعراء کی آیت مبارکہ 215 میں بھی ہے۔ ''کہ اے میرے حبیب ﷺ تمام مومنین کے لئے اپنے رحمت کے بازو کھول دے یا ان کو اپنے رحمت کے بازوؤں کے نیچے لے لے۔ یہ آیات مبارکہ بڑی وسیع تفسیر کی دعوت دیتی ہیں کہ ہمارے آقا ﷺ ویسے تو تمام انسانیت یا نباتات یا جمادات کے لئے رحمت ہیں لیکن بات قسمت کی ہے اور یہ ''پر'' صرف مومنین کے لئے کھلے ہیں یا وہ حضور پاک ﷺ کی حفاظت میں ہیں۔ اور یہاں لفظ مسلمین بھی نہ استعمال کیا کہ ان آیات مبارکہ کا تعلق سورۃ النساء آیت مبارکہ 141 اور سورۃ الروم کی آیت مبارکہ 47 سے بھی ہے کہ رب سبحانہ صرف مومنین کی مدد کرتا ہے اور مومنین پر کفار کا غلبہ نہیں ہوتا۔ تو کیا یہاں صرف ان مومنین کا ذکر ہے جو حضور پاک ﷺ کے زمانے میں تھے؟ ہرگز نہیں۔ حضور پاک ﷺ کے رحمت کے بازو ہر زمانے اور ہر مکان کے لئے کھلے ہیں۔ یہ صرف مومنین کی قسمت ہے کہ وہ ان رحمت کے بازوؤں کے نیچے محفوظ ہیں۔ مودودی جب یہاں آتا ہے تو ان آیات مبارکہ کے مہمل اور ادھورے معنی کر کے وہ مفہوم کی وضاحت نہیں کرتا۔ عبدالماجد دریا آبادی نے کہا تھا کہ مودودی قرآن پاک کی تفسیر تو نہیں لکھ رہا وہ تو آیات مبارکہ کی ''آڑ'' میں اپنے عقائد کا پرچار کرتا ہے۔ لیکن جب کسی آیت سے اس کی ذات یا عقیدہ پر اثر ہو تو وہ اس آیت کے معنی ہی تبدیل کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 167 واضح کرتی ہے کہ جن لوگوں کے پاس قتال یا

لڑنے کے ہنر کا علم نہیں۔ وہ لوگ کفر کے نزدیک ہیں کہ قتال جہاد کا حصہ ہے خواہ نیزوں بھالوں سے لڑیں۔ حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے کہ مومن جہاد میں مصروف رہتا ہے یا سوچتا ہے کہ کیسے جہاد میں شرکت کروں۔ اور یہ بھی نہ ہو تو جہاد کی تیاری کی کوشش کرتا ہے۔ اب ان اعمال کے لئے فن، سپہ گری کی شد بد ضروری ہے۔ تو مودودی اگر اس آیت مبارکہ 167 کے صحیح معنی کرتا۔ تو خود کو کفر کے نزدیک پاتا تو معنی ہی تبدیل کر دیئے اور لکھا کہ یہ منافقین کی سوچ تھی اور انہوں نے کہا ''کہ اگر ہمیں یہ علم ہوتا کہ آج جنگ ہو گی تو تمہارا ساتھ دیتے۔'' اسی طرح سورۃ الواقعہ کی آیت مبارکہ 91 جو حضور پاک ﷺ کے لئے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ کو دائیں والوں کی طرف سے سلام ہو۔ تو وہاں مودودی عربی لفظ ''لک'' کے معنی کرتا ہی نہیں اور کہتا ہے دائیں والوں سے سلام۔ کس کو؟ جواب ندارد، کہ دائیں والے سارے زمان و مکاں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ مودودی صرف ''حاضر'' تک اپنے آپ کو محدود کر کے حضور پاک ﷺ کی شان کو ٹھیس پہنچانے سے دریغ نہیں کرتا۔

170۔ قارئین! اس چھوٹی سی کتاب میں یہ عاجز مودودی کی تفہیم کے سب غلط بیانات کی جھلکی نہیں دے سکتا۔ اب اس سلسلہ میں میری متعلقہ کتاب پڑھیں۔ جس کے اشاعت کے فوراً بعد میں نے اس کتاب کی تین کاپیاں جماعت اسلامی کے لاہور کے مرکز منصورہ میں بھیج دیں۔ کہ یہ ہیں تمہارے مودودی کی ''خرافات'' اگر میں نے کسی غلط بیانی سے کام لیا ہے یا غلط حوالہ دیا ہے یا غلط جائزہ پیش کیا ہے تو مجھے آگاہ کیا جائے۔ تم لوگوں پر فرض ہے کہ قوم کو ان گمراہی والی باتوں سے بچاؤ۔ جواب میں جماعت اسلامی کے سیکرٹری منور حسن نے لکھا۔'' مجھے یہ کتاب مودودی کی زندگی میں لکھنا چاہیے تھی کہ وہ تمہیں جواب دیتا۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ تم صحیح ہو یا مودودی صحیح تھا۔ میں نے جواباً خط لکھا ہے کہ غلام کذاب مر چکا ہے۔ اور وہ غیروں کی سازش کی پیداوار تھا۔ اس کی بددیانتیوں سے قوم کو آج کل بھی آگاہ کیا جا رہا ہے۔ میرے حساب سے مودودی بھی کسی سازشی طاقت کی ''کڑی'' ہے۔ کہ وہ مسلمان کا لبادہ

اوڑھ کر طریقہ سے ہمارے اندر سے روح محمد ﷺ نکال رہا ہے اور جہاد کو بے جان کر رہا ہے۔ تم لوگوں کو حق و باطل میں فرق کرنے کا علم تو ہے۔ تم اس تناظر میں میری کتاب کا مطالعہ کر کے امت محمدی ﷺ کو ان گمراہیوں اور تفرقہ بازیوں سے بچاؤ جو مودودی پھیلا گیا ہے۔ لیکن جماعت اسلامی والوں نے مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ میری اس کتاب کو البتہ بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ مجھے اور زیادہ یقین ہو گیا کہ ہماری اس فرقہ داری کا بڑا سبب ہماری ''کم علمیاں'' ہیں یا غیروں کی سازش کے اثرات ہیں۔ اب اس عاجز نے سوچا کہ لوگ کتابیں نہیں پڑھتے۔ تو چلو کھلے خطوط سے تبلیغ کا کام شروع کروں۔ تو 19 نومبر 2004 کو جماعت اسلامی، دیوبندی اور بریلوی مسلک یا اہل حدیث اور اہل تشیع کے کچھ بڑے یا مشہور لوگوں کے نام لکھ کر قوم کو ایک کھلا خط لکھا، جس میں مودودی اور اسمٰعیل دہلوی کی تفرقہ بازیوں کی چند تحریری بددیانتیوں کی مثال دیتے گزارش کی کہ آئیں ان تفرقہ بازوں سے چھٹکارا حاصل کر کے اول اور آخر مسلمان بن جائیں۔ اس خط کی کاپی مجید نظامی کو بھی دی کہ وہ یہ سچ اور حق شائع کرے۔ اور میں نے اگر کوئی غلط بیانی کی ہے تو میری ایسی تیسی کی جائے وغیرہ۔ لیکن نہ کسی نے کوئی جواب دیا نہ مجید نظامی نے یہ خط شائع کیا۔

171۔ اس عاجز نے البتہ یہ سلسلہ جاری رکھا اور 19 دسمبر 2004ء میں دوسرا خط زیادہ سخت زبان میں لکھا۔ اور علماء کے لبادہ اوڑھنے والوں کی کئی اور ''کم علمیوں'' اور ''بددیانتیوں'' کا بھرپور ذکر کیا۔ اور مخاطبین کو ''جھنجوڑا'' بھی کہ روز قیامت اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دو گے۔ لیکن کوئی رد عمل نہ ہوا۔ تو 19 جنوری 2005ء کو اس سلسلہ کا تیسرا خط اور زیادہ سخت زبان میں جاری کر دیا۔ جس میں ان بددیانتیوں کی اور زیادہ عملی مثالیں تھیں۔ لیکن ''شرم تم کو نہیں آتی'' کے تحت مجید نظامی سمیت کسی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تو 19 فروری 2005ء کو اس عاجز نے جو چوتھا خط لکھا تو ان مخاطبین کے نام تو لکھے لیکن ان کے لئے لفظ ''اسلام علیکم'' نہ استعمال کیا اور واضح کیا کہ ایسا کچھ ان کو شرم دلانے کے لئے کر رہا ہوں۔ کہ وہ لوگ مجھے جو جواب نہیں دے رہے۔ تو وہ

لوگ اسلامی، سلام کے حقدار نہیں رہے۔ اور اس خط میں تفرقہ بازیوں کو دور کرنے کی کچھ عملی سفارشات بھی کیں۔ اور لکھا کہ تم لوگوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو مجھ پر ثابت ہو جائے گا کہ تم لوگ بھی بھٹو کی طرح زندگی کو فراڈ سمجھتے ہو اور اسلام کا لبادہ اوڑھ کر ''گل چھرے اڑانا'' چاہتے ہو۔ قارئین! حیران نہ ہونا، کہیں سے چوں کی آواز نہ آئی۔ تو اس عاجز نے پانچواں خط رب نبی محمد ﷺ کو 19 مارچ 2005ء میں لکھ دیا کہ یہ عاجز یہ تمام معاملات سورۃ النساء کی آیت مبارکہ 59 کے مطابق آپ کی ذات پاک اور رسول پاک ﷺ کی ذات پاک کے سپرد کرتا ہے۔ اور اس خط کی کاپی البتہ تمام مخاطبین کو دے دی اور یہ بھی قوم کے نام ایک کھلا خط تھا۔ ان تمام خطوط کی کاپیاں میرے پاس موجود ہیں۔ اور ان کو اکٹھا کر کے یہ عاجز ایک کتاب شائع کر سکتا تھا۔ لیکن غیبی اشارے کہہ رہے ہیں کہ یہ ایک ''لاحاصل مشق'' ہو گی تو اے سپاہی تو باقی کام جاری رکھ۔ اور شاید یہ موجودہ کتاب بھی انہی اشاروں کی ایک ''کڑی'' ہے۔

172۔ بہر حال مودودی کی تفہیم پر تبصرہ والی کتاب کی پذیرائی کی کوئی حد نہ رہی۔ اور عجیب وغریب ردعمل ہوئے۔ جن میں سے نمونے کے طور پر دو واقعات لکھ رہا ہوں۔ سب سے پہلے میجر جنرل تجمل حسین ملک اب مرحوم و مغفور میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مودودی کی علمی شہرت کی وجہ سے وہ ان کی تفہیم میں ان کی بدنیتی اور اتنی غلط بیانیوں یا کم علمی کی باتوں کو نہ سمجھ سکا اور کچھ عرصہ اس کا ''مداح'' رہا۔ اور اس کو مانتا رہا۔ اب اس پر بہت نادم ہوں۔ آپ میرے لئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے کہ ایسے قماش والے آدمی کے ساتھ تعلقات رکھے۔ اس کے بعد عزیزم کرنل عاشق ملک کہنے لگے ''کہ آپ کی کتاب پڑھنے کے بعد حیران ہوں کہ مودودی جیسا عالم ایسی غلطیاں کیوں کر گیا جن کی آپ نے اب نشاندہی کی ہے۔'' میں نے کہا کہ مودودی کی ''عالمیت'' تم پر اس قدر اب بھی چھائی ہوئی ہے کہ تم غلطیوں کو ثانوی حیثیت دے رہے ہو۔ یہ نہ صرف غلطیاں ہیں بلکہ عیاں طور پر بدنیتی

کے زمرہ میں آتی ہیں۔ اور اس کا بڑا ثبوت جماعت اسلامی کا جنرل سیکرٹری منور حسن اپنے مضامین میں دے چکا ہے کہ جب مودودی نے وہابیت اختیار کی تو ماں سے بھی ''پردہ'' رکھا۔ کہ خاندانی طور پر یہ لوگ صحیح عقیدہ والے لوگ تھے اور دراصل یہ وہابیت اختیار کرنا بھی ایک ''آڑ'' تھی۔ جس کی مدد سے دراصل وہ غیروں اور باطل طاقتوں کی ضرورت پوری کر رہا تھا۔ کہ ہمارے اندر سے روح محمد ﷺ نکالنے کی سازش کی ''کڑی'' بن گیا تھا۔ کس قیمت پر؟ میرا رب جانتا ہے۔ یہ عاجز ہر عمل کو اس کے نتائج سے پرکھتا ہے کہ مودودی بے ادبیوں اور گستاخیوں کی سب حدیں پھلانگ گیا ہے۔ کرنل عاشق کہنے لگا۔ تمہاری تحقیقات بے حساب ہیں۔ لیکن تمہاری اس کتاب کا زیادہ اثر نہ ہوگا کہ تم مفسر قرآن نہیں۔ کوئی مفسر قرآن اگر ایسا کچھ کرتا تو اس کے بڑے اثرات ہوتے۔ قارئین! رب سبحانہ کی قدرت دیکھیں کہ اس عاجز کو رب سبحانہ نے نہ صرف مفسر قرآن بنا دیا۔ بلکہ میرے رفقاء کے مطابق ایک منفرد اور انوکھی تفسیر لکھنے کی سعادت بھی عطا فرمادی۔ قارئین! اول تو اس عاجز نے جو کتابیں لکھیں، وہ بھی دوستوں نے مجھے زبردستی قلم پکڑوا دیا تھا۔ ورنہ اس عاجز نے کبھی ان کتابوں کی تصنیف کے بارے سوچا بھی نہ تھا۔ اور خیر تفسیر لکھنی تو میرے وہم وگماں میں نہ تھی کہ عربی زبان پر بھی مجھے بہت معمولی عبور حاصل ہے، نہ میں کسی اسلامی ادارہ کا سند یافتہ ہوں اور نہ میں نے کسی کالج میں کوئی دنیاوی علوم حاصل کئے۔ میرے زیادہ تر علوم بزرگوں کے سینہ یا چل پھر کے مشاہدات اور مطالعہ کی وجہ سے ہیں۔

173۔ تو تفسیر لکھنے میں بھی یہ عاجز میرے رفیق اور ملک کے مشہور سائنسدان سلطان بشیر محمود کے ''مددگار'' کے طور پر داخل ہوا۔ لیکن میرے کام سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ کہنے لگے کہ اس کام میں بھی یہ عاجز آگے آگے چلے اور وہ میرے پیچھے چلیں گے۔ لیکن جب اپنوں نے انہیں حراست میں لے لیا تو یہ عاجز اس میدان میں اکیلا رہ گیا۔ تو رب کی ذات پاک نے پورا قرآن پاک میرے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ ''کہ اے سپاہی! تو ایک با مقصد اور زمانے

کے تناظر میں منفرد تفسیر لکھ کہ قرآن پاک کے جو اثرات قرون اولیٰ کے مسلمانوں پر ہوئے وہ کیوں مفقود ہو گئے ہیں اور اب قرآن پاک سے نشان راہ تلاش کر کے قوم کو اس طرف متوجہ کر کہ وہ اول اور آخر مسلمان ہو کر حزب اللہ (سورۃ المائدہ اور سورۃ المجادلہ) بن جائیں۔"

اسی دوران رب سبحانہ نے مفتی محمد لطف اللہ کو میری معیت کیلئے بھیج دیا۔ وہ نہ صرف میرے مشیر اعلیٰ بن گئے بلکہ میرے پاس آ کر کتابوں کے ڈھیر لگا دیئے کہ میں ان سے مدد لوں، اور کتابت اور اشاعت کی ذمہ داری بھی انہوں نے اٹھالی۔ پہلی منزل کی اشاعت کے بعد، مزید اشاعت کا کام، راولپنڈی، اسلام آباد میں کچھ تعطل کا شکار ہو رہا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے لاہور سے عزیزم محمد طفیل کو بھیج دیا، جن کے ساتھ پہلے شناسائی بھی نہ تھی۔ تو اب اس تفسیر کی اشاعت کا سارا کام انہوں نے سنبھال لیا اور اپنی تفسیر کی زیادہ تعریف کر کے یہ عاجز خود "میاں مٹھو" نہیں بننا چاہتا۔ لیکن یہ عاجز گزارش کر چکا ہے کہ جب سے غیروں نے ہمارے اندر سے روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم نکالنے کی سازش شروع کی ہے۔ ہمارے اندر سے ابن الوہاب اسمٰعیل دہلوی اور مودودی کی قسم کے لوگوں نے غیروں کے "کارندے" بننے کی حامی بھر لی تو مسلمانوں کی اکثریت مومن کی فراست سے عاری ہو گئی ہے۔ اور اسلامی علوم کے چشمے بھی خشک ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ یا جناب ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ جیسے لوگ بھی ناپید ہو گئے۔ اور پچھلے تین سو سالوں میں کسی صاحب نے زمانے کے تناظر میں کوئی بامقصد تفسیر بھی نہیں لکھی۔ بلکہ "مولویوں" اور "مفسروں" نے اسلام اور قرآن پاک کو مسجدوں میں "محبوس" کر دیا۔ یا اسلامی شعائر تک "محدود" کر دیا۔ اور بے دین لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا کہ دنیاوی علوم کے وہ کرتا دھرتا بن گئے اور مادر پدر آزاد لوگ ہمارے "رہنما" ہو گئے۔ علاوہ ازیں جو عام علوم یا سائنسی علوم میں پچھلے تین سو سالوں میں ترقی ہوئی۔ ہمارے "مولوی" اور "مفسر" اس سے "بے خبر" رہے اور قرآنی یا دینی علوم "ثانوی" حیثیت حاصل کر گئے۔

174۔ اس عاجز نے نہ صرف پوری تفسیر زمانے کے تناظر میں لکھی ہے بلکہ ساتھ تقریباً ڈیڑھ سو صفحات کا تفسیر کا ایک خلاصہ بھی لکھا۔ جس کی ہزاروں کامیاں شائع کر کے مفت بانٹی جارہی ہیں۔ تو اس تفسیر کی جھلکی ایک آدھ صفحہ میں Obridge کرنا ناممکن ہے۔ پس یہ سمجھ لیں کہ یہ تفسیر پڑھتے وقت اول تو سارا قرآن آپ کے سامنے کھلتا رہے گا لیکن متعلقہ مضامین کے جو رابطے باندھے ہیں۔ ایسی صورت حال اس زمانے کی کسی تفسیر میں نظر نہ آئی۔ اور پھر قرآن پاک ایک ایسا معجزہ ہے کہ جیسے جیسے انسانی علوم میں اضافہ ہوتا ہے تو قرآن پاک میں تلاش کرنے سے وہ علوم پہلے سے موجود ملتے ہیں اس لئے ہماری تفسیر میں ہم نے تخلیق کائنات اور کارخانہ قدرت کے چلنے کے سلسلہ کے تمام نئے دریافت شدہ علوم کو قرآن پاک کے انکشافات کے تابع کر دیا ہے۔ جو کام عام مفسروں نے نہیں کیا۔ علاوہ ازیں انسان کی پیچیدہ شخصیت میں جس طرح ہم نے روح، نفس اور بدن وغیرہ کو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر ازل سے ابد تک اس کائنات میں انسانی سفروں اور اس کے پڑاؤ کی وضاحت کی یا زمان و مکاں کے عقدے کھولے ہیں یا اکثر احادیث مبارکہ اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات خاص کر مشہور جنگوں کو آیات مبارکہ کی وضاحت میں رابطے باندھ کر تفصیل سے پیش کیا۔ ایسا کچھ باقی تفسیروں میں خال خال نظر آیا۔ بلکہ ہم نے اپنی تفسیر کو قصص الانبیاء بھی بنا دیا کہ پہلے پیغمبروں کے بارے تمام تر بیانات کو یک جان کر کے اس سلسلہ میں تاریخ کے بامقصد مطالعہ کو ایک نیا رنگ دیا ہے وغیرہ۔ قارئین! میں اس سلسلہ میں اور کچھ نہیں لکھ رہا کہ یہ بیانات بلاواسطہ دوسروں کی تفسیر پر تنقید بن جائیں گے۔ کہ مودودی جو ''مفکر اسلام'' بنا ہوا ہے۔ اس کی تفسیر پر تبصرہ کی کچھ جھلکی ابھی بھی دے آئے ہیں کہ کتنا ''کم علم'' تھا۔ لیکن اندھوں میں کانا سردار تھا اور اس کو معلوم تھا کہ برصغیر ہندو پاکستان میں کوئی اس کو ''لگام'' نہ دے سکے گا۔ یہ عاجز البتہ اپنی تفسیر کے خلاصہ کی تین کاپیاں جماعت اسلامی کو بھیج چکا ہے۔ کہ ان کے لئے بڑا ''نادر'' موقع ہے کہ مودودی کی تفسیر کے الفاظ اور بیانات کا میری تفسیر کے ساتھ

موازنہ کریں۔ تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ تفسیر کس کو کہتے ہیں اور قارئین یہ عاجز افسوس کے ساتھ کہے گا کہ اس زمانے میں لکھی گئی باقی تفسیریں بھی گزارا ہیں۔ قارئین! اس سلسلہ میں میری تفسیر کا موازنہ، علامہ شبیر عثمانی، امین الدین اصلاحی، پیر کرم شاہ، فتح محمد جالندھری، علامہ یوسف علی اور کرنل ایوب وغیرہ کی تفسیروں سے کر کے خود کوئی فیصلہ کریں۔ بلکہ سید قطب شہید کی تفسیر کے ترجمہ سے بھی کریں۔

175۔ اسلام سے ہمارا نابلد ہونا، کچھ ''غلط العام'' اصطلاحوں کا استعمال اور بھانت بھانت کی بولیاں جو ہمارے دانشوری کا لبادہ اوڑھنے والے یا ''نیم ملاں،، بولتے رہتے ہیں تو یہ عاجز آہ و زاری کے ساتھ خود زخم کھاتا رہتا ہے۔ یہاں صرف چند مثالیں دوں گا۔ قرآن پاک میں تقریباً بیس تیس مرتبہ اسلام کو ''صراط مستقیم'' کا نام دیا گیا ہے کہ قافلہ حق ازل سے ابد تک اس سیدھے راستے پر رواں دواں ہے۔ اس میں کوئی ''انقلاب'' یعنی پیچھے مڑنا نہیں ہے۔ لیکن روس اور فرانس کے مادی انقلابوں کی نقل میں ہمارے رہنما بھی ''اسلامی انقلاب زندہ باد'' کے نعرے لگاتے رہتے ہیں اور نعوذ باللہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بعض لوگ ''پیغمبر انقلاب'' قرار دے دیتے ہیں۔ قرآن پاک میں دو جگہ کو چھوڑ کر لفظ انقلاب کبھی اچھے معنوں میں نہ استعمال ہوا۔ یہ پیچھے مڑنا یا اوندھے منہ گرنا ہوتا ہے۔ اسلام، سورہ آل عمران کی آیت مبارکہ 19 کے مطابق اللہ تعالیٰ کا دین ہے۔ اور سورۃ المومنوں کی آیت مبارکہ 52 کے مطابق سب پیغمبروں کا دین ایک ہے اور یہ دین اسلام ہے عیسائی ہونا یا یہودی ہونا قرآن پاک کے مطابق دین اسلام سے منحرف ہونا ہے۔ اسلام کا کسی اور مذہب کے ساتھ موازنہ ہو ہی نہیں ہو سکتا، لیکن ہمارے دانشوروں نے باقی مذاہب کے ساتھ اسلام کو بھی ان مذاہب کا ''متوازی'' مذہب بنا دیا ہے (توبہ میرے اللہ)۔ اسلام اللہ تعالیٰ کی آمریت ہے اور اللہ تعالیٰ کا ایک اسم بھی آمر ہے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اسم بھی آمر ہے۔ سورہ آل عمران اور سورۃ الشوریٰ میں مشورہ اللہ تعالیٰ کے امر یا احکام کو جاری کرنے کے طرائق میں ہوتا ہے، یار

لوگوں نے اس کو مادر پدر آزاد جمہوریت بنا دیا۔ جو نہ کنٹرول ہو سکتی ہے کہ ایوب خان اس کو کنٹرول نہ کر سکا، نہ یہ اسلامی ہے کہ ضیاء الحق اس کو اسلامی نہ بنا سکا کہ مسلمان شیطان کی طرح آزاد نہیں وہ اللہ تعالیٰ کا محکوم ہے۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا نام برۃ (آزاد) تھا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے نام تبدیل کر دیا لیکن ہمارے ہاں بڑے بڑے ''مولینا'' بننے والے یا کئی دانشور ''آزاد'' تخلص کرتے رہے۔ اور کسی کو خراج تحسین پیش کرنا ہو تو بڑے فخر سے کہا جاتا ہے ''عجب آزاد مرد تھا'' (توبہ میرے اللہ)۔ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے۔ (ایاك نعبد) لیکن مجید نظامی نے صحافت کو بھی عبادت قرار دے کر اس کو اللہ تعالیٰ کا ''شریک'' بنا دیا اور صحافت کو پیغمبری پیشہ تو وہ کئی دفعہ قرار دے چکا ہے کہ سارے صحافی چھوٹے چھوٹے ''پیغمبر'' ہیں اور ایسی بھانت بھانت کی بولیوں سے اخباریں بھری پڑی ہوتی ہیں کہ کوئی ٹوکنے والا نہیں ہے اور شہادت تو فی سبیل اللہ ہوتی ہے۔ مجید نظامی اپنے بھائی حمید نظامی کو ''شہید جمہوریت'' بنا چکا ہے۔ گو سورۃ الانعام کی آیت مبارکہ 162 کے مطابق ہمارا مرنا جینا اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتا ہے تو حمید نظامی ''حرام'' کی موت مر گیا۔ اب بے نظیر بھی ''شہید جمہوریت'' ہے۔

176۔ ایسے ''غلط العام'' اصطلاحوں کا استعمال ہمیں مومن کی فراست سے عاری کرتا رہتا ہے کہ مجید نظامی سمیت کچھ لوگوں نے مادر پدر آزاد جمہوریت کو اپنے ایمان کا حصہ بنا لیا ہے اور یہ کافرانہ سیاست ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ سیاست عربی کا لفظ ہے لیکن قرآن پاک یا احادیث مبارکہ میں کہیں بھی یہ ''گندہ'' لفظ نظر نہیں آیا اور سیاسی گروہ بندی، کی بھی اسلام میں اجازت نہیں۔ سورۃ الانعام اور سورۃ الروم کے مطابق فرقہ داری کی ہرگز اجازت نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں تو بھٹو کا خاندان، یا غفار خان کا خاندان، یا اکبر بگٹی اور کئی علاقائی سیاستدان اعلان کرتے ہیں کہ وہ لوگ بے دین سیاست کے دعویدار ہیں۔ مرنے کے بعد ہر آدمی سے پہلا سوال رب سبحانہ کے بارے ہوگا کہ تمہارا رب کون ہے؟ اور دوسرا سوال ہوگا کہ تمہارا دین کیا ہے؟

تو جولوگ بے دین سیاست کے تحت بے دین حکومت اور بے دین معاشرہ کے دعویدار ہیں۔ ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد ان کا جواب ہوگا کہ وہ بے دین ہیں۔تو ایسے لوگوں کے لئے قرآن خوانی کا تردد کیوں کیا جاتا ہے؟ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ غیروں کی نقالی میں اپنے آپ کو ایسے لوگوں کا ''پچھ لگ'' بنا کر ہم خود کو گالیاں نکالتے رہتے ہیں۔ مثلاً ہندوؤں نے رام راج کے مقابلہ میں سامراج یعنی حضرت نوح رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے سام کی اولاد کی حکومت کو سامراج قرار دے کر ایک گالی دی اور ہم بھی یہ لفظ گالی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے قائد اعظم نے کرم چند گاندھی کو ہمیشہ ایک چالاک اور مکار بنیا کا نام دیا اور وہ مسلمانوں کا دشمن تھا۔ ہندوؤں نے اس کو ''مہاتما'' یعنی ایک بہت بڑے روح کا خطاب دیا۔ ہماری اخباریں بھی آج کل اس کو ''مہاتما گاندھی'' لکھتی ہیں۔ طارق بن زیاد نے جب سپین کی طرف پیش قدمی کی تو اس کے لشکر میں زیادہ تر افریقہ کے بربر مسلمان تھے۔ اہل یورپ نے اس حملہ کو ظلم کا نام دے کر Barbaric کا لفظ استعمال کیا۔ ہم بھی آج کل لفظ ''بربریت'' کو ظلم کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ مسلمان کے جھنڈے سیاہ تھے تو سیاہ رنگ اہل یورپ کے لئے ''ماتم'' کی نشانی بن گئی۔ ہم بھی آج کل ماتم یا افسوس کی حالت سیاہ بینڈ باندھتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں فتح کیلئے چرچل نے Victory کیلئے اپنی انگلیوں سے V کا نشان بنایا۔ ہم بھی آج کل اللہ اکبر کی جگہ اسی V کے نشان پر گزارا کرتے ہیں۔ نکٹائی صلیب کا نشان ہے۔ کہ عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کو پھانسی چڑھا دیا گیا تھا لیکن قرآن پاک کی سورۃ النساء کے الفاظ ہیں کہ ''ماصلبوا'' کہ حضرت عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کو پھانسی نہ چڑھایا گیا تھا۔ تو جولوگ نکٹائی پہنتے ہیں، وہ قرآن پاک کے الفاظ کی مخالفت کر رہے ہیں۔ لیکن کیا کچھ کیا جائے سورۃ البقرہ میں لفظ ''مولینا'' رب سبحانہ کے لئے استعمال ہوا۔ پھر دیکھیں کہ اس برصغیر ہندو پاکستان میں دو رکعت کا امام، یا صرف پکی روٹی پڑھا ہوا مُلاں بھی ''مولینا'' بنا پھرتا ہے۔ تو یہ عاجز کسی کیلئے ''مولینا'' کا لفظ نہ استعمال کرے گا۔ لیکن

کیا کروں پس آہ وزاری کے بغیر چارہ نہیں۔

## پانچواں حصہ

# میری تحریک کے اثرات

177۔ قارئین! یہ عاجز ایک دفعہ پھر رب کے دربار میں سجدہ ریز ہوتا ہے۔ کہ اس عاجز کو رب کی ذات پاک نے بے شمار سعادتوں سے نواز دیا۔ تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لینے کی رب پاک نے سعادت عطا فرمائی۔ پاکستان کی تینوں جنگوں میں شرکت کا شرف عطا فرمایا۔ اور 1948ء میں جب جہاد کو جمود دیا جا رہا تھا تو پروٹیسٹ کیا تو مجھے ایڈورس رپورٹ پر رکھ دیا گیا۔ 1965ء میں میرے ماتحتوں اور رفقاء نے عظیم قربانی دے کر داتا کی نگری لاہور کا دفاع کیا اور 23 ستمبر 1965ء سے اپنی کشتیاں جلا چکا ہوں کہ رب سبحانہ نے زبانی اور لکھ کر کلمہ حق کی ادائیگی کی وہ سعادت عطا فرمائی کہ اس عاجز کی صدا سے کئی دفعہ حکومت کے ایوان لرز گئے۔ اور ملک کے دو صدروں کو ان کے منہ پر اور باقیوں کو لکھ کر دیا کہ وہ کس عبرتناک انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔ اس کے بعد رب سبحانہ نے حضور پاک ﷺ کے جلال اور جمال اور خلفائے راشدین کی حکمت سمیت ملکی معاملات اور ضرورت پر دو درجن کے قریب بامقصد کتابوں کا مصنف بنا دیا۔ اور آخر میں یہ سعادت بھی عطا فرما دی کہ "اے سپاہی تو میرے کلام کی تفسیر لکھنے کی سعادت بھی حاصل کر لے۔ ان سب اعمال کے کیا اثرات ہوئے اس، عاجز کو پہلے دن سے اس میں دلچسپی نہ تھی کہ واہ واہ کراؤں۔ یہ عاجز رب پاک اور اپنے آقا ﷺ کی طرف اپنی ذمہ داری پوری کر رہا تھا۔ بلکہ یہ عاجز تو اپنی تحقیق سے جو لطف اٹھاتا رہا۔ میرے لئے تو یہی بڑی سعادت تھی۔ اگر مجھے تو کبھی امید نہ ہوتی تھی کہ یہ کچھ شائع بھی ہوتا رہے گا۔ لیکن رب سبحانہ ساتھ ساتھ اشاعت کا بندوبست بھی کرتا رہا۔ اور صرف یہ کتابیں نہیں اس عاجز کے سینکڑوں مضامین بھی اخباروں میں شائع ہوئے۔ اس

عاجز نے جو تبلیغی خطوط یا قوم کو کھلے خطوط لکھے ان کی تعداد ہزاروں میں ہے۔اور یہ کتاب بھی دراصل قوم کے نام ایک کھلا خط ہے۔

178۔ اب ان کتابوں اور خطوط کے کیا اثرات ہوئے کہ میرے رب نے ان کلمات حق کی ایسی حفاظت کی کہ آج تک کسی نے مجھے نہ ٹوکا کہ میں نے فلاں غلط بیانی کی ہے۔ معصوم صرف حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔اور میں نے بھی چھوٹی موٹی کافی غلطیاں کیں جن میں سے کچھ کا مجھے خود کو پتہ لگ گیا اور کچھ کی میرے رفقاء نے نشاندہی کی۔لیکن یہ ایسی غلطیاں نہ تھیں جو غلط بیانی یا کوتاہی یا بددیانتی کے زمرہ میں آئیں۔میرے لئے البتہ بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ ہر طبقہ کے لوگوں نے مجھے تحسین پیش کی اور میرے کام کو خوب سراہا۔میری پہلی کتاب ''جلال مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھ کر پیر کرم شاہ الازہری نے جو تبصرہ کیا۔ وہ اب میری تحریروں کا حصہ بن گیا ہے کہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب پڑھ کر ان کے کئی غلط تصور درہم برہم ہو گئے۔خاص کر جنگ احد کے بیان میں کہ یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم فتح تھی پیر صاحب پر یہ بھی وارد ہو گیا کہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کتنی تحقیق کی ضرورت ہے۔ یہ 1980ء کی بات ہے۔ سلطان بشیر محمود جن کا ابھی ابھی تفسیر القرآن کے تحت ذکر ہو چکا ہے۔ وہ ملک کے مایہ ناز سائنسدان ہیں۔اور کہوٹہ میں بنیادی کام انہوں نے ہی شروع کیا تھا اور بعد میں خوشاب میں اٹامک نیوکلرری ایکٹر کے ایجاد کے وہی موجد ہیں۔ میرے ساتھ البتہ ملاقات 1993-94ء میں ہوئی۔تو معلوم ہوا کہ دونوں ایک دوسرے کی تلاش میں تھے اور اب ہم دو کتابوں ''حیات بعد الموت'' اور ''قرآن پاک کے سائنسی معجزات'' کے ساجھے مصنف ہیں۔اور انہوں نے میری باقی کتابوں کو جو پذیرائی دی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انہی کی وساطت سے اسلام کے عظیم فرزند مفتی محمد لطف اللہ صاحب کے ساتھ ملاقات ہوئی جو اس وقت وزارت مذہبی امور کے سیکرٹری تھے۔اوران چند CSP افسران سے ایک ہیں جو نیشنل ڈیفنس کالج کے بھی سند یافتہ ہیں۔ان کی نظر میری کتاب ''حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے جلال اور

جمال'' پر پڑی۔ تو مجھ سے متعدد کتابیں خرید کر تمام حکومتی وزارات اور باہر کے ملکوں کے ہمارے سفارت خانوں کو بھجوادیں۔ بعد میں میری خلفاء راشدین کی حکمت عملی والی کتابوں کا دوسرا ایڈیشن جب شائع ہوا۔ تو افسوس کرتے تھے کہ اگر وہ حکومت میں ہوتے تو یہ کتابیں سب اداروں کو بھجوادیتے۔ اب آپ نے میری تفسیر القرآن کا نہ صرف ادارت اور تزئین کا کام سنبھال لیا ہے۔ بلکہ اشاعت کے کرتا دھرتا بھی رہے۔ لیکن اب اسلام آباد میں اشاعت کے معاملات میں کچھ الجھن پڑ رہی تھی تو تین سال ہوئے اللہ تعالیٰ نے محمد طفیل صاحب سے ہمارا رابطہ بندھوادیا۔ جو لاہور میں پیشہ کے لحاظ سے تو چارٹرا کاؤنٹینٹ ہیں۔ لیکن اسلام کے عظیم فرزند ہیں۔ قرآن پاک اور اسلامی رسالوں کی اشاعت بھی کر لیتے ہیں۔ میرے مضامین اور کچھ کتابیں پڑھ کر ایسے متاثر ہوئے کہ تفسیر القرآن کی اشاعت کا سارا کام اب انہوں نے سنبھال لیا ہے اور اپنے خرچ سے راولپنڈی آ کر مجھ سے تمام کام کی Coordination کرتے ہیں۔ میری باقی چھوٹی کتابوں کی اشاعت میں اپنے پاس سے بھی خرچ کرتے ہیں۔

179۔ دراصل یہ میرے رفقاء ہی ہیں۔ جن کی سفارش سے اس عاجز نے قلمی نام ''حضور پاک ﷺ کا سپاہی'' اپنایا تھا۔ اور انہی رفقاء میں سے میجر جنرل احسان الحق ڈاراب مرحوم ومغفور نے یہ کتابیں لکھنے کے لئے مجھے 1979ء میں زبردستی قلم پکڑوادیا۔ اور کہا کرتے تھے کہ میں اپنا یہ علم اس دنیا میں پھیلا دوں۔ اور اس کو ساتھ صرف قبر میں لے جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہاں یہ پھیلاؤ عمل بن کر کام آئے گا۔ آپ نے البتہ 1983ء میں اپنی وفات کی پیشگوئی کرتے میری کتاب ''حضور پاک ﷺ کے جلال و جمال'' کا پیش لفظ لکھا۔ اور چند ماہ بعد مجھے اس میدان میں اکیلا چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے۔ آپ کا یہ پیش لفظ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کہ پاکستان کے قائدین کو بتا گئے کہ ان کو میجر امیر افضل کی کتابوں میں وہ سب کچھ ملے گا۔ جس سے راہ راست اور صحیح طریق کار اختیار کرنے میں مدد ملے گی۔ ضلع

شیخوپورہ کے قصبہ مریدکے کے جناب عبدالمجید انجینئر نے کبھی پوری بات تو نہ بتائی۔ پس اشارہ کیا کہ ستمبر 1965ء کی جنگ کے سلسلہ میں کسی خواب کی وجہ سے جس میں کچھ حضور پاک ﷺ کی طرف سے اشارے ہوئے تو وہ مدت سے میری ''تلاش'' میں تھے۔ آخر 1993ء میں جب میری کتاب حضور پاک ﷺ کا جلال و جمال پر نظر پڑی تو مجھے راولپنڈی ملنے آئے۔ میری تمام تصنیفات مجھ سے خرید کر اپنے رفقا کو تحفۃً دینا شروع کر دیں۔ آپ 21 رمضان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات والے دن کو ایک بہت بڑی افطار پارٹی کرتے تھے۔ دو تین سال ہوئے 21 رمضان سوموار کا دن تھا۔ کہنے لگے آج کا دن بڑا مقدس ہے اگر دنیا کے قید خانہ سے مجھے نجات مل گئی تو مجھے سورج غروب ہونے سے پہلے دفن کر دینا اور افطاری اسی طرح منانا جس کا میں بندوبست کر چکا ہوں۔ پھر ایسے ہی ہوا۔ وہ اپنے بھائی، بیٹوں اور باقی رشتہ داروں اور خاص کر ایک نوجوان حافظ شہباز کو کوئی ایسی وصیتیں کر گئے ہیں کہ ان سب لوگوں نے مجھے ایک ''مقدس ہستی'' بنا دیا ہے۔ اور جس ادب کا وہ لوگ مظاہرہ کرتے ہیں اور جس باقاعدگی سے وہ میرے پاس حاضر ہوتے ہیں۔ تو حیا و شرم کے باعث میں خود حیران ہوں کہ کہاں میں اور کہاں یہ پذیرائی۔ جہاں تک میری تحریوں پر علمی تبصروں کی بات ہے تو میرے ایک عظیم رفیق، سیالکوٹ کے گیلانی سادات کے فرزند، سید رفاقت جو ملک کے مایہ ناز دانشور ہیں۔ اور تدبر میں ملک کے ان چند لوگوں میں سے ہیں۔ جن کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ان کے تبصروں سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ جو متعدد اخباروں میں بھی شائع ہوئے ہیں اور میں نے انہیں اپنی کتابوں میں بھی دہرایا ہے۔ کہ ان کا اختصار بیان کرنے کے لئے کئی صفحات کی ضرورت ہے کہ وہ ایک ایک فقرہ میں پوری کتاب لکھ دیتے۔ جیسے کتاب حضور پاک ﷺ کے جلال و جمال کے بارے لکھا کہ ہر فقرہ خوشبو سے مہک رہا ہے یا اسلامی نظام کتاب والی کتاب میں نظام والی بات کو سراہتے لکھا کہ مصنف کو شدت سے احساس ہے کہ انسان از خود کیا ہے اور یہ وضاحتیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

سید شبیر حسین ہمارے ملک کے حق گو اور عظیم صحافی تھے جو آج سے چار پانچ سال پہلے فوت ہو چکے ہیں اور میری کتاب جہاد کشمیر پر پیش لفظ لکھ کر پوری قوم کو جھنجوڑ کر رکھ دیا کہ وہ ان انکشافات میں غوطہ زن ہوں جو مصنف نے ہماری کوتاہیوں اور غداریوں کے سلسلے میں کئے ہیں۔ حضور پاک ﷺ کے جلال و جمال والی کتاب میں نظریہ جہاد اور جہاد کے تقاضوں کے بیانات کو قوم کی روح کی غذا قرار دیا۔

180۔ برگیڈیئر صدیق ستی ہماری فوج کے ایک بہت سینئر افسر تھے۔ جن کا ذکر کشمیر کے جہاد کے سلسلہ میں ہو چکا ہے کہ بعد میں ان کو بھی راولپنڈی سازش کے مقدمہ میں ''پھنسا'' دیا گیا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے لیکن میری کتابیں پڑھنے کے بعد جب مجھے ملتے تھے۔ تو میرے سامنے جو ادب سے جھک جاتے تھے۔ تو شرم و حیا سے میں نے کئی دفعہ گزارش کی تھی کہ اس ادب کو خلوص تک محدود رکھیں۔ میری کتاب ''حضور پاک ﷺ کا جلال و جمال'' پڑھنے کے بعد ان کا تبصرہ تھا کہ انہوں نے متعدد مفسرین، مولوی آزاد یا اشرف علی تھانوی کی تفسیریں پڑھی ہیں۔ لیکن یہ کتاب قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے اور مجھے بار بار تاکید کرتے تھے کہ میں قرآن پاک کی تفسیر لکھوں۔ میجر جنرل امیر حمزہ کو ستمبر 1965ء اور دسمبر 1971ء دونوں جنگوں میں بہادری کے اعزازوں سے نوازا گیا۔ آپ جب برگیڈیئر تھے تو جنرل وحید کاکڑ ان کا برگیڈ میجر تھا جس کو اپریل 1994ء میں خط لکھا کہ فوجی بارکوں اور چھاؤنیوں میں ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے جو بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ یہ لیپا پوتی ہے۔ آپ اور آپ کے ماتحت فوجی افسران، ان تدبیراتی اور تزویراتی ضرورتوں کو میجر امیر افضل کی کتاب ''حضور پاک ﷺ کے جلال و جمال'' سے سمجھیں۔ یہ عاجز تو اول اور آخر صرف مسلمان ہے۔ لیکن کچھ لوگ مجھے ''بریلوی'' کہتے ہیں۔ لیکن میری کتابیں تو ایسا کوئی تاثر نہیں دیتیں۔ مشہور اہل حدیث مسلک والوں سے نذرالحق لون نے مجھ سے پچیس ہزار روپے کی کتابیں اور برگیڈیئر نثار احمد قریشی نے پانچ ہزار روپے کی کتابیں خرید کر اپنے رفقاء کو تحفۃً پیش کیں۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے کئی سال ممبر رہنے والے ڈاکٹر سید ذاکر حسین سیالوی اور ملک کے مشہور نعت خواں بشیر حسین ناظم نے میری قرآن پاک کی تفسیر کو ایک بامقصد، اچھوتی اور کراماتی انداز والی تفسیر کا نام دیا اور ان کا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں حضور پاک ﷺ نے ضرور اپنے سپاہی کی دستگیری فرمائی ہے۔ میجر عجائب حسین میرے سب سے پرانے رفیق ہیں کہ یہ رفاقت 1939ء سے شروع ہوئی ہے۔ حیران ہیں کہ یہ سارا علم میرے پاس کب اور کیسے آ گیا۔ اور مخول کرتے ہیں۔ کہ گھر کے پیر کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ ورنہ آپ کسی ''مرشد'' سے کم نہیں۔

181۔ لاہور میں رہائش پذیر کرنل محمد یوسف اور پنڈی میں کرنل محمد یونس ستارہ جرات دو سگے بھائی ہیں۔ انکے عشق رسول ﷺ کی وجہ سے 1952ء سے ان کے ساتھ بڑے گہرے تعلقات ہیں۔ یہ دونوں بھائی بھی مجھ سے کتابیں خرید کر رشتہ دار اور رفقاء کو تحفہ کے طور پر دیتے رہتے ہیں۔ راولپنڈی میں کرنل شیخ عبدالرؤف بھی بہت بڑے عاشق رسول ﷺ اور کتاب ''بصیرت'' کے مصنف ہیں۔ راولپنڈی میں میری کتابوں کی زیادہ سرکولیشن یہی صاحب یا فیروز سنز کے آفتاب طارق اور مسٹر سعید کرتے ہیں۔ اب میری پرانی پلٹن 33 محمدی ﷺ (موجودہ 15 پنجاب) کے میجر انیس احمد کو بھی یہ سعادت نصیب ہو رہی ہے۔ آرڈیننس کے محکمہ کے میجر جنرل ممتاز عبدالغنی اور کرنل محبوب الٰہی کی جوڑی بھی میری کتابوں سے بہت متاثر ہے۔ اور ہر ماہ میں ایک دفعہ ضرور ملاقات کے لئے آ جاتے ہیں۔ میرا بہت پرانا رفیق بریگیڈیئر اسلم نیازی بھی اب راولپنڈی آ گیا ہے۔ اور وہ بھی میری کتابیں اپنے رفقا میں خوب سرکولیٹ کرتا ہے۔ فوجی اخبار ہلال کے سابق ایڈیٹر عزیزم ممتاز اقبال تو میرے معاون خصوصی بھی ہیں۔ اور ان کے والد بزرگوار ملک مہر خان سو سال عمر کے بعد جو آج سے تین سال پہلے وفات پا چکے ہیں۔ میں جب ان کو ملتا تھا تو وہ میرے ہاتھوں کو بار بار پیار سے چومتے تھے کہ ہمارے خاندان سے ایک آدمی ان انگلیوں سے کلمہ حق اور قرآن پاک کی تفسیر

لکھ رہا ہے۔ انہی دنوں سیٹ لائٹ ٹاؤن سے عزیزم محمد احمد اور ان کی بیگم بیٹی ساجدہ بھی ہمارے نئے رفقاء بن گئے ہیں۔ جو مجھ سے کتابیں خرید کر رفقاء میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ اور ٹی وی کے ناصر منصور اور ان کی بیگم بیٹی کوکب تو کچھ زیادہ ہی معتقد بنتے جا رہے ہیں۔ لیکن راولپنڈی میں ایک اور ''جوڑا'' یعنی بیٹا بریگیڈیئر زبیر احمد چٹھہ اور ان کی بیگم بیٹی راشدہ تو ہمارے گھر کے فرد بن گئے ہیں۔ اب ہر سال وزیرآباد کے نزدیک اپنے گاؤں احمد نگر میں کئی سال سے یوم النبی ﷺ بڑی شان و شوکت سے منا رہے تھے اور بریگیڈیئر زبیر نے کرنل افتخار سے میرے بارے کچھ سن رکھا تھا کہ ستمبر 1965ء کی جنگ میں اس عاجز کو کیا سعادتیں نصیب ہوئی تھیں اور بریگیڈیئر زبیر نے بھی نوکری اس عظیم پلٹن سولھویں پنجاب غازیان ڈوگرئی سے شروع کی تھی۔ لیکن پچھلے چھ، سات سالوں سے ہمارا روحانی رابطہ بھی بندھ گیا ہے۔ اور یہ عاجز بھی اب ہر سال ان کے گاؤں میں یوم النبی ﷺ کی تقریب میں شرکت کرتا ہے۔ جہاں عزیزم بریگیڈیئر زبیر میرے ہاتھ سے میری کتابیں اور تفسیر لوگوں کو تحفتاً پیش کراتا ہے۔

182۔ لاہور میں کتابوں کی سرکولیشن خاص کر تفسیر کی بانٹ میں میرا بھتیجا محبوب جیلانی محمد طفیل صاحب کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ اور میرے باقی مداحوں خاص کر میری منہ بولی بیٹی امینہ بیگم، صغیرہ بانو شیریں، ملک کے عظیم دانشوران کموڈور طارق مجید اور پروفیسر کے ایم اعظم، عاشق رسول ﷺ اور تین درجن کے قریب کتابوں کے مصنف کرنل انور مدنی، حضور پاک ﷺ کی سیرت پر پانچ جلدوں میں کتاب کے مصنف کرنل ڈاکٹر محمد عمر، کرنل محمد یوسف، کرنل ایوب علی رانا، کرنل محمد افضل کھوٹ اور بریگیڈیئر اعجاز چودھری میرے متعدد رفقاء کے ساتھ رابطے میں ہیں کہ میری تحریک کو پیش رفت دی جا رہی ہے۔ بریگیڈیئر زبیر احمد کی وساطت سے کراچی میں بوستان ملک اور راولپنڈی کے کرنل اطہر الرحمٰن اور مدینہ منورہ میں گلستان ملک بھی اب میرے خاص رفقاء میں شامل ہو چکے ہیں۔ اور مفتی لطف اللہ صاحب

کے کئی رفقا اور ہم جماعت خاص کر اٹک کالج کے سابق پرنسپل ملک محمد سرفراز تو ہمارے رفقاء خاص میں شریک ہو چکے ہیں۔ پشاور سے بریگیڈیئر محمد حیات، بریگیڈیئر اختر علی اور میرے متعدد جاننے والے میری کتابوں کو خوب پذیرائی دلا رہے ہیں۔ شیخوپورہ میں عزیزم امجد مان اور فیصل آباد میں کاظم ملک بھی ایسی امداد دے رہے ہیں۔ اور دور دراز علاقوں سے لوگ ملاقات کے لئے آتے رہتے ہیں مثلاً صوبہ سندھ کے قصبہ کندکوٹ سے پروفیسر عبدالخالق سیرانی تشریف لے آئے۔ بنیر شریف سے علماء کا ایک گروہ اور اکوڑہ خٹک سے طالب علموں کا ایک گروپ صرف ملاقات کی غرض سے تشریف لائے، روزانہ دور دراز جگہوں سے کئی ٹیلیفون آتے ہیں بلکہ سکاٹ لینڈ اور کنیڈا سے بھی ٹیلیفون آتے ہیں اور سب ملنے والوں کا ذکر مشکل ہے کہ ان دنوں ڈاکٹر حبیب شاکر، پروفیسر عاشق حسین، ڈاکٹر ریاض امتیاز اور صوفی شفیق احمد بھی قریبی رفقاء بن چکے ہیں۔ کیپٹن عمار شہید کے والد میجر محبوب اور ان کی بیگم صاحبہ سے بھی بہت پرانی رفاقت ہے اور جنرل حمید گل سے زیادہ رابطہ انہی میجر محبوب کی وساطت سے رہتا ہے۔ لیکن آخر میں ہری پور کے غلام خیر البشر فاروقی اور اس کے اہل و عیال کا ذکر ضروری ہے کہ میں نے بڑی مشکل سے روکا کہ وہ میرے لئے ''پیرومرشد'' کے الفاظ نہ استعمال کریں۔ وہ خود روحانی شخصیت ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور مجھے کئی لوگوں کو روکنا پڑا کہ خدارا مجھے ایک عام سا آدمی اور حضور پاک ﷺ کا سپاہی ہی سمجھیں تا کہ میں عاجز رہوں۔ اس سلسلہ میں ایک عاشق رسول ﷺ میجر غلام یٰسین اب مرحوم و مغفور کا ذکر ضروری ہے۔ جس نے 37-1936ء میں عاشق رسول ﷺ غازی ملک میاں محمد شہید کی بڑی خدمت کی جب وہ فوجی قیدی تھے اور اس عاجز نے حضور پاک ﷺ کے سپاہی کا نام انہی کی دلجوئی سے اپنایا۔ آخر میں ایک اور عاشق رسول ﷺ میجر سلطان اکبر کا ذکر کروں گا جو روزانہ جہاں پر بھی ہوں۔ وہاں سے فون کر کے حضور پاک ﷺ کی شان میں ایک ماہیا سناتا ہے اور مجھ سے حضور پاک ﷺ کی شان میں ایک نعت سنتا ہے میرے بارے یہ ماہیا

اس نے بہت پہلے سنا دیا تھا۔ ''دودھ دا پیالہ وی۔ تے سپاہیا تیرا عشق رسول ﷺ نرالہ وی''۔ انہی دنوں ان کے بیٹے میجر جنرل جاوید سلطان شہید ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس سانحہ کا نعم البدل عطا کرے اور ہمارے ایک اور عظیم رفیق عاشق رسول ﷺ جنرل مشتاق بیگ کو بھی شہادت نصیب ہوئی جو حافظ قرآن اور میری کتابوں کے قاری تھے۔ ان کے خاندان کو بھی رب اس المیہ کا نعم البدل عطا فرمائے۔

183۔ جن لوگوں نے ادیبوں کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے یا ''دانشور'' یا ''لکھاری'' Men of letters کہلاتے ہیں یا افسانہ نویس یا شاعر ہیں۔ انہوں نے بہت کم رابطہ باندھا۔ اور میرے لئے یہ خوشی کی بات ہے کہ ان میں سے اکثر بے دین ہیں اور حضور پاک ﷺ کے مطابق عرب کے مشہور شاعر امرالقیس کی رہنمائی میں جہنم کو سدھاریں گے۔ ان میں صرف ایک اسلام کے فرزند رشید نثار نے رابطہ بھی باندھا اور میری تحریک پر کافی اچھا مضمون لکھا۔ یہی حال صحافیوں کا ہے کہ اسلام کے فرزند سید شبیر حسین کو چھوڑ کر زیادہ صحافی ''سیکنڈلو'' کی تلاش میں رہتے ہیں۔ کبھی کسی سیاستدان نے مجھ سے رابطہ نہ باندھا۔ سوائے جاوید ہاشمی اور فخر امام کے لیکن جب میں نے ان کو سمجھایا کہ وہ کوئی نیک کام کریں۔ تو پھر وہ بھی ''خاموش'' ہو گئے۔ وہ مولوی جو سیاست میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان میں سے بھی کبھی کسی نے رابطہ نہ باندھا۔ سوائے جمعیت العلماء اسلام کے حافظ حسین احمد کے لیکن اس کو بھی جب اس عاجز نے سمجھایا کہ سیاست غیر اسلامی عمل ہے اور خاص کر وہ لوگ فضل الرحمٰن سے ''جان'' چھڑائیں۔ تو پھر اس نے بھی مزید رابطہ نہ کیا اور اب فضل الرحمٰن نے اس کی بھی ''چھٹی'' کر دی ہے۔ ویسے مسجدوں کے بے شمار خطیبوں نے مجھ سے رابطے باندھے کہ میری تحریروں میں ان کو خطباتی رنگ نظر آیا۔ اور کئی ایسے خطیب کتابیں خرید کر لے گئے۔ بہر حال اس عاجز نے اپنی تحریک یا تحریروں کے کچھ اثرات لکھ دیئے۔ لیکن یہ عاجز چونکہ گروہ بندی کے اصول ہی کا مخالف ہے۔ اس لئے نہ کوئی گروہ تشکیل کیا نہ کوئی پارٹی منظم کی اور نہ اپنے بیٹوں کو اپنی ''جانشینی'' کے

لئے تیار کیا۔ حالانکہ کچھ رفقا خاص کر غلام خیر البشر کو بہت تردد تھا کہ میرا کوئی ''روحانی وارث'' ہو۔ اس عاجز نے آج تک جو کچھ کیا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اور رسول پاک ﷺ کی طرف اپنی ذمہ داری کے طور پر کیا۔ کہ بقول میاں محمد بخش ''مالی دا کم پانی دینا' بھر بھر مشکاں پاوے۔ مالک دا کم پھل پُھل لانا، لاوے یا نہ لاوے۔'' اثرات رب سبحانہ کے اختیار میں ہے۔

184- یہ کتابیں بیچنا ہماری تجارت ہرگز نہیں ہے۔ ہم نے کتابیں بک سیلرز کے ذریعہ سے بھی بہت کم بیچی ہیں۔ کہ وہ ڈبل قیمت پر کتابیں بیچتے ہیں۔ ہم کچھ کتابیں تو مخلص غربا میں تحفتاً تقسیم کر دیتے ہیں۔ کتاب کی قیمت بھی اپنے خرچ سے دس فیصد خود ادا کر کے خرچ کے نوے فیصد پر بیچتے ہیں کہ غریب لوگ بھی کتابیں خرید سکیں۔ مثال کے طور پر پانچ سو صفحات کی کتاب ''حضور پاک ﷺ کا جلال و جمال'' ہم صرف -/110 روپے میں بیچ رہے ہیں۔ اور اس سے بہت کم سائز کی میری ہی کتاب ''پاکستان کی کہانی حضور پاک ﷺ کے سپاہی کی زبانی'' جو ایک پبلشر نے شائع کی ہے وہ بک سیلروں کو تین سو روپوں میں دیتا ہے۔ جو آگے لوگوں کو پانچ سو روپے میں یہ کتاب بیچ رہے ہیں۔ بہر حال ساری بات قسمت کی ہے کہ سورۃ آل عمران یا سورۃ القیامۃ کے مطابق کن لوگوں کے چہرے روشن ہوں گے اور کن کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ یہ دنیا اسی امتحان کے لئے بنائی گئی ہے کہ ہم ہر وقت توبہ و ندامت کر کے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے خواستگار رہتے ہیں۔ ڈیڑھ دو سال کی بات ہے۔ کہ ایک رات اس خواب میں گزر گئی کہ میں اپنے متعدد رشتہ داروں اور رفقاء جن میں سے کچھ کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ہم حضور پاک ﷺ کی رحمت بانٹ رہے ہیں کبھی ایسے صاحبان میرے گھر میں، کبھی ان صاحبان میں سے ہم کسی کے گھر یا دفتر میں اور بیچ میں دو تین دفعہ آنکھ کھلی، لیکن جب پھر سو جاتا تھا تو یہی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا اس عاجز نے اس کو خواب نہ قرار دیا ایک اشارہ سمجھا اور اکثر رفقاء کو فون پر مبارک دی کہ ہمیں ایسی سعادت نصیب ہوئی۔ لیکن تجسس یہ تھا کہ اس

کا تعلق ماضی سے ہے یا حال سے یا مستقبل سے۔ تو چند دن بعد کی بات ہے کہ میں اب تک یہ نہیں سمجھا کہ وہ خواب تھا۔ یا واردات تھی کہ کوئی غیب کی آواز تھی۔ معلوم ہوا کہ کوئی صاحب کہہ رہے ہیں۔ ''اے سپاہی! تو جو اپنی کتابوں میں حضور پاک ﷺ کی شان ''رحمۃ للعالمین'' کو اجاگر کرتا رہتا ہے کہ آپ ﷺ کے رحمت کے بازو ہر وقت ہر جگہ کھلے ہیں۔ اے مومنین اس رحمت سے مستفیض ہو۔ یہی حضور پاک ﷺ کی رحمت بانٹنے کا عمل ہے اور اگر چاہو تو اس سلسلہ میں کوئی چھوٹی سی کتاب لکھ دو۔'' تو اس عاجز نے اس خواب کے حوالے سے اختتام دیتے ایک کتاب ''پاکستان عطیہ رب ذوالجلال ورسول وکمال ﷺ'' کے نام سے لکھ کر قوم کو باور کرایا۔ کہ ہم نے اس عطیہ کے سلسلہ میں کیا کوتاہیاں اور غداریاں کی ہیں۔ آؤ اب توبہ ندامت کر کے ''عشق بلاخیز کا قافلہ سخت جان'' بن جائیں اور اس کی زیادہ کاپیاں تحفتہً بانٹ رہے ہیں۔ اب جب اپنی تفسیر کا خلاصہ لکھا تو پھر کہیں سے اشارہ ہوا۔ کہ یہ ''حضور پاک ﷺ کا نور'' ہے۔ اس کی قیمت کوئی نہیں لگا سکتا۔ تو ہم نے اس کتاب کی قیمت یا ہدیہ مقرر ہی نہیں کیا۔ اور ہزاروں کاپیاں تحفتہً تقسیم کر چکے ہیں۔ بہر حال ہم کسی خیرات یا عطیات لینے کے لئے کسی کو اپیل نہیں کرتے کہ وہ ہماری مالی امداد کرے۔ کچھ صاحبان کسی طرح سے متاثر ہو کر خود بخود کچھ امداد کر دیتے ہیں۔ جو خوشی سے قبول کر لی جاتی ہے۔

## چھٹا حصہ ❁ اختتام

185۔ سال 2007ء کے ماہِ رمضان کی شب القدر یا ستائیسویں کی رات کو اچانک یہ عاجز آہ و زاری والی کیفیت میں چلا گیا۔ اور اس قدر ہچکی بندھ جاتی تھی یا میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا تھا کہ بے حال ہو جاتا تھا۔ اور بار بار ''رب نبی محمد ﷺ'' کو عرض کرتا تھا۔ کہ اس عاجز کو علامہ اقبال کی طرح شکوہ کا لفظ یا ایسی طرز اپنانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اور یہ کچھ آپ اور علامہ اقبال کے درمیان تھا۔ میں تو آہ و زاری کا لفظ استعمال کروں گا۔'' کہ اے میرے رب پچھلے تین سو سالوں سے ہم دنیا میں ذلیل ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہم تیری بھیڑ بکریاں تھے۔ لیکن

اب تو ہم اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے غیروں کی بھیڑ بکریاں بن گئے ہیں۔ مہربانی فرما کر اپنے اور اپنے حبیب ﷺ کے نام کی لاج رکھ کہ لوگ یا غیر تو کہتے ہیں کہ ہم تیرے ہیں۔ مہربانی سے دنیا میں ہمیں عزت کا وہ مقام عطا کر جو اہل حق کی شان کا شایان ہے۔ غیر بھی جنہوں نے ہمیں اس ذلت سے دوچار کیا ہوا ہے۔ وہ بھی بے کرداری، مے خواری اور زنان بازاری میں بے غیرتی کی حدیں پھلانگے ہوئے ہیں۔ اور ان کے سامنے یہ ذلالت واقعی ایک بہت عبرتناک صورت حال ہے۔ اور اس عاجز کے اب جو یہ آنسو جاری ہو گئے ہیں۔ تو علامہ اقبال کی طرح مجھ میں تو یہ ہمت نہیں کہ یہ "آبگینہ" اپنے آقا ﷺ کے سامنے پیش کروں۔ کہ آپ ﷺ تو سب صورت حال سے آگاہ ہیں۔ اور امت کیلئے "حریص علیکم" ہوتے خاموش ہیں کہ آپ ﷺ تو رضا و تسلیم کے ایسے اونچے مقام پر ہیں کہ اپنے نواسے کے "ذبح عظیم" کے حادثہ کو بھی برداشت کر گئے۔ تو یہ عاجز اپنے آقا ﷺ کے سامنے "آبگینہ" پیش کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔ تو علامہ اقبال کے الفاظ استعمال کرتے یہ عاجز یہ آبگینہ بھی آپ رب سبحانہ کے سامنے پیش کرے گا اور عرض کروں گا "کہ جھلکتی ہے تیرے حبیب ﷺ کی امت کی آبرو اس میں۔ اب یہ عاجز بے بس ہو چکا ہے کہ میری قوم کی کوئی رہنمائی نہیں کر رہا کہ ان کو یاد دلائے کہ وہ تو جہاں دنیا کی رہنمائی کے لئے اور وراثت کے لئے تخلیق کئے گئے تھے۔ لیکن وہ غیروں کے "پچھ لگ" بنے ہوئے ہیں اور باطل فلسفوں اور نظریات پر اسلام کے لیبل لگا کر ان کو اپنا رہے ہیں اور یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ تکبیر پڑھ کہ سؤر کا گلا کاٹنے سے وہ حلال نہیں ہو سکتا۔ اس عاجز کیلئے اب آپ کے دربار میں اس آہ و زاری کو جاری رکھنے کے علاوہ کوئی اور راستہ باقی نہیں رہ گیا۔

186۔ قارئین! اس سب صورت حال کا کچھ پس منظر بھی ہے۔ مجھے کب سے لوگ حاجی صاحب کہہ کر بلاتے تھے گو مجھے یہ سعادت بہت دیر کے بعد نصیب ہوئی۔ کہ یہ عاجز تو اکثر گنگناتا رہتا تھا "کہ کعبہ کس منہ سے جاؤ گے شرم تم کو مگر نہیں آتی۔" پھر میرے ایک رفیق برگزیدہ

اختر علی کا خیال تھا کہ شاید، صلاح الدین ایوبی، اورنگزیب عالمگیر اور علامہ اقبال کی طرح مجھے حج کی سعادت نصیب نہ ہو۔ اور میرے جو یہاں رہتے ہوئے، فراق رسول پاک ﷺ کے سلسلہ میں آنسو جاری ہیں۔ تو اگر سرزمین حجاز میں پہنچ بھی گیا تو جناب عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح وہاں میرے لئے کئی رکاوٹیں بن جائیں گی۔ خیر یہ عاجز تو ان بزرگوں سے اپنا موازنہ نہیں کرتا کہ میں تو ان کے پاؤں کی خاک کے بھی برابر نہیں۔ لیکن یہ کچھ سن کر میرے آنسو اور زور شور سے جاری ہو گئے۔ اور پھر 1979ء سے جب کتاب ''جلال مصطفیٰ ﷺ، اور خلفاء راشدین کی حکمت عملیوں پر کتابیں لکھنا شروع کیں، تو کتاب لکھتے یا مواد پر نظر ثانی کرتے یا پروف ریڈنگ کرتے وقت جو آنسوؤں کی لڑیاں جاری رہیں تو رب سبحانہ کو اس عاجز پر ضرور ترس آ گیا ہوگا کہ 1986 میں بلاوا آ گیا۔ لیکن اکیلا نہ تھا۔ کہ ساتھ بیوی بھی تھی،۔ کہ وہاں جا کر کچھ ذمہ داری والے رویہ سے رہوں۔ کہ دیوانگی میں کئی حدیں نہ پھلانگتا رہوں۔ کہ اپنے آپ کو بھی کھو کر عدم میں چھلانگیں نہ لگانا شروع کر دوں وغیرہ۔ خانہ کعبہ پہنچے تو بتایا گیا، کہ داخلہ باب سلام والے راستے سے کرنا اور جب خانہ کعبہ نظر آئے تو جو پہلی دعا مانگو گے وہ منظور ہو جائے گی۔ عرض کی ''اے میرے رب کیا ہم آپ کے گھر یہ ایک دعا منظور کرانے کے لئے حاضر ہو رہے ہیں؟ نہیں! نہیں! میرے منہ سے آپ وہ الفاظ نکلوائیں۔ جن میں میری اور امت محمد ﷺ کی بہتری ہے۔'' تو جب خانہ کعبہ نظر آیا۔ تو عرض کی'' کہ اے میرے رب کیا یہ تیرا گھر ہے؟ اور آپ ادھر محدود ہیں۔ نہیں! نہیں۔ میرا رب تو محدود نہیں وہ تو ہر جگہ موجود ہے۔ تو پھر یہ کیا ہے؟ تو اپنے اندر ایک نا قابل برداشت خلا پیدا ہوا۔ ہو سکتا تھا کہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتا کہ اپنے اندر سے آواز اٹھی۔'' کہ اے نادان! یہ وجودی وحدت کا مرکز ہے اور اسی کی زیارت کے لئے تمہیں بلایا گیا ہے۔'' تو میری ایک چیخ نکل گئی اور سجدہ میں گر گیا۔ تو بیوی نے سہارا دیا کہ ہوش میں آؤ۔ پہلے اسلامی شعائر تو ادا کر لیں۔ پھر رب کے ساتھ باتیں کر لینا۔ تو میں کچھ اٹھا لیکن خاموش نہ رہ سکا عرض کی۔ ''یا

رب بات سمجھ آ گئی کہ یہ مرکز ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ ہمارا ایک اللہ سبحانہ ہے۔ ایک رسول پاک ﷺ ہے۔ ایک قرآن پاک ہے اور ہم ایک امت ہیں۔ لیکن کیا ہم ایک مت ہیں؟ ہم تو تین سو سالوں۔ سے غیروں کی بھیڑ، بکریاں بن چکے ہیں اور اس اعلان سے دونوں میاں، بیوی کی ہچکی بندھ گئی اور دونوں سجدے میں گر گئے تو ساتھ جاننے والوں نے ہم دونوں کو اٹھایا، جن کی بھی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہمیں صبر کی تلقین کی۔ تو یہ عاجز کھڑا ہو گیا۔ اور اپنے جذبات پر قابو پانے کی دعا مانگی۔

187۔ اور ذرا صبر کر کے عرض کی ''اے میرے رب اس عاجز کو جو اتنا عرصہ اس مقام وحدت کی زیارت سے روکے رکھا، تو کیا مجھے تیار کرتے رہے کہ میں اس طرح ایک طرف عاجزی اور دوسری طرف ''نادانی'' والی باتیں کروں اور کیا یہ باتیں سن کر مجھے تسلی بھی دے رہے ہو کہ میری باتیں سن کر آپ بھی حظ اٹھا رہے ہیں۔ تو میں سب سے پہلے یہ عرض کر دوں کہ میں کوئی نیک پاک آدمی نہیں جو ایسے ''بڑے بول'' بول رہا ہوں۔ میں تو تیرے حبیب ﷺ کی امت کا ایک گنہگار آدمی ہوں۔ میرے گناہ آپ کو معلوم ہیں یا مجھے۔ لیکن آپ نے میرے گناہوں پر پردہ رکھا ہوا ہے اور روز قیامت بھی پردہ رکھنا اور اپنی رحمت سے مجھے بخش دینا۔ لیکن بات یہ ہے کہ آپ نے مجھے حریص ہونے تک اپنے حبیب ﷺ کی امت کے ساتھ محبت کی سعادت۔ سے نواز دیا ہے۔ اس لئے عرض کرتا ہوں کہ ہمارے گناہوں یا کوتاہیوں کو نظر انداز کر اور ہمیں دنیا میں عزت کی زندگی عطا کر کہ اپنے اور اپنے حبیب ﷺ کے نام کی لاج رکھ کہ لوگ تو کہتے ہیں ہم تیرے ہیں اور یہی کیفیت اس عاجز پر 2007ء کے رمضان کی ستائیسویں رات کو زور شور سے وارد ہو گئی۔ لیکن خانہ کعبہ اور روضہ رسول ﷺ کی واردات کے بیانات کے لئے ایک پوری کتاب چاہیے کہ روضہ رسول ﷺ پر جو مخلوق کے ادب کے مناظر تصورات میں دیکھے کہ خوش قسمت لوگ ازل سے ابد تک ہاتھ باندھے حضور پاک ﷺ کے جمال کی جھلکیوں سے مستفیض ہو رہے تھے تو فطرت بخاری کا یہ شعر یاد آیا۔ ''ادب گا

ہست زیرآسمان ازعرش نازک تر۔ نفس گم کردہ می آید جنید رحمۃ اللہ علیہ و بایزید رحمۃ اللہ علیہ ایں جا۔'' تو میرے ہونٹوں پر بھی مہر لگ گئی اور سوائے حضور پاک ﷺ پر درود وسلام بھیجنے کے میری زبان سے کوئی اور لفظ نہ نکل سکا۔ اپنے جدِ امجد حضرت علی کرم اللہ وجہ کو بھی تصور میں اسی طرح ادب کی حالت میں دیکھا۔ جنہوں نے مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا ''بیٹا! یہاں کا بڑا انعام یہی ادب ہے۔ تمہیں مبارک ہو کہ رب نے تمہیں بھی یہ سعادت عطا کر دی۔'' قارئین! اب آپ سمجھ جائیں گے کہ یہ عاجز اپنے آنسو یا آبگینہ حضور پاک ﷺ کی خدمت میں کیوں پیش نہیں کرتا۔

188۔ خانہ کعبہ میں آہ وزاری کے ساتھ یہ دعا کرنے کے الفاظ بھی وارد ہوئے تھے۔ ''رب نبی محمد ﷺ آپ مقلب القلوب ہیں۔ ہماری حالت پر رحم فرما کہ ہمیں عزت اور غیرت کی زندگی واپس دے کہ حضور پاک ﷺ کے جمال سے ہم عالم اسلام کو منور اور مطہر اور معطر کر دیں۔ اور حضور پاک ﷺ کے جلال سے غیرت حاصل کر کے جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنا کر عشق بلاخیز کا قافلہ سخت جان بن جائیں کہ میر عرب ﷺ کو راحت پہنچے'' یہ دعا روضہ مبارکہ پر جب دہرائی۔ تو ایسے معلوم ہوا کہ میرے اردگرد کی فضا اور ماحول واقعی معطر ہو رہے ہیں۔ قارئین ایسی واردات بے حساب ہیں لیکن حیرانگی کی بات ہے کہ صرف دو سال بعد 1988ء میں امریکہ جاتے پھر عمرہ کی سعادت نصیب ہوگئی۔ جب میاں بیوی خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو عشاء کی نماز پڑھی جا چکی تھی۔ لیکن جو نور برستا دیکھا اور جیسے اس نور نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایسی واردات سے توجہ کے زمانے میں بھی نہ گزرے تھے۔ اور مدینہ شریف جاتے جب خانہ کعبہ کو الوداعی سلام عرض کیا۔ تو ایسے معلوم ہوا کہ خانہ کعبہ سے جواب مل رہا ہے۔ مدینہ منورہ عشاء کی نماز کے بعد پہنچے اس لئے حاضری تہجد کے وقت ہوئی کہ اس دفعہ سماں ہی بالکل مختلف تھا۔ مرحبا کی صدائیں تصور میں سنی جا رہی تھیں۔ خیال ہوا۔ کہ اب جلدی جلدی کئی دفعہ حاضری ہوتی رہے گی اور ہر حاضری میں بہتر مناظر سے مستفیض ہوتے رہیں گے۔

لیکن نہیں بات ہی کچھ اور تھی۔ یہ آخری حاضری تھی۔ بہت عرصے کے بعد بات سمجھ آئی کہ خانہ کعبہ اور روضہ رسول ﷺ پر حاضری میں بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں پر یہ وارد ہو جائے کہ رب سبحانہ اور حضور پاک ﷺ ہر وقت ہر جگہ تشریف فرما ہوتے ہیں اور ہر عبادت میں کوشش کرو کہ تم ان کو دیکھ رہے ہو۔ اور یہ نہیں حاصل ہوتا تو شروع کے مرحلوں میں یہ سوچو کہ رب سبحانہ اور رسول پاک ﷺ تمہیں ہر وقت ہر جگہ دیکھ رہے ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ یہ صورت حال وارد ہوگی کہ آپ رب سبحانہ اور رسول پاک ﷺ کی حفاظت میں چلے جاؤ گے اور روحانی آسودگی کے علاوہ روحانی رہنمائی بھی ملنا شروع ہو جائے گی۔ اور ان تاثرات کے ساتھ یہ عاجز جب گھر واپس آیا تو میرا قلم چل پڑا جو تفسیر لکھنے کے بعد بھی نہ رکا اور لگاتار چل رہا ہے۔ کہ جو کچھ میرے چھوٹے سے "برتن" میں سما سکتا تھا خانہ کعبہ اور روضہ مبارک کے مقامات پر میرے اس برتن میں ڈال دیا گیا۔

189۔ مدینہ منورہ میں ایک اور واردات بھی ہوئی کہ ضیاء "حق" نہیں "باطل" ہے اور پیرا نمبر 16 میں یہ گزارش ہو چکی ہے۔ اس نے گیارہ سال اسلام اور پاکستان کے ساتھ "فراڈ" کیا۔ تو اس کے "پرخچے" اڑنے والے ہیں۔ اس عاجز نے کئی رفقاء کے سامنے یہ ذکر کیا۔ اور اگست کے شروع میں ہم امریکہ سے واپس آئے تو چند دنوں بعد ضیاء کے پرخچے اڑ گئے کہ پاکستان کے ہر حکمران نے جتنی پاکستان کے ساتھ "بے وفائی" کی اس کے مطابق وہ عبرتناک انجام سے دوچار ہوا۔ جو ذکر تفصیل سے پیرا نمبر 141 وغیرہ میں ہو چکا ہے۔ بلکہ غیروں نے بھی پاکستان کے ساتھ جتنی دشمنی کی یا بغض کا مظاہرہ کیا تو اتنے ہی عبرتناک انجام سے دوچار ہوئے۔ ان میں کرم چند گاندھی، اندرا گاندھی، ماؤنٹ بیٹن، مصر کے شاہ فاروق، ایران کے رضا شاہ پہلوی، افغانستان کے داؤد اور اس کے بھائی نعیم کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا راز ہے۔ اور انشاءاللہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ یہاں سے ہی شروع ہوگی۔ اور غزوات الہند کا عمل بھی جلد پایہ تکمیل کو پہنچے گا کہ امام مہدی کی آمد

سے پہلے اس برصغیر نے کفر سے پاک ہونا ہے۔ بات قسمت کی ہے کہ کس کے روز قیامت چہرے روشن ہوں گے۔ بہر حال اس عاجز نے اپنی تبلیغ جاری رکھی۔ لیکن 1993ء میں میرے عظیم ساتھی کرنل شیر محمد پر مایوسی چھا گئی۔ انہوں نے عملی کام مجھ سے بھی زیادہ کیئے تھے۔ جہاد کشمیر میں کرنل خالد کا نام اپنا کر بھارتی جنرل تھمایا کو چکر چڑھا دیئے تھے۔ تحریک اخوان المسلمون شروع کی۔ اور میری مدد سے سردار عبدالقیوم کی تحریک المجاہدین کے بھی وہی کرتا دھرتا تھے۔ لیکن اب کہا، کہ یہ قوم راہِ راست پر آنے کو تیار نہیں۔ اور تم بھی ''فریدالدین عطار'' بننے کی کوشش بند کرو۔ کہ وہ اگر منگولوں کے یلغار کی تباہی نہ روک سکے تو تم کون ہوتے ہو۔ کہ ہمارے اعمال کی وجہ سے ہم جس تباہی سے دوچار ہونے والے ہیں۔ اس کو روک سکو۔ اس کو آنے دو کہ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد اور کرنل صاحب چھ سات سال ہوئے اسی مایوسی کی حالت میں مجھے اس میدان میں اکیلا چھوڑ کر راہیے عدم ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ عاجز ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' کے تحت اپنی تحریک جاری رکھے ہوئے ہے۔ تو اب زیادہ عملی کام نہ جاری رکھ سکوں۔ تو یہ آہ وزاری والی کیفیت طاری ہوگئی ہے۔ اور اس کا پوراپس منظر بیان کر چکا ہوں۔ کہ خانہ کعبہ میں جو دعا مجھ پر وارد ہوئی وہ میری ہر کتاب اور تحریر کی ''سرخی'' بھی ہوتی ہے۔ اور 1994ء میں جب عاشق رسول ﷺ میجر غلام یٰسین اور عاشق رسول ﷺ میجر عجائب حسین عمرہ کے لئے گئے تو میری یہ لکھی ہوئی دعا ساتھ لے گئے۔ خانہ کعبہ اور روضہ مبارک پر کئی دفعہ پڑھی اور پھر مجھے یہ کاغذ آ کر واپس دیا۔ جس کو اس عاجز نے ایک متبرک صحیفہ بنا کر اپنے قرآن پاک میں رکھا ہوا ہے۔

190۔ لیکن اب اس آہ وزاری کی دعا کے الفاظ کوئی معمولی الفاظ نہ تھے۔ سورۃ المومن کی آیت مبارکہ 60 میں فرمان الٰہی ہے کہ مجھ سے دعا کرو۔ میں منظور کروں گا۔ البتہ ساتھ سورہ البقرہ کی آیت مبارکہ 216 بھی ذہن میں رکھنا پڑتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری کچھ دعائیں اس لئے رد کر دیتا ہے۔ کہ اس منظوری میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ لیکن یہاں یہ بات نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ دعا کو صرف یہ کہہ کر رد کر سکتا ہے۔ ''کہ اے سپاہی قرآن پاک کی سورہ یٰسین، سورہ حم، سجدہ اور سورۃ الانعام وغیرہ میں میرے ان الفاظ کی طرف دھیان دو۔ **ھذا القدیر العزیز العلیم** ''میری سنت میں تم لوگوں کی ذلالت کا وقت تب تک ختم نہیں ہو سکتا۔ جب تک تم راہ راست پر نہیں آتے۔ ہاں تمہاری عاجزی کے لئے میری رحمت کا دروازہ کھلا ہے۔ اور یہ عاجزی تمہاری بخشش کا سبب بن سکتی ہے اور شاید تمہارا دنیا کے قید خانہ سے جلد چھٹکارا ہو جائے۔ اور پھر یہ عاجز بیمار ہو گیا لیکن بیماری زیادہ نہ تھی۔ البتہ لمبی ہوتی گئی اور عاجزی و آہ وزاری بڑھتی گئی۔ تو اس عاجز پر ایک اور واردات ظاہر ہوئی۔ کہ پہلے تحریروں میں رفقاء کے مشوروں سے تم مصلحت کے طور اپنے بیانات کو معتدل کر دیتے تھے۔ اب قلم اٹھا کر خوب بھڑاس نکالو۔ انہی دنوں مجید نظامی کا نام استعمال کر کے قوم کے نام چوتھا کھلا خط لکھا جا رہا تھا۔ کہ مجید نظامی اللہ تعالیٰ سبحانہ اور رسول پاک ﷺ کے پاکستان کو علامہ اقبال اور قائد اعظم کا پاکستان بنانے سے باز نہیں آ رہا ہے۔ تو اسی خط کو اس عاجز نے طول دے کر یہ کتاب لکھ ڈالی ہے۔ کہ خدارا مجید نظامی ان باتوں سے باز آؤ۔ پہلے غدار اور شعبدہ باز بھٹو ''قائد عوام'' بن کر قائد اعظم کا شریک بنا ہوا تھا۔ اب آصف علی زرداری جس کو ہمارے کچھ لوگ ''غداری'' کا نام دیئے ہوئے ہیں تو وہ پاکستان کی فیڈریشن کا ''محافظ'' بن رہا ہے۔ توبہ میرے اللہ۔ ہم کہاں پہنچ گئے ہیں۔ یحییٰ جب صدر بنا تو میری بیوی نے کہا تھا۔ ''رب کی بے پرواہی، کھوتیاں اگے کڑھائی'' اب زرداری کے لئے بہتر لفظ تو یہ ہیں۔ ''بلی دودھ کی رکھوالی''، لیکن رب کی بے پرواہی والی بات بھی صحیح ہے۔

191۔ اب ساری قوم عبرتناک انجام کی گھنگھور گھٹاؤں کے نیچے آ چکی ہے۔ کہ رب ذوالجلال کے عطیہ پاکستان کو ہم نے کافرانہ نظاموں کے تابع کر دیا یا مجید نظامی۔ ''داڑھی مچھ منے'' اسلام کا ''دعویدار'' ہے اور قائد اعظم اور علامہ اقبال کو اللہ تعالیٰ کا شریک بناتا رہتا ہے۔ توبہ و ندامت مجید نظامی اور صحافیوں کی لغت میں لکھی ہوئی نہیں لیکن یہ عاجز اپنی آہ وزاری میں

رب کے دربار میں سر بسجود ہو کر اسی رب سبحانہ کو گزارش کرے گا کہ وہ مقلب القلوب ہے۔ ہمیں مومن بنا دے۔ اور قرآن پاک میں اپنے وعدے کو پورا کر کہ آپ تو کسی وعدہ کے خلاف نہیں جاتے، کہ آپ صرف مومنین کی مدد فرماتے ہیں۔ اور مومنین پر کافروں کا غلبہ نہیں ہو سکتا۔

192۔ یہ کتاب ابھی درمیان میں ڈرافٹ کی صورت میں تھی کہ بے نظیر قتل ہو گئی۔ لیکن اس سے میری سوچ میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ میں نے کام جاری رکھا۔ لیکن یہ واقعہ تازہ تازہ ہے تو اس پر تبصرہ ضروری ہے۔ بے نظیر کے قتل کی ذمہ دار نہ موجودہ حکومت پر ڈالی جاسکتی ہے نہ اس کے سیاسی مخالفین یا کسی مذہبی گروہ پر، کہ بے نظیر کے قتل سے ان کو کوئی فائدہ نہ تھا۔ بے نظیر یہاں پر امریکہ کا ''ایجنڈا'' لے کر آئی۔ مشرف سے کوئی ''ڈیل'' وغیرہ نہ تھی۔ مشرف کو ''حکم'' ملا تھا۔ کہ بے نظیر کو آنے دو۔ لیکن صورت حال ایسی ہو گئی کہ فطرت نے نواز شریف کو بھی آنے دیا۔ بے نظیر یہاں آ کر کافی ''مایوس'' ہوئی۔ جس پذیرائی کی اس کو امید تھی وہ اس کو میسر نہ ہوئی۔ چھپے ہاتھ جنہوں نے بے نظیر کے ساتھ بڑی امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں۔ وہ بھی بڑے ''مایوس'' ہوئے۔ اور ایک طرح سے دونوں ایک دوسرے سے ''نالاں'' تھے۔ اب ''زندہ بے نظیر'' چھپے ہاتھوں کے کسی مطلب کی نہ تھی۔ لیکن بے نظیر کا قتل چھپے ہاتھوں کے کئی مطلب پورے کر سکتا تھا۔ اور یہ جو بے نظیر کی موت کے بعد ''ہنگامے'' ہوئے۔ یہ بھی چھپے ہاتھوں نے کرائے۔ کچھ ''جیالوں'' کو استعمال کیا اور کچھ اپنے ''مافیا'' کو۔ کہ اس طرح بے دین لوگوں کی برتری حاصل ہو گئی جو چھپے ہاتھوں کی ''ضرورت'' ہوتی ہے۔ 9 جنوری کے انتخابات سے بھی چھپے ہاتھ کچھ زیادہ حاصل نہ کر سکتے تھے۔ تو فی الحال وہ بھی التوا میں پڑ گئے۔ آگے کیا ہوتا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے معاملات کچھ کھل جائیں گے۔ اور ان باتوں کو بعد میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال چھپے ہاتھوں نے ایک اور مقصد پورا کر لیا کہ جس طرح لیاقت علی یا ذوالفقار بھٹو یا ضیاء الحق اگرچہ عبرتناک انجام سے دوچار ہوئے

لیکن ساتھ ہی ''شہادت'' کا لبادہ بھی اوڑھے پھرتے ہیں۔ کہ یہ بھی چھپے ہاتھوں کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو لوگ ان کی گیم کھیلتے رہے ان کے اعمال کی ''کھوج'' نہ لگے کہ چھپے ہاتھ ''ننگے'' یا ظاہر ہو جائیں گے۔ تو بے نظیر کو بھی شہادت کا ''لبادہ'' اوڑھا دیا گیا۔ اور یہ فطرت کی بھی ''ضرورت'' تھی کہ بھٹو خاندان نے ہمیشہ پاکستان کا نقصان کیا تو بے نظیر نے بھی اپنے باپ اور بھائیوں کی طرح عبرتناک انجام سے دوچار ہونا تھا۔

193۔ قارئین! یہ عاجز رب سبحانہ اور رسول پاک ﷺ کی طرف اپنی ذمہ داری پوری کرنے کی سعی میں مصروف ہے۔ رب سبحانہ میری ان کوششوں کو منظور فرمائے کہ اس عاجز کو رب سبحانہ بار بار توفیق دے رہا ہے کہ یہ عاجز کلمہ حق قوم کے سامنے پیش کرتا رہے۔ ویسے میری آہ وزاری جاری ضرور ہے لیکن کاغذ پر یہ کچھ ''بھڑاس'' نکالنے سے آہ وزاری کی ''شدت'' میں کمی آ گئی ہے۔ خاص کر جو مودودی جیسے تفرقہ بازوں کا جو رب سبحانہ نے اس عاجز کو کچا چٹھا کھولنے کی سعادت دی اور یہ بھی ثابت کیا۔ کہ وہ بڑا ہی بددیانت تھا۔ اور اس کی تحریری بددیانتی سب حدیں پھلانگ رہی ہے یا مجید نظامی کے بارے ثابت کیا کہ وہ صحافت، جمہوریت، قائداعظم اور علامہ اقبال کو رب سبحانہ کا ''شریک'' بنائے ہوئے ہے۔ تو اس عاجز کو بڑا سکون حاصل ہوا۔ الحمدللہ رب للعالمین اور میرے آقا ﷺ پر لاکھوں سلام۔

194۔ کتاب کی اشاعت سے پہلے چند مخلص رفقا کو یہ مسودہ دکھایا گیا۔ جنہوں نے اور خاص کر مفتی لطف اللہ صاحب نے بڑے قیمتی مشورے دیئے۔ اول یہ عاجز یہ کتابچہ مجید نظامی کی طرف کھلے خط سے شروع کرنا چاہتا تھا۔ تو مجھے مشورہ دیا گیا کہ مجید نظامی کو اتنی اہمیت نہ دو کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تو اب اس عاجز نے یہ کتابچہ ''ابتدائیہ'' سے شروع کیا ہے۔ البتہ یہ عاجز قوم کو یہ چیز ضرور باور کرائے گا کہ وہ سوچے کہ مجید نظامی جیسا کم علم اور مومن کی فراست سے عاری آدمی کیوں دائیں بازو والوں کا ''گاڈ فادر'' بنا ہوا ہے اور ''اسلام پسندوں'' کا سرغنہ بن کر قوم کی رہنمائی کا دعویدار ہے، اور کیوں دانشوری کا لبادہ

اوڑھنے والوں کی ایک ''فوج'' حمید نظامی کی سالانہ برسیوں پر اس کو خراج تحسین پیش کرنے میں مبالغوں سے کام لیتی ہے کہ نوائے وقت اخبار قوم کی اور اسلام کی اتنی خدمت کر رہا ہے وغیرہ۔ میرے لحاظ سے اور یہ عاجز ثبوت پیش کر چکا ہے کہ نوائے وقت والے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر غلام کذاب اور سر سید کی نسبت اسلام کا زیادہ نقصان کر رہے ہیں اور ایسی گمراہی پھیلا رہے ہیں جس کے بارے ہماری نادان قوم ''بے خبر'' ہے کہ حق و باطل میں فرق نہیں کرتے تو اسلام کو پاش پاش کر رہے ہیں اور ہمیں اس گمراہی کی طرف مائل کر رہے ہیں کہ ہم باطل نظریات کو اپنے ایمان کا حصہ بنائیں۔

195۔ اسی طرح کچھ صاحبان نے کہا کہ علماء میں سے اس عاجز نے مودودی اکیلے کے خلاف بہت کچھ لکھا۔ باقیوں کے بارے زیادہ کیوں نہ لکھا۔ تو بات یہ ہے کہ باقی علماء میں سے اکثر علماء کے بارے تو یہ عاجز گزارش کر چکا ہے کہ وہ اسلام سے نابلد ہیں اور کنویں ''منڈکیاں'' ہیں کہ انہوں نے مفکر اسلام کے لبادہ اوڑھنے والے مودودی کو لگام دینے کی یا نتھ ڈالنے کی کوشش نہ کی اور اندھوں میں کانا سردار کے مصداق مودودی اسلام کا عظیم ''فرزند'' بنا رہا۔ اب اس عاجز نے مودودی کی کچھ ''کم علمیوں'' کا ذکر ضرور کیا ہے۔ لیکن میں نے زیادہ تر مودودی کی تحریری بددیانتیوں کا ذکر کیا ہے۔ یا ثبوت پیش کئے ہیں۔ تو یہ بالکل ممکن ہے کہ مودودی کی ''کم علمیاں'' بھی شاید تحریری بددیانتیوں کے زمرہ میں ڈالی جا سکتی ہیں۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ مودودی کو ''پیدا'' کرنے یا ''پروان'' چڑھانے والی باطل طاقتیں اتنی طاقتور اور منظّم ہیں کہ انہوں نے مودودی کے مداحوں کی ایک ''فوج'' بھی تیار کر لی ہے۔ جو مودودی کے بارے کوئی سچی بات یا حقائق سننے کے لئے تیار نہیں اور اس کی بددیانتیوں کا بھی دفاع کرنے سے ''گریز'' نہیں کرتے۔ جب کسی غلطی کی کھلم کھلا نشاندہی کی جائے تو ایسے لوگ کہتے ہیں کہ مودودی کا اس میں مطلب یہ تھا اور وہ تھا وغیرہ۔ چھپے ہاتھوں اور باطل طاقتوں کی ایک بہت بڑی تنظیم ہے جو ہمارے اندر ہمیں خراب کرنے کے لئے اور مسلمان کو مسلمان نہ

رہنے دینے یا غلط عقائد کے پیروکار بنانے کا کام کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا چھپے ہاتھ اور باطل طاقتیں نہ ہمیشہ کیلئے دفاع کرنے کا بندوبست کراتے ہیں۔ بلکہ ان مردودوں سے جو "شوشے" یا غلط طرائق رائج کرائے جاتے ہیں۔ ان سازشوں کو قائم بھی رکھا جاتا ہے۔ قارئین حیران نہ ہونا کہ برطانیہ کی خفیہ سروس کا ایک کھلا ایجنٹ غلام پرویز جس سے اسلام کو غلط رنگ دینے کا کام کرایا جاتا تھا۔ تو ایک دفعہ الطاف گوہر کی سفارش پر ایوب خان نے یحیٰی خان کو حکم بھیجا کہ وہ مردود غلام پرویز سے فوج کو مذہبی معاملات پر لیکچر دلوائے۔ خیر یہ لمبی کہانی ہے کہ ہم نے ایوب خان کا یہ حکم ماننے سے "انکار" کر دیا۔ لیکن پرویز کی سازش اب بھی شروع ہے اور اسلام آباد اور لاہور میں ایسے ادارے موجود ہیں جن کے ذریعہ سے چھپے ہاتھ معتزلہ والے عقلی اسلام کا لٹریچر ان اداروں سے شائع کرا کے ہمارے اندر آج کل بھی مفت بانٹتے رہتے ہیں۔

196۔ یہ چھپے ہاتھ ہمارے اندر جتنے بھی اپنے ایجنٹ پیدا کرتے ہیں۔ ہر ایک کا "روپ" الگ الگ ہوتا ہے۔ لیکن ان سے جو کچھ کرایا جاتا ہے اس کا بڑا مقصد ہمارے عقائد کو خراب کرنا ہوتا ہے کہ مسلمان، مسلمان نہ رہیں اور خاص زور ہمارے اندر سے روح محمد ﷺ نکالنے اور جہاد سے نفرت پیدا کرنے پر ہوتا ہے جس کے لئے موت سے کراہت پیدا کی جاتی ہے اور حب الدنیا کیلئے رغبت پیدا کی جاتی ہے۔ یعنی اسلامی فلسفہ حیات کو مسلمانوں کی نظر سے "اوجھل" رکھا جاتا ہے۔ جیسے ہمارے اندر مجید نظامی جیسے لوگ اس فلسفہ حیات یا اس کے تقاضوں کو قوم کے سامنے ہرگز نہ آنے دیں گے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اس عاجز نے 1993 میں سپریم کورٹ کے سامنے سرسید اور غلام کذاب کی تحریروں کی "مماثلت" کو متعدد حوالوں سے پیش کیا۔ صاف ظاہر ہے کہ دونوں کو کسی ایک جگہ سے ایک جیسی ہدایات ملتی تھیں اور سرسید اور غلام کذاب دونوں دراصل "بے دین نیچریہ" تھے۔ لیکن غلام کذاب نے پہلے مجدد کا اور بعد میں نبی کا لبادہ اوڑھ لیا اور ایک ظاہر گروہ تشکیل کر گیا۔ جو ایک ٹریڈ یونین بھی ہے۔ جن کے

بے شمار چھپے ہوئے قادیانی ساتھی بھی ہیں اور وہ لوگ کھلم کھلا طور پر اسلام پر ''ڈاکے'' مار رہے ہیں اور معاشرہ کو خراب کر رہے ہیں۔ بلکہ ہمارے فرقوں میں شیعہ یا سنی بن کر گھسے ہوئے ہیں اور انہی لوگوں نے شیعہ و سنی فسادات کو جاری کرایا ہوا ہے۔ بعد میں بھارت کی خفیہ سروس ''را'' والے بھی دیوبند کے ذریعہ سے سپاہ صحابہ کے ساتھ رابطہ میں ہو گئے ہیں اور ایران والے شیعہ کو ''مظلوم'' سمجھ کر ان کو طاقت دینے کے لئے ان کی ہر قسم کی ''مدد'' کرتے ہیں اور یہ تمام اعمال کافی طور پر ''ظاہر'' ہیں۔

197۔ اس کے برعکس سرسید کی سازش ظاہر تھوڑی ہے اور باطن میں زیادہ ہے کہ اس کے پیروکاروں نے بنیادی اسلام کی باتوں کے قادیانیوں کی طرح پرخچے تو نہ اڑائے۔ لیکن یہ لوگ جنت اور دوزخ کو ''استعارے'' قرار دے کر ایک طرح سے حیات بعد الموت کے منکر ہیں اور سرسید نے جو سراج الدولہ یا سلطان ٹیپو کے لئے غلیظ الفاظ استعمال کئے یا جہاد کے برخلاف لکھایا ملکہ وکٹوریہ کے گیت گائے۔ وہ اور اس کے پیروکار ایک طرح سے غلام کذاب اور قادیانی کی نسبت اسلام اور مسلمانوں کو زیادہ نقصان پہنچا رہے ہیں۔ علاوہ ازیں سرسید، سائنسی علوم پڑھانے کے تو حق میں نہ تھا۔ وہ تو لارڈ میکالے کا پیروکار تھا کہ ہمارے معاشرتی علوم کو مکمل بے دین بنا دیا گیا۔ تو اس علم کا کیا فائدہ کہ علامہ اقبال بھی پکار اٹھا۔ ,,کہ اے افغانو! تمہاری بے علمی نے لاج رکھ لی، پڑھے لکھے بیچ رہے ہیں۔ ایمان'' یا کہا، شاہین بچوں کو خاکبازی کا سبق دیا جا رہا ہے کہ سورۃ الاعراف کی آیت مبارکہ 176 کے مطابق وہ مادیت میں گھس گیا تو مثال کتے کی طرح ہے۔ بوجھ رکھو تو بھی ہانپے نہ بوجھ رکھو تو بھی ہانپے اور ہماری بدقسمتی کہ ہم سرسید کے نام سے یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے بنا کر ایسی ہی تعلیمات سے قوم کے اذہان کو خراب کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں نیاز فتح پوری بھی نیچریہ عقائد کا پیروکار تھا اور اس کے شاگرد مودودی کی تفسیر اور سرسید کے کئی خیالات میں مماثلت ہے۔ لیکن مودودی نے تو مفکر اسلام کا لبادہ بھی اوڑھا ہوا تھا اور کئی لوگ مودودی کو اپنا رہبر و رہنما گردانتے ہیں۔ لیکن

ایک اور افسوسناک بات یہ ہے کہ جوش ملیح آبادی اور فیض جیسے بے دین لوگوں کو بھی بڑا دانشور گردانا جاتا ہے اور ان کی برسیاں منائی جاتی نہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتا ہے کہ ایسی حرکتوں سے ہم کیا حاصل کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ باطل اور چھپے ہاتھوں کی سازشیں ہیں کہ وہ کئی میدانوں میں ہمیں گمراہ کرر ہے ہیں۔ لیکن اس چھوٹی سی کتاب میں یہ عاجز تفصیل میں نہیں جاسکتا۔

198۔ علاوہ ازیں میرے کچھ رفقاء کا خیال ہے کہ اس عاجز نے بیماری کی تو کافی تشخیص کر لی ہے۔ لیکن مرض کا علاج نہیں لکھا۔ تو یہ بہت ہی وسیع مضمون ہے۔ جس سے میری کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ابتدائیہ میں بھی گزارش کردی تھی اور اکثر مقامات پر یہ باور کرایا گیا ہے کہ مرض کا صرف یہ علاج ہے کہ ہم مومن بن کر جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنائیں تو حضور پاک ﷺ کے بازوؤں کے نیچے ہو جائیں گے۔ (سورۃ حجر 88 اور سورہ الشعراء 215) تو ساتھ ہی سورۃ النساء آیت مبارکہ 141 اور سورۃ الروم آیت مبارکہ 47 کے مطابق اللہ تعالیٰ کے لئے ہماری امداد ضروری ہو جائے گی اور کافر ہم پر غلبہ نہ حاصل کرسکیں گے اور ہم سورۃ المائدہ اور سورۃ المجادلہ کے مطابق ''حزب اللہ'' یعنی اللہ تعالیٰ کی فوج بن جائیں گے۔ اب اللہ تعالیٰ کی فوج کی تنظیم عام دنیاوی فوجوں سے کہیں زیادہ برتر ہے کہ ہمارے آقا ﷺ کا فرمان ہے جو اکیلا رہ گیا وہ آگ کیلئے رہ گیا۔ اگر دو آدمی بھی ہوں تو ایک کو اپنا امام بنالو اور اس طرح پوری قوم محلّہ، گاؤں، تھانہ، تحصیل، ضلع، صوبہ اور پورے ملک میں اپنے اپنے اماموں اور امیروں کے تحت سورۃ الصّف کی آیت مبارکہ 4 کے تحت بنیان المرصوص بن جاتی ہے۔ یہ تنظیم اور اطاعت امیر کہ سورۃ النساء کی آیت مبارکہ 59 کے مطابق اللہ تعالیٰ کی اطاعت، رسول پاک ﷺ کی اطاعت ''اولی الامر'' کی اطاعت بڑے وسیع مضامین ہیں اور ہر مرحلہ یا ہر مقام کا ''اولی الامر'' ایسا مضمون ہے جو زمان و مکاں کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ جس کا اختصار بھی بیان کرنے کے لئے سینکڑوں صفحات کی ضرورت ہے۔

199۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ پر لیکن ایسے اعمال کی بنیادی ضرورت توبہ وندامت ہے جو الفاظ سن کر مجید نظامی جیسے لوگ شیطان کی طرح بھاگ جاتے ہیں۔ بلکہ اکثر اخبار نویس اس زمرہ میں آتے ہیں کہ وہ توبہ وندامت نہیں کرتے اور آج کل توبہ وندامت کا مسئلہ بڑا زیر غور ہے کہ جنرل حمید گل تو اپنے ماضی کی کچھ کوتاہیوں کی معافی مانگنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ لیکن اصغر خان اور جنرل چشتی نے صاف انکار کر دیا۔ قارئین! کونسی معافی اور کس قسم کی معافی؟ یہ عاجز ایسی توبہ وندامت کے بارے یحیٰی خان اور اس کے حواریوں کے سلسلہ میں جھلکی دے چکا ہے۔ میرے لحاظ سے ایسی ''معافی'' اور توبہ وندامت پوری قوم کیلئے ہے۔ اس کے بڑے تقاضے ہیں۔ سب حرام کی کمائی یا غلط طریقے کی کمائی واپس کرنا ہوتی ہے اور آئندہ کیلئے پکا وعدہ کرنا ہوتا ہے کہ صرف سچ اور حق کی پیروی کریں گے۔ میرے لحاظ سے اس سلسلہ میں ترجیح، اخباروں اور صحافیوں کے ''قبیلہ'' کی ہے۔ کہ سب سے پہلے یہ لوگ توبہ کریں کہ یہ لوگ اسلامی فلسفہ حیات کی پیروی کر کے صرف حق و سچ لکھیں گے اور جب ان کی کسی غلطی کی طرف توجہ دلائی جائے گی۔ تو یہ ایسی غلطیوں پر توبہ کریں گے کہ قوم کے سامنے ہمیشہ حق و سچ واضح طور پر پیش کیا جائے۔

200۔ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے کہ قومی سطح پر متقی اور کردار والے لوگوں کا ایک ادارہ بنانا ہوگا جو لوگ اسلامی فلسفہ حیات کے اصولوں اور معاملات کو سمجھتے ہوں اور حق و باطل میں فرق کر سکیں۔ تاکہ بھٹو جیسے مداری اور شعبدہ باز لوگ قوم کو گمراہ نہ کریں یا مودودی جیسے لوگ مفکر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر بے ادبیاں اور تحریری بددیانتی نہ کریں یا مجید نظامی جیسے کم علم لوگ اور مومن کی فراست سے عاری لوگ قوم کے رہنما یا دائیں بازو والوں کے ''گاڈ فادر'' نہ بنیں۔ تمام غلط بیانی کرنے والوں کو ''لگام'' دینے اور ''نتھ'' ڈالنے کی ضرورت ہے۔ بے دین لوگوں کو تو بالکل الگ کرنا ہوگا اور جو لوگ فرقہ داری یا سیاسی گروہ بندی یا خطوں اور علاقوں کے تحت الگ الگ گروہ یا ''قومیتیں'' بناتے ہیں ان کو معاشرہ کے لئے ناسور قرار دینا ہوگا۔ بات یہ ہوگی کہ ہم

اول بھی مسلمان اور مومن ہیں اور آخر بھی مسلمان اور مومن ہیں۔ امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ کے ظہور میں اب زیادہ دیر نہیں۔ امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ نہ شیعہ ہوں گے نہ سنی اور نہ دیوبندی نہ بریلوی۔ آئیے اپنے آپ کو ان کے ''مصور'' بننے کے لئے تیار کریں۔ اور عشق بلاخیر کا قافلہ سخت جان کا ''اظہار'' شروع ہو چکا ہے۔ لیکن بات قسمت کی ہے کہ کن کے چہرے روز قیامت پرنور اور سفید ہوں گے اور کن کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ اور اختتام پھر بھی توبہ وندامت اور آہ و زاری سے ہوتا ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت مبارکہ 243 میں شاید 1947ء میں ہمارے لئے اشارے تھے کہ ہم سے لاکھوں موت کے ڈر سے اس طرح بھاگے کہ ستر ہزار نوجوان عورتیں بھی کفار کے حوالے کر آئے۔ یہاں پاکستان میں آ کر دونوں مہاجرین اور انصار مادیت میں اس طرح گھس گئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں لفظ ''موتوا'' استعمال فرمایا۔ یہ طبعی موت نہ تھی یہ ذلت کی زندگی کی طرف اشارہ ہے جس کو یہ عاجز اس کتاب میں بیان کر چکا ہے۔ اسی آیت مبارکہ کا اگلا حصہ ''احیاہم'' ہے۔ یہ بھی طبعی زندگی نہیں بلکہ غیرت اور عزت کی زندگی ہے۔

201۔ حیرانگی کی بات یہ ہے کہ جیسے جیسے اس کتاب کا ڈرافٹ مکمل ہوتا گیا۔ میری بیماری بھی کم ہوتی گئی اور آہ وزاری کی گڑگڑاہٹ اور آنسوؤں کی لہروں کی شدت بھی کم ہوتی گئی اور اب بیماری بھی ختم ہو چکی ہے اور آہ وزاری کا نزول بھی نہیں ہوتا۔ صرف زبانی عرضداشت جاری ہے کہ رب نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے اسما مبارک کی لاج رکھ کہ غیرتو کہتے ہیں ہم تیرے ہیں۔ ہمیں عزت وغیرت کی زندگی عطا کر دے۔ کہ پچھلے تین سو سالوں سے ہم دنیا میں ذلیل ہو رہے ہیں۔

202۔ اس کتاب کا مسودہ 18 فروری 2008ء کے انتخابات سے بہت پہلے تیار ہو گیا تھا اور میرے کچھ رفقاء نے مشورہ دیا تھا کہ میں اس مسودہ کو فی الحال ''کمپوز'' نہ کراؤں کہ انتخابات کا نتائج شاید میرے کسی ''جائزہ'' یا ''تحقیق'' کو غلط نہ ثابت کر دیں کہ سب کتاب کی نئی ''تعمیر'' کرنا پڑ جائے گی۔ لیکن اس عاجز کے جائزے حق پر مبنی اور پکے قسم کے ہوتے ہیں۔ جن پر زمان اور واقعات کے اثرات برائے نام ہوتے ہیں۔ اب ان انتخابات کے نتائج بالکل میری سوچ

کے مطابق ہیں کہ فطرت اس کافرانہ نظام کے حکمرانوں کو ضرور ایک دن ذلالت سے جو دوچار کرتی ہے۔ وہ بات قاف لیگ کے لئے پوری ہوگئی مشرف کے لئے بھرپور نفرت والی بات بھی پوری ہوگئی کہ اس کے ''چمچے'' اپنی خاندانی وقعتوں کا بھی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ''چھپے ہاتھوں'' کی ضرورت بھی پوری ہوگئی کہ ''مردہ بے نظیر'' نے بے دین لوگوں کو اونچائی دی اور پیپلز پارٹی یا صوبائی نفرت والے بھی آگے آگئے اور مشرف ان لوگوں کو اکٹھا کر کے حکومت چلانے کی کوشش کرے گا۔ پیپلز پارٹی اور نواز شریف کا ''اتحاد'' مشکل ہے کہ اگر ''منفی'' بنیادوں پر ایسا غیر فطری اتحاد ہو بھی گیا۔ تو وہ چلے گا نہیں۔ نواز شریف جس کے لئے اب ''ذلت'' ہی ''ذلت'' کی یہ عاجز جو بہت پہلے پیش بینی کر چکا تھا۔ وہ تب تک قائم رہے گی جب تک نواز شریف توبہ وندامت نہیں کرتا۔ جو لوگ جلوس نکال کر خوشیوں کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ جلد ''مایوس'' ہو جائیں گے۔ ہاں پیپلز پارٹی کے ''جیالے'' پچھلے بارہ تیرہ سالوں سے ''بے روزگار'' ہیں۔ وہ بھٹو کے بھیڑیوں کی طرح لوٹ مار شروع کر دیں گے۔ فضل الرحمٰن سمیت ''مولوی'' بھی بری طرح مار کھا گئے۔ اب مذہبی جماعتوں کی ''وقعت'' بھی ختم ہوتی نظر آتی ہے۔ اور یہ ''بائیکاٹ'' جماعت اسلامی کے لئے باعث نقصان بن گیا۔ ممکن ہے ان پارٹیوں کے بھی حصے بخرے ہونے شروع ہو جائیں۔ یعنی ان کافرانہ نظاموں سے ہم کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں گے اور اسی طرح غیروں کی ڈگڈگی پر ناچتے رہیں گے۔ لیکن کب تلک؟ رب سبحانہ نے اس عاجز کو اب ''گیند'' رب سبحانہ کے ''کورٹ'' میں پھینکنے کی سعادت عطا فرما دی ہے۔ ''کہ اے مومنین توبہ وندامت سے سے پکار اٹھو، کہ اے ہمارے رب اپنے اور اپنے حبیب ﷺ کے اسماء مبارک کی لاج رکھیں اور ہمیں عزت و غیرت کی زندگی عطا فرما دیں۔'' نواز شریف میں کچھ تبدیلی نظر آ رہی ہے۔ اگر توبہ وندامت کے لئے وہ بارش کا پہلا قطرہ بن جائے تو ممکن ہے اور لوگ بھی ان کی پیروی کر لیں۔ ساری بات اسی توبہ وندامت کی ہے۔

☆☆☆☆☆

# مصنف کی دیگر کُتب

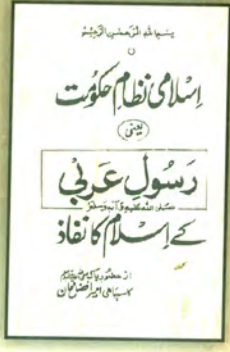















۱۹۔ ذیشان کالونی، قاب لائنز، راولپنڈی۔ فون: 051-5583778